• کمزور یادداشت
بہتر کرنے کے طریقے

• شخصیت پہچانیے
لیٹنے کے انداز سے

• چنے کھائیے
اور صحت پائیے

دسمبر 2013ء

اُردو ڈائجسٹ

/urdudigest.pk

KitabPk.Com

گوانتاناموبے

بے گناہوں کے ساتھ ہوتا
وحشیانہ سلوک

تازہ ترین احوال

• کرکٹ کا مردِ آہن
ہاشم آملہ

• بلند پایہ شاعر
ماہر القادری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

KitabPk.Com

اللہ کا قرآن

گناہوں کی معافی کے لیے دعا

اے ہمارے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہوجائے تو تُو ہمیں نہ پکڑنا۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوانا جس کی ہم میں طاقت نہیں اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تُو ہی ہمارا مالک ہے اور ہم کو کافروں پر غلبہ عطا فرماO (سورۃ بقرہ: 2-286)

اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہوجائیں گے۔O (حضرت آدمؑ کی دعا)

رسولﷺ کا فرمان

گناہوں سے پناہ کے لیے دعا

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے:
''(اے میرے معبود) میں پناہ مانگتا ہوں تیرے عزت و جلال کی۔ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے تیرے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی جبکہ جن و انس سب کو موت آئے گی۔''

(بخاری کتاب 97: باب 7: مسلم کتاب الذکر۔ باب 18)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ ''اے میرے مالک! بخش دے میری خطا، میری نادانی اور میری وہ زیادتی جو میں نے خود اپنے تمام معاملات میں کی ہے جس کو تُو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اے اللہ! میری غلطیاں، میرا قصد گناہ اور میری نادانی اور میری حماقت سب معاف فرما دے۔ (میں اقرار کرتا ہوں کہ) یہ سب باتیں مجھ میں ہیں۔ اے اللہ! میرے تمام اگلے اور پچھلے، پوشیدہ اور ظاہر گناہ معاف فرما دے۔ بے شک تُو ہر چیز پر قادر ہے۔''

(بخاری کتاب 80: باب 60: مسلم کتاب الذکر۔ باب 18)

اُردو ڈائجسٹ

دسمبر 2013ء
محرم الحرام 1435ھ
www.urdudigest.pk
جلد نمبر 53 شمارہ نمبر 12

صدر مجلس ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر اختر عباس ایڈیٹر ریسرچ پروفیسر محمد فاروق قریشی
مجلس تحریر حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ اعوان
سب ایڈیٹر غلام سجاد
مہتمم طباعت فاروق اعجاز قریشی انچارج کمیونیکیشن افنان کامران قریشی
تخلیق و تزئین واصف ملک، راکعہ رضا کمپوزد اشرف سکندر، اشفاق علی
پروف خواں خالد محی الدین

مارکیٹنگ/اشتہارات

edvertisement@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ احمد فیاض 0324-4255178
لاہور ندیم حامد 0300-4242620
گجرات/گوجرانوالہ احسان اللہ بٹ 0300-9620294

سالانہ خریداری

خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے

subscription@urdu-digest.com فون: 92-42-37589957

اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

600 روپے کی شاندار بچت کے ساتھ

پاکستان 1450 کے بجائے 850 روپے میں
بیرونِ ملک 50 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Semanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
editor@urdu-digest.com

قیمت 100 روپے طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر حسن آباد لاہور سے شائع کیا

فہرست

دسمبر 2013ء

ماہر القادری

ایک بلند پایہ شاعر و بذلہ سنج ایڈیٹر کا تذکرہ
ان کے اشعار اور اندازِ بیاں و بنوں انھیں بھولنے نہیں دیتے

129

محمود احمد لئیق

دنیائے کرکٹ کا مردِ آہن

ہاشم آملہ

جو عمدہ کرکٹر ہی نہیں مثالی مسلمان بھی ہے

سید عاصم محمود

88

گوانتانا موبے میں قیدی بھوک ہڑتالیں اور خودکشیاں کیوں کر رہے ہیں؟

ایک بھارتی مسلمان صحافی کے انکشافات

229

169

سلگن

بل بل سلگتی ایک بیٹی کی اندوہناک کہانی
وہ جان گئی تھی کہ غصہ زیادہ ہو یا بے بسی
دونوں صورتوں میں یوں ہی سلگنا پڑتا ہے، جھلسنا پڑتا ہے

اختر عباس

KitabPk.Com

مینیجنگ ایڈیٹر نوٹ

دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے جن مضامین نے میرے دماغ کو جھنجھوڑا اور دل کو چھوا ہے ان میں سب سے پہلا امریکی کالا پانی ـــــ گوانتاناموبے (ص:229) ہے۔ سید نزاکت حسین پہلے مسلمان صحافی ہیں جنھوں نے گوانتاناموبے کا دورہ کیا۔ وہ اپنے مضمون میں سوال اٹھاتے ہیں کہ اس انتہائی متنازعہ اور بدنام زمانہ امریکی جیل میں بے گناہ قیدیوں پر تشدد اور غیر انسانی سلوک کیوں کیا جاتا ہے اور انہیں رہا کیوں نہیں کیا جاتا۔ ایک دوسرے آرٹیکل پاک بھارت تعلقات (ص:65) میں یہ بحث کی گئی ہے کہ کیا دونوں ہمسایہ ممالک نے طویل رقابت اور جنگوں سے کوئی سبق سیکھا ہے اور کیا ان کے درمیان کبھی پُرامن دوستانہ تعلقات قائم ہو سکیں گے؟ کالاباغ ڈیم کی تعمیر کا خواب (ص:52) ملکی مفاد اور اندھیروں سے نجات پانے کا قابل قدر منصوبہ آج تک شرمندہ تعبیر کیوں نہ ہو سکا اور وہ کون ہیں جنھوں نے اسے اندھے کنویں میں پھینک رکھا ہے؟ دسمبر کا مہینہ جب بھی آتا ہے سقوط ڈھاکہ کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ بیالیس برس بیت جانے کے باوجود اس سانحے کی کسک کم نہیں ہوئی۔ سونار بنگلہ (ص:261) اسی درد کی داستان ہے۔ آخر میں کہانی بڑا آدمی (ص:155) ان نوجوانوں کی ہے جو پردیس میں جا کر بڑے آدمی بن جاتے ہیں اور اپنے ضعیف بے سہارا والدین کو یکسر بھول جاتے ہیں۔

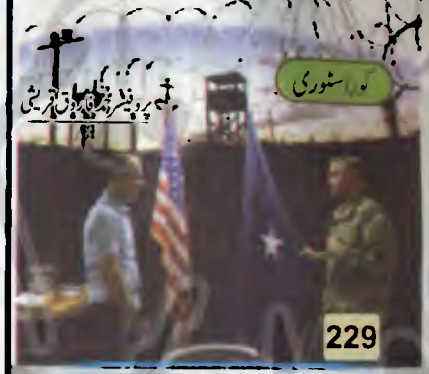

طیب اعجاز قریشی

tayyab.aijaz@urdu-digest.com

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اٹھائیے

33 رسول اللہ اور شرارتی بچے ——— عاصم محمود
بچوں سے آپ ﷺ کے پیار اور شفقت سے متعلق دِلچسپ تحریر

37 ایک خوفناک خواب
ایک سعید روح کا ماجرا، جسے لوگ حضرت خالدؓ بن سعید کے نام سے جانتے ہیں۔

ناصر کاظمی

محمد اِمتیاز احمد

لطیف محسوسات کے شاعر

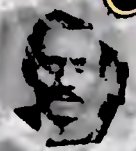

84

KitabPk.Com

انا

ایک دُلھن کی کتھا

خالد سعید اختر

179

قائد کی دو نایاب تقاریر کی ریکارڈنگ

آل انڈیا ریڈیو نے دینے سے کیوں انکار کر دیا؟

لئیق احمد

92

یو۔ڈیم۔سالا

ایک بڑے شہر میں آباد ہونے کے خواہاں دو اجنبیوں کا قصہ

نعیم بیگ

161

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

15 کچھ اپنی زبان میں
پائیدار ڈلیوری سسٹم کی شدید ضرورت

17 ہم کہاں کھڑے ہیں
نئے حالات کے نئے تقاضے

60 مرنی لا ——— حسن رزاقی
بیڑا غرق ہو مرنی کا، ظالم نے سچا گر بدترین اصول دریافت کیا

81 ذیابیطس ——— سبین جبین
بہت ممکن ہے آپ کو دوا کی بجائے غذا سے فائدہ ہو جائے

96 چیونگم کے خطرناک اجزا ——— ابوصارم
چیونگم انسانی صحت کے لیے کس قدر مہلک ہے

99 لیٹنے کی ہیئت ——— جنید اکرم
لیٹنے کے مختلف انداز پر مبنی دلچسپ تحریر

101 7 گھنٹے کی نیند ——— زین العابدین
نیند کا انسانی صحت پر کس قدر اثر ہے؟

103 صحت مند رہنے کے لیے ——— عبداللہ رمضان
ناشتے کی آپ کی زندگی میں کتنی اہمیت ہے

105 چنے کھائیے ——— ڈاکٹر شائستہ خان
چنے ہماری صحت کے لیے کتنے مفید ہیں؟

109 مظفر نگر میں موت کی ہولی ——— رخسانہ فضل
بھارتی شہر میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و جبر کی دل دہلا دینے والی داستان

139 گلائسیمک انڈکس ——— رضوان احمد شاہ
شوگر اور امراضِ قلب سے بچنے کا آسان طریقہ

142 یادداشت بڑھانے کے طریقے ——— ڈاکٹر ہادی
ہم اپنی یادداشت کو کس طرح بڑھا سکتے ہیں؟

144 دلچسپ تحقیقات ——— ڈاکٹر شائستہ خان
انگلیوں کی ساخت سے لے کر لپ اسٹک کے استعمال تک نئی سائنسی تحقیقات

187 ہونی ہو کر رہتی ہے (شکاریات) ——— حامد مشہود
ایک خوشحال و خوش بدن کا قصہ

196 بدروح کا تعاقب ——— محمد محبوب حسن خان کانجو
ایک درندے کی خوفناک کہانی

210 نارنگی کے پانچ بیج ——— سر آرتھر کانن ڈائل
بیجوں والے ایک خط کا حیران کن ماجرا

241 سفرنامہ ——— اختر عباس
قطر میوزیم کے شیشے کے فرش پر چلتے ہوئے دل کیوں لرزتا ہے؟

222 اسامہ بن لادن ——— پروفیسر محمد فاروق قریشی
ایبٹ آباد میں انکل سام کا وحشیانہ انتقام (آخری قسط)

257 "میں" کیا ہے ——— ڈاکٹر طاہر مسعود

بوسیدہ پنا

193

ایک کردار کی سوچ کا شاخسانہ
اس کی نسوں میں
ان کہی کہانیاں بولتی تھیں

محمد اِنعام اللہ شاہین

سُوکھی ٹہنی

ایک دوست کا المناک قصہ
ایک روز ایک جانا پہچانا چہرہ
اس کے دروازے پر کھڑا تھا
مگر اس کے ہونٹ سلے اور
قدم رُکے ہوئے تھے

محمد قاسم رضا

202

219
محبت کا نیلا رنگ
عمار مسعود

نیلے رنگ کو اپنا سمجھنے والے ایک رنگ ریز کا حیرت افزا ماجرا

56
علوم الارض
(Geo/Earth Sciences)
کے ماہر کیسے بنیں؟

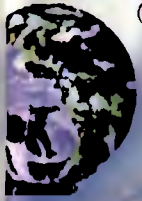

جانیے ان خصوصیات کو جو آپ کو اس شعبے میں کامیابی دلا سکتی ہیں

یوسف الماس

113
تربیت کے بنیادی اصول

بچے کی دماغی، جذباتی اور معاشرتی ترقی کا راز بہت کم لوگ جانتے ہیں

مائل نقوی

107
کیا ہم دماغ کا 10 فیصد
حصہ استعمال کرتے ہیں؟

عالیہ احمد

KitabPk.Com

مستقل سلسلے اور کالم

146 باتیں دانش کی	رفیدہ کلیم فاروقی
277 چمنِ خیال	قارئین کے خطوط
275 قصہ کوئز	غلام سجاد
283 بوجھیں تو جانیں	غلام سجاد
284 درِ دل پہ دستک	اختر عباس

149
مشین گردی

ایک پوسٹ مین کا ماجرا

وہ اپنے دشمن کا سر اُتار لایا تھا

آغا گل

ہر قسم کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز
آئیڈیل پبلک لائبریری نزد گھنہ گھر کمالیہ
پرانے ڈائجسٹ خریدے اور فروخت کیے جاتے ہیں۔ ★ منتظم عظیم احمد طارق 0334-9630911

KitabPk.Com

پائیدار ڈلیوری سسٹم کی شدید ضرورت

پاکستان جس تاریخ کا امین ہے‘ اِس میں شیر شاہ سوری قابلِ رشک عوامی فلاح و بہبود اور اچھے نظمِ مملکت کے حوالے سے ایک مثالی حکمران کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُس نے پانچ سال کے قلیل عرصے میں پشاور سے کلکتے تک ایک جرنیلی سڑک تعمیر کی اور مسافروں کے آرام کے لیے سراؤں کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم کیا۔ دانش مندی سے ایسے ایسے انتظامات کیے کہ طوائف الملوکی سے دوچار ملک میں ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا اور شہریوں کو سستی غذا اور مفت طبی علاج کی سہولتیں میسر آنے لگیں۔ حضرت قائداعظم نے قیامِ پاکستان کی تاریخ ساز جدوجہد اِسی اعلیٰ مقصد کے لیے کی تھی کہ مسلمانوں کو غیر ملکی استعمار اور جاگیردارانہ نظام سے نجات ملے‘ معاشرے میں دولت کی مساوی تقسیم ہو اور شہریوں کو بنیادی انسانی ضرورتیں اور ایک آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کی سہولتیں فراہم کرنے کی اسلامی ریاست ذمے دار ہو۔ اس عظیم الشان سیاسی عمل کے نتیجے میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت وجود میں آئی اور انتہائی نامساعد حالات کے باوجود عام آدمی کا معیارِ زندگی بتدریج بہتر ہوتا گیا۔

ہماری قومی تاریخ میں گزشتہ پانچ سال اِس حوالے سے انتہائی تکلیف دہ گزرے ہیں کہ اِن میں ریاست کا ڈلیوری سسٹم تقریباً مفلوج ہو گیا تھا اور اچھی حکمرانی کے سارے تصورات دم توڑ چکے تھے۔ جب حکمران طبقہ اپنے مفادات کی پرستش میں جت گیا‘ تو سرکاری افسروں نے بھی عوام کو دھتکارنا شروع کر دیا اور وہ اُن کی فلاح و بہبود سے مکمل طور پر غافل ہو گئے۔ حکمران جماعت کا سیاسی نعرہ تو یہ تھا کہ عوام ہماری طاقت ہیں‘ لیکن عملی طور پر اُنہیں افلاس‘ بے چارگی اور بدامنی کی پستیوں کی طرف دھکیل دیا گیا۔ قومی دولت پر اشرافیہ دادِ عیش دیتی اور اپنی تجوریاں بھرتی رہی۔ اِس ظالمانہ طرزِ حکمرانی کے خلاف 2013ء کے انتخابات میں بغاوت دیکھنے میں آئی اور ووٹروں کی بڑی اکثریت نے اُس قیادت کو منتخب کیا جو اپنی بلند ہمتی اور ایثار کیشی کی بدولت عوام کے دلوں کی دھڑکن بن چکی تھی اور اُس کے بارے میں عمومی تاثر یہ پایا جاتا تھا کہ غریبوں‘ ناداروں‘ بے روزگاروں اور کم وسائل رکھنے والے شہریوں کے لیے فلاحی اور ترقیاتی کام اس کی اوّلین ترجیحات میں شامل ہوں گے۔ جناب نواز شریف کی سربراہی میں جو حکومت قائم ہوئی‘ اُسے بلاشبہ بڑے بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے جن میں دہشت گردی اور انتہاپسندی

سرفہرست ہیں۔ اِس حوالے سے پاکستان کو ایک حد تک عالمی تنہائی کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ توانائی کے بحران سے شہری زندگی بے رنگ ہے' کارخانے بند اور بے روزگاری میں تشویش ناک اضافہ ہو رہا ہے۔ معیشت کی حالت بڑی دگرگوں ہے' اس لیے حکمران عالمی اور علاقائی طاقتوں سے تعلقات استوار کرنے کے لیے بیرونی دورے کر رہے اور طویل المیعاد منصوبوں میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں' مگر عام آدمی کا احساس یہ ہے کہ اس کے فوری حل طلب مسائل بری طرح نظرانداز کیے جا رہے ہیں۔ بدقسمتی سے حکومت کا ڈیلیوری سسٹم پہلے سے کہیں زیادہ بدنظمی کا شکار ہے۔ روزمرہ استعمال میں آنے والی غذائی اشیا اور سبزیاں غریب اور درمیانی طبقات کی پہنچ سے باہر ہوگئی ہیں۔ آلو سو روپے کلو فروخت ہو رہا ہے اور آٹے کے نرخ بھی تیزی سے بالا ہوتے جا رہے ہیں۔ غذا اور دواؤں میں بدترین اور جان لینے والی ملاوٹ کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور انسان شدید عدم تحفظ کی اذیت سے دوچار ہے۔ حکومت کا قیمتوں پر مؤثر کنٹرول بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ بجلی اور گیس کے نرخ بھی خون خشک کیے دیتے ہیں۔ اس ملک میں خطِ غربت سے نیچے اور ذرا اوپر زندگی گزارنے والوں کی تعداد دس کروڑ کے لگ بھگ ہے جو حکومت کی اقتصادی پالیسیوں کے نتیجے میں ہر بنیادی سہولت سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔

حکومت کی بے حسی اور بدنظمی کے باعث عوام کے اندر قدرتی طور پر شدید بے چینی اور اضطراب پھیل رہا ہے جو کسی وقت بھی ایک خوفناک طوفان کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے حکمرانوں کو عوام کے بنیادی مسائل کو اوّلین ترجیح دینا اور اُنہیں فوری ریلیف مہیا کرنے کا میکانزم ہنگامی طور پر تیار کرنا ہوگا۔ آئین میں پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست بنانے کی ضمانت دی گئی ہے جس کا عملی طور پر کوئی اہتمام نہیں کیا گیا جبکہ بیشتر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں غریب عوام کو ضروریاتِ زندگی کے نرخوں' ٹیکسوں اور دوسری لازمی خدمات پر ریلیف دیا جاتا ہے۔ یورپ کی بعض فلاحی ریاستیں اُن کی گزربسر' علاج معالجے' تعلیم کی ذمے داریاں بھی اُٹھاتی ہیں اور بچوں کی صحت مند پرورش اور نگہداشت کے لیے وافر وسائل فراہم کرتی ہیں۔ جناب وزیراعظم کو فوری طور پر عوام پر مسائل کا بوجھ کم کرنے اور اُنھیں اسٹاک ایکسچینج کے مافیاؤں کے شکنجے سے نجات دلانے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس بلانا چاہیے جس میں وزرائے اعلیٰ اور سول سوسائٹی کی معروف شخصیات کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔ اِس اجلاس میں گہرے غور و خوض کے بعد ایسے انتظامات کو آخری شکل دی جائے جو ایک پائیدار ڈیلیوری سسٹم کو طرزِ حکمرانی کا ایک ناگزیر حصہ بنا دیں۔ آئے دن کی گرانی' بے روزگاری' بدعنوانی اور بدامنی سے اگر عوام کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا' تو حکومت کے لیے تین سالہ' پانچ سالہ اور بیس سالہ منصوبوں کو شروع کرنا اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانا محال ہو جائے گا۔ معاشرے میں امن اور استحکام کی ضمانت ایک پائیدار ڈیلیوری سسٹم ہی دے سکتا ہے جو عوام کی مشکلات کے خاتمے اور انصاف کی فراہمی کو یقینی بنائے گا اور فلاحی ریاست کے تصور کو عملی شکل دے سکے گا۔

الطاف حسن قریشی

KitabPk.Com

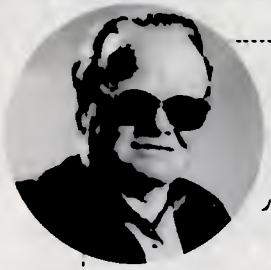

نئے حالات کے نئے تقاضے

ماضی کے زخم جو گہرے ہوتے جا رہے ہیں' اب ایک نئے سیاسی عزم اور ایک نئی حکمتِ عملی کا تقاضا کرتے ہیں۔ وہ نئے تقاضے کیونکر پورے کیے جا سکتے ہیں اور وہ حکومت اور معاشرے کی سطح پر کیا کیا تبدیلیاں چاہتے ہیں' اُن کا تفصیلی جائزہ

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

ہم آج کل جن واقعات کی زد میں ہیں اُن میں لحظہ بہ لحظہ سنگینی اور نااُمیدی کا عنصر غالب آتا جا رہا ہے جبکہ تابندہ امکانات کی شفق بھی اُفق پر نمودار ہو رہی ہے۔ یوں خوش اُمیدی اور حددرجہ بے قراری کا سفر ساتھ ساتھ جاری ہے۔ وزیراعظم نواز شریف' جو ایک مضبوط اکثریت کے ساتھ 2013ء کے انتخابات میں کامیاب ہوئے ہیں' چھ ماہ سے خارجی معاملات سنوارنے پر بہت زیادہ توجہ دے رہے ہیں اور اِسی شوق فضول میں سری لنکا بھی جا نکلے تھے جہاں اُن کی آمد کی خبر انگریزی اخبار میں اندرونی صفحات پر ایک کالمی شائع ہوئی تھی۔ وہ امریکہ گئے' تو ٹوٹے ہوئے ڈائیلاگ کے رشتے اور دو سال سے رکی ہوئی گرانٹ بحال کرانے میں کامیاب رہے اور افغانستان کے مستقبل پر امریکی سیاسی اور عسکری قیادت سے گہرائی کے ساتھ بات چیت میں آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کر آئے تھے۔ اُنہیں بہت بڑی کامیابی یہ بھی حاصل ہوئی کہ امریکہ اِس بات پر بھی آمادہ ہو گیا تھا کہ پاکستان اور تحریک طالبان پاکستان آپس میں مذاکرات کر کے امن کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ آل پارٹیز کانفرنس میں پاکستان کی تمام قابلِ ذکر سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں نے طالبان سے مذاکرات کرنے اور امن کو پہلا موقع دینے کی قرارداد اتفاقِ رائے سے منظور کی تھی اور اُن سے رابطے کی ذمے داری وزیرِ داخلہ جناب چودھری نثار علی خاں کے سپرد ہوئی تھی۔ طالبان کے امیر حکیم اللہ محسود سے درپردہ رابطے قائم ہو چکے تھے کہ وہ ڈرون حملے میں جاں بحق ہو گئے۔ ہمارے وزیرِ داخلہ نے ایک پُرہجوم پریس کانفرنس میں اعلان کر دیا کہ امریکہ

نے امن مذاکرات پر ڈرون حملہ کر کے پاکستان کی پشت میں چھرا گھونپ دیا ہے اور جب تک یہ حملے ہوتے رہیں گے' طالبان سے مذاکرات شروع نہیں ہو سکتے۔ امریکہ نے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہا کہ حکیم اللہ محسود ہمارا ٹارگٹ تھا اور اُس کے سر کی قیمت پچاس کروڑ روپے مقرر تھی اور جونہی وہ ریڈار پر آیا' اُس پر ڈرون سے فائر کر دیا گیا۔ ہم نے امریکی دورے پر آئے ہوئے پاکستانی راہنماؤں پر اپنا یہ ارادہ واضح بھی کر دیا تھا۔

پاکستان کے بعض سیاسی قائدین بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے لگے ہیں کہ حکیم اللہ محسود کے سر کی قیمت پاکستان نے بھی پانچ کروڑ مقرر کر رکھی تھی' اُس لیے اُن کے جاں بحق ہو جانے سے مذاکرات کا عمل تعطل کا شکار نہیں ہونا چاہیے' لیکن جناب عمران خاں نے مسلم لیگ کی قیادت پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے ہیں اور نیٹو سپلائی روک دینے کی دھمکی دے ڈالی ہے۔ وزیرِ اطلاعات ونشریات جناب پرویز رشید اِس خیال کے حامی تھے کہ نیٹو سپلائی کی بندش سے ڈرون حملے بند نہیں ہوں گے' کیونکہ دو سال پہلے یہی تجربہ کیا گیا تھا' اور سپلائی سات ماہ تک معطل رہی تھی' لیکن اِس دوران ڈرون حملے ہوتے رہے۔ چند روز بعد مشیرِ خارجہ جناب سرتاج عزیز کا بیان آیا کہ امریکہ نے ضمانت دی ہے کہ طالبان سے مذاکرات کے دوران ڈرون حملے نہیں کیے جائیں گے۔ ابھی اُن کے بیان کی بازگشت باقی تھی کہ پاکستان کے بندوبستی علاقے ہنگو میں ایک مدرسے پر میزائل داغ دیا گیا جس میں اساتذہ اور طلبہ شہید اور زخمی ہوئے جن میں حقانی نیٹ ورک کے ایک اہم کمانڈر بھی شامل تھے۔ اِس پر عمران خاں طیش میں آ گئے اور اُنہوں نے 20 نومبر کو پشاور میں ریلی نکالنے اور نیٹو سپلائی روک دینے کا اعلان کر دیا۔ انہی دنوں سانحۂ راولپنڈی رونما ہوا اور صورتِ حال کی سنگینی کے پیشِ نظر مظاہرے کی تاریخ تبدیل کر کے 23 نومبر رکھ دی گئی۔ اِس روز پشاور میں بہت بڑا مظاہرہ ہوا' نیٹو کے کنٹینر بھی روکے گئے اور ڈرائیوروں پر تشدد کے واقعات بھی ہوئے۔ دوسرے دن جماعت اسلامی نے ڈرون حملوں کے خلاف کراچی میں زبردست احتجاج کیا جس میں خواتین کی بہت بڑی تعداد شامل تھی۔ امیر جماعت اسلامی جناب منور حسن نے گرجدار آواز میں فرمایا کہ عوام نے جس ''شیر'' کو ووٹ دیے تھے' وہ تو گیدڑ نکلا اور اِس نے امریکہ اور بھارت کی غلامی قبول کر لی ہے۔

☆

موسم سرد ہوتا جا رہا ہے' مگر سیاسی ماحول میں حدت بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک طرف جناب عمران خاں اور سینیٹر پرویز رشید ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں۔ وزیرِ اطلاعات ونشریات ٹی وی پر اعلان کر چکے ہیں کہ مجھے اُن کی طرف سے خطرناک دھمکیاں مل رہی ہیں اور اگر مجھے ''کچھ'' ہو گیا' تو اِس کے ذمے دار عمران خاں ہوں گے۔ انھوں نے طنزاً یہ بھی کہا کہ اُن کا دل

طالبان اور تلوار امریکہ کے ساتھ ہے۔ زہر میں بجھے ہوئے لفظی اور تصویری حملے سوشل میڈیا پر ہو رہے ہیں۔ ادھر مولانا فضل الرحمٰن کی جماعت کے ایک سرکردہ لیڈر نے ارشاد فرمایا ہے کہ تحریکِ انصاف کی حکومت اپنی بداعمالیوں کے بوجھ تلے بہت جلد ڈوبنے والی ہے۔ زوال کا بہت کچھ سامان تحریکِ انصاف کے ذمے داروں نے جناب آفتاب شیر پاؤ کی جماعت قومی وطن پارٹی کو مخلوط حکومت سے نکال کر فراہم کر بھی دیا ہے اور اب صوبائی اسمبلی میں اِس کی اکثریت برائے نام رہ گئی ہے۔ الطاف بھائی اور مولانا فضل الرحمٰن کہہ رہے ہیں کہ خیبر پختونخواہ کی حکومت ڈالر امریکہ سے لے رہی ہے اور نیٹو افواج کی سپلائی روک دینے کی دھمکیاں بھی دے رہی ہے۔ وفاقی حکومت کا موقف جناب سرتاج عزیز واضح الفاظ میں بیان کر چکے ہیں کہ ایک معاہدے کے تحت پاکستان نیٹو افواج کی سپلائی بحفاظت پہنچانے کا ذمے دار ہے اور ہم پچاس ملکوں سے اپنے تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتے۔ بعض قائدین یہ دلیل بھی دے رہے ہیں کہ اب تو نیٹو افواج کی واپسی ہے' اِس لیے سپلائی روکنا بہت بڑی حماقت اور ایک عاقبت نااندیش غلطی ہوگی۔ کچھ اہم حلقوں کی طرف سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ کنٹینروں کے ذریعے نیٹو افواج کے علاوہ افغانستان کے لیے بھی غذائی ساز وسامان سپلائی کیا جا رہا ہے اور اِس کی بندش سے نت نئے مسائل جنم لیں گے' ٹرانسپورٹیشن کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور عالمی سطح پر پاکستان کو سخت آزمائشوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔

وہ ڈرون حملے جو 2004ء سے ہونا شروع ہوئے' 2013ء کے آخر میں پاکستان کی داخلی سیاست میں غیر معمولی تمازت پیدا کرنے کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ عوامی جذبات امریکی حکومت کے خلاف ہیں جس کی قیادت جماعت اسلامی اور تحریکِ انصاف کے ہاتھ میں ہے جو پورے ملک میں ریلیوں اور مظاہروں کا پروگرام بنا رہی ہیں۔ جناب وزیرِاعظم کی حکومت پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ ڈرون حملوں کے بارے میں واضح موقف اپنانے کے بجائے ذہنی انتشار کا شکار ہے اور امریکہ سے دوٹوک بات کرنے سے گھبراتی ہے۔ عمران خاں اعلان کر چکے ہیں کہ جب تک ڈرون حملے بند نہیں ہوتے' مظاہرے اور نیٹو سپلائی روکنے کے اقدامات جاری رہیں گے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک ایسے وقت جب ہمارے پاور اسٹرکچر میں بڑی بڑی تبدیلیاں آنے والی ہیں اور پورا خطہ نئے نئے سیاسی اور اسٹریٹیجک انقلابات کی زد میں ہے' یہ مظاہرے عدم استحکام کا باعث تو نہیں بن جائیں گے اور علاقائی صورتِ حال کا توازن تو نہیں بگڑ جائے گا۔ پیپلز پارٹی کی قیادت الگ تھلگ رہ کر ایک عجیب سیاسی کھیل میں مصروف ہے اور بی جمالو کا کردار ادا کر رہی ہے۔ سابق وزیرِ اعظم سید یوسف رضا گیلانی کہہ رہے ہیں کہ ہم نے تو سپلائی سات ماہ بند رکھی تھی' مگر موجودہ حکومت یہ بارِ گراں چند روز اُٹھانے کی بھی سکت نہیں رکھتی۔

☆

نواز شریف پر کنفیوژن کا الزام لگانے والوں کا نقطۂ نظر ناقابلِ فہم ہے' کیونکہ اُنہوں نے تو ڈرون حملوں کے خلاف اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بھی تقریر کی اور صدر اوباما سے ملاقات کے دوران بھی یہ مسئلہ پوری قوت سے اُٹھایا تھا۔ ڈرون حملوں کے خلاف ایمنسٹی انٹرنیشنل کے علاوہ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل مون کی بان نے بھی آواز بلند کی ہے جو اُنہیں عالمی قانون کے خلاف قرار دے رہے ہیں۔ خود امریکہ میں متعدد انسانی حقوق کی تنظیمیں سراپا احتجاج بنی ہوئی ہیں اور مقتدر روزناموں اور جرائد میں مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ان واقعات کے پیشِ نظر ہمارے لیے سب سے مناسب حکمتِ عملی یہ ہوگی کہ منظم طریقے سے عوامی احتجاج کا دباؤ بھی رکھا جائے اور پبلک سفارت کاری کے ذریعے عالمی رائے عامہ کو ڈرون حملوں کے خلاف ہموار بھی کیا جاتا رہے۔

عوامی احتجاج اس قدر منظم اور باوقار ہونا چاہیے کہ تمام سیاسی جماعتیں اس کی طرف کھنچتی چلی جائیں۔ روز روز کی ہڑتال اور ہنگامہ خیز ریلیاں وقت کا بھی ضیاع ہیں اور معیشت پر بھی منفی اثرات مرتب کرتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو عوامی احتجاج کے ایسے طریقے اختیار کرنا چاہئیں جن سے عوام کے صحیح جذبات کی ترجمانی بھی ہوتی رہے اور عالمی طاقتیں اُن کے اثرات قبول کرنے پر بھی مجبور ہو جائیں۔ دانش وروں اور تجزیہ نگاروں کا ایک اعلیٰ حلقہ اِس کام کے لیے تیار کیا جائے جو ڈرون حملوں کا معاملہ عالمی اخبارات کے علاوہ مختلف عالمی فورمز پر مضبوط دلائل کے ساتھ اُٹھاتا رہے۔ سب سے اہم ضرورت پچاس ملکوں اور بطورِ خاص امریکی عوام کے اندر ڈرون حملوں کے خلاف ایک تحریک اُٹھانے اور کانگرس تک پاکستانی عوام کے جذبات پہنچانے کی ہے۔ یہ کام گہرے غور وخوض اور پُرمغز منصوبہ بندی کا تقاضا کرتا ہے۔

جناب عمران خاں کا یہ بیان اُن کے ذہنی افلاس کا آئینہ دار ہے کہ خواہ ہماری حکومت چلی جائے' ہم نیٹو سپلائی بند کر کے دم لیں گے۔ اِس بیان سے حکومت بچوں کا کھلونا معلوم ہوتی ہے کہ جب چاہا توڑ دیا اور جب چاہا نیا خرید لائے۔ تحریکِ انصاف کو انتخابی معرکے میں ایک صوبے کی جو حکومت ملی ہے' اُس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا اور اسے صحیح خطوط پر چلانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ وفاقی حکومت اِس کے استحکام اور استقلال میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ نوجوانوں کا ایک قابلِ ذکر طبقہ بھی اُس کے ساتھ ہے اور نابغۂ روزگار ماہرین بھی راہنمائی کے جذبوں سے سرشار ہیں۔ جماعت اسلامی پورے خلوص اور تمام تر صلاحیتوں سے تعاون کر رہی ہے۔ ایسا سازگار ماحول کم ہی میسر آتا ہے' چنانچہ اس کھلے ماحول میں عوام کی بہتری کے لیے منصوبے اور اچھے قوانین بنائے اور انتظامی شعبوں میں انقلابی اصلاحات نافذ کی جاسکتی ہیں۔ دہشت گردی پر قابو پانے کے لیے انٹیلی جنس کا ایک تازہ دم اور قابل اعتماد نیٹ ورک بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ اِس

کے علاوہ مقامی حکومتوں کے ایک مثالی نظام کے ذریعے عوام کو صحیح معنوں میں بااختیار بنانے کی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ خیبر پختونخواہ میں بے پناہ آبی وسائل سے بڑی مقدار میں اور کم نرخوں پر بجلی پیدا کرنے کے عظیم امکانات پائے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دینے کے بجائے دوسری جماعتوں پر پھبتیاں کسنے اور وفاقی حکومت کو دباؤ میں رکھنے کے لیے تحریکِ انصاف کی قیادت صوبائی نظم ونسق کرکٹ ٹیم کی طرح چلانے کی مشق فرما رہی ہے۔ اِس طرزِ عمل کے نتیجے میں ایک خلجان اور ایک بحران پرورش پا رہا ہے جس کے سبب گھر کا بندوبست خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا ہے اور پاکستان کو خونخوار چیلنجوں کا سامنا ہے۔ اِن حالات میں میں تمام سیاسی جماعتوں کے لیے بڑے تدبر اور تحمل سے کام لینے ہی میں بھلائی ہے اور بالغ نظری اور عالی ظرفی سے مستقبل کی تعمیر کے تقاضے پورے کیے جاسکتے ہیں۔ ہماری قومی قیادت کو اِس امر کا بھرپور ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ اُس نے ماضی سے سبق سیکھ کر اپنے لیے میانہ روی اور سلامتی کا راستہ منتخب کیا ہے اور وہ لایعنی مباحث اور الزام تراشی کی سیاست سے دست کش ہوگئی ہے۔ وقت ہمارے قائدین کو اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنے اور پاکستان کی عظمت اور وقار کی نئی نئی منزلیں سر کرنے کی دعوت دے رہا ہے' مگر ہمارے بعض سیاسی کھلاڑی خواہشوں پر مرمٹنے پر اصرار کر رہے ہیں۔

.....☆.....

پاکستان بفضلِ خدا ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے اور اِس نے امریکہ کی غلامی کبھی قبول نہیں کی۔ اُن دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات میں زیروبم آئے اور فاصلے گھٹتے اور بڑھتے گئے۔ ہمیں آزادی حاصل ہوئے ابھی چند سال ہی ہوئے تھے کہ کوریا کی جنگ چھڑ گئی اور امریکہ نے پاکستان پر فوجیں بھیجنے کے لیے دباؤ ڈالا' مگر ہماری حکومت نے اِس کی درخواست مسترد کر دی' حالانکہ ہمارے اقتصادی حالات بہت دباؤ میں تھے۔ امریکہ نے چین سے الگ تھلگ رہنے کا مشورہ دیا' مگر وزیراعظم سہروردی نے چین کا دورہ کرنے سے پہلے اُسے تسلیم کر لیا تھا۔ بعد میں دونوں ملکوں کے درمیان فضائی رابطے قائم ہوئے جن کی بدولت چین کو مغربی اقوام کا قائم کردہ حصار توڑنے اور دنیا سے تعلقات استوار کرنے کا موقع ملا۔ اِسی طرح جب امریکہ نے عراق پر حملہ کرنے کے لیے سلامتی کونسل کا پروانہ حاصل کرنا چاہا' تو پاکستان جو اِس وقت سیکورٹی کونسل کا ممبر تھا' اُس نے ووٹ دینے سے انکار کیا اور دوسرے اراکین کو بھی اِس انکار میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا اور یوں قرارداد مسترد ہوگئی اور امریکہ تلملا کے رہ گیا۔ اُس نے کیری لوگر بل کے ذریعے پاکستان کی مسلح افواج پر اپنا تسلط جمانا چاہا' لیکن خواص وعام اُٹھ کھڑے ہوئے اور کانگرس کے اعلیٰ عہدے داروں کو بڑی ضمانتیں دینا پڑیں۔ امریکہ ہماری فوج کو شمالی وزیرستان میں اُلجھا دینا چاہتا تھا' لیکن فوجی قیادت اور بیدار مغز

سول سوسائٹی نے اِس کے عزائم ناکام بنا دیے۔ یہ چند واقعات اِس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں کہ پاکستان اپنی آزادی اور خودمختاری کی حفاظت کرتا رہا ہے' تاہم وہ دنیا کی واحد سپر پاور سے خوشگوار تعلقات کو قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ ہمارے گزشتہ حکمرانوں نے ایک ڈیڑھ سال امریکہ سے پنجہ آزمائی کر کے دیکھ لیا جس کے باعث ہم سفارتی اور مالی دیوالیے پن تک جا پہنچے تھے۔ اب اللہ کے فضل سے پاکستان کو چین کے علاوہ روس کا تعاون بھی حاصل ہے اور علاقائی طاقتوں کے ساتھ بھی تعلقات خوشگوار ہوتے جا رہے ہیں۔ اِس خطے میں جو تبدیلیاں بڑی تیزی سے ظہور پذیر ہو رہی ہیں' اُن میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان اسٹریٹیجک روابط بہت ناگزیر ہیں۔

پاکستان اپنے اسٹریٹیجک محلِ وقوع کے اعتبار سے علاقائی اور عالمی سیاست میں ایک مؤثر اور انتہائی صحت مند کردار ادا کرنے کی قابلِ اعتماد صلاحیت رکھتا ہے جس کا مغربی ممالک پورا ادراک رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن اسلام آباد میں عالمی راہنما آتے ہیں اور پاکستان کی معاشی ترقی میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔ اُنہیں یہ بھی احساس ہو چلا ہے کہ اسلام آباد کا اثر و رسوخ اب مشرقِ بعید میں بھی پھیل رہا ہے۔ اِن سازگار حالات سے فائدہ اُٹھانے کے لیے پاکستان کو سب سے پہلے اپنا گھر درست کرنا ہوگا۔ حکومت کی رِٹ اور قانون کی عمل داری کمزور پڑنے سے ایک طرف غیر ریاستی عناصر طاقت ور ہوتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف قانون شکن عناصر اور منی لانڈرنگ' ڈرگ لینڈ اور اسٹاک ایکسچینج کی مافیائیں سیاسی جماعتوں اور پریشر گروپس کے ذریعے اقتدار میں شامل ہیں۔ تیسری طرف فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا دی جا رہی ہے۔ اِس کے علاوہ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں نے معاشرے کے اندر نفرتوں کے الاؤ دہکا رکھے ہیں اور اقتدار کے عمل میں بعض طبقات کی عدم شمولیت سے ناراضگیوں کے راکٹ فائر کیے جا رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے 2013ء کے انتخابات میں تمام قومی جماعتوں کے علاوہ قومیت پرست تنظیموں نے بھی حصہ لیا اور بڑی حد تک وہ اقتدار میں شامل ہو چکی ہیں۔ مجموعی طور پر صورتِ حال میں بہتری آ رہی ہے' مگر ملک میں فرقہ وارانہ تشدد کی خوفناک لہریں اُٹھ رہی ہیں جن کے ڈانڈے انتہا پسندی اور دہشت گردی سے جا ملتے ہیں۔ اپنا گھر درست رکھنے کے لیے اب سب سے پہلے امن و امان کے معاملات درست کرنے اور عوام کے ہولناک معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں پر قابو پانے کو اوّلین اہمیت دینا ہوگی۔

.....☆.....

سانحۂ راولپنڈی نے فرقہ وارانہ تشدد میں ایک المناک باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں میں فرقے اور مسلک ایک مدت سے چلے آ رہے ہیں' مگر پاکستان میں شیعہ سنی بھائی بھائی کی طرح رہتے اور آپس میں

شادیاں کرتے آئے ہیں' البتہ ماحول میں بڑی تبدیلی 1979ء میں در آئی جب ایک طرف سوویت یونین کی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں اور دوسری طرف امام خمینی کی قیادت میں ایران کے اندر شیعہ انقلاب آیا۔ افغانستان میں روسیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مجاہدین کی ضرورت پیش آئی' تو پاکستان میں زیادہ تر سلفیہ عقیدے کے مدرسے قائم ہوئے۔ عراق ایران جنگ جو آٹھ سال تباہی مچاتی رہی' اِس کے دوران شیعہ اور سنی مسلم حکمرانوں نے اپنے اپنے مسلک اور عقیدے کی آبیاری کے لیے فنڈز فراہم کیے اور اُن کی حوصلہ افزائی سے سپاہ محمدؐ اور سپاہ صحابہؓ کی عسکری تنظیمیں وجود میں آئیں۔ کفر کے فتوے بھی جاری ہوئے اور تبرے کی قبیح رسم ایک انتہائی اشتعال انگیز شکل اختیار کرتی گئی' پھر ایک دوسرے کو قتل کرنے کا سلسلہ خاصی دیر تک چلتا رہا۔ تب علمائے حق بڑی دلسوزی سے حرکت میں آئے اور مسلسل جانفشانی کے بعد شیعہ اور سُنیوں کے مابین بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے جس پر دونوں طرف سے معروف شخصیتوں نے دستخط کیے اور اِس دستاویز کی بنیاد پر ملی یک جہتی کونسل وجود میں آئی۔ اِس کونسل نے اپنے مقاصد میں حیرت انگیز پیش رفت کی۔ دینی مدرسوں کے نصاب اور امتحانات کا ایک قابلِ اعتماد نظام ترتیب دیا اور اِس کی پیہم کوششوں سے بین المسالک اجتماعات کو بہت فروغ ملا۔ ایک عقیدے کے امام دوسرے عقیدے کے امام کے پیچھے نماز ادا کرنے لگے اور یوں آپس میں یگانگت اور مذہبی رواداری پرورش پاتی گئی۔ آگے چل کر سیاسی بنیادوں پر متحدہ مجلسِ عمل کا قیام عمل میں آیا اور 2002ء کے انتخابات میں صوبۂ سرحد کی حکومت اُس کے حصے میں آ گئی' مگر یہ تجربہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ ایک طرف جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام (ف) کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور دوسری طرف شیعہ حضرات اقتدار سے محروم رہنے کی وجہ سے قومی دھارے سے باہر نکل گئے اور کم علم اور کج فہم افراد جذباتی تقریروں کے نام پر منبر و محراب اور ماتمی مجلسوں میں خاص مقام حاصل کرتے گئے۔

انقلابِ ایران کے بعد مغرب میں اسلام کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ایک دو برسوں ہی میں سیاسی اسلام (Political Islam) اور عسکری اسلام (Militant Islam) کے عنوان سے کتابوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ تاثر یہ دیا گیا کہ مسلمان جمہوری راستوں سے ہٹ کر عسکری راستوں کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ اِن مغربی محققین اور اہلِ دانش نے مسلم دنیا کو شیعہ اور سنیوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا اور امریکہ اور یورپ کے تھنک ٹینکس اور منصوبہ ساز اداروں نے مسلک کی بنیاد پر مسلمانوں کو لڑانے کے منصوبے تیار کیے جن پر استعماری طاقتوں نے مختلف طریقوں سے عمل درآمد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہمارے درمیان مسلکی اختلافات پائے جاتے ہیں اور کتابوں اور تقریروں میں اشتعال انگیز مواد بھی موجود ہے' اِس لیے خارجی طاقتیں

ہمارے اندر پھوٹ ڈالنے اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے کے فتنے جگاتی رہتی ہیں۔ ہزارہ قبیلے میں سینکڑوں افراد کا بہیمانہ قتلِ عام اور پارا چنار' کُلگت میں فرقہ وارانہ فسادات اسی فتنہ انگیزی کی مختلف شکلیں ہیں۔ طالبان کی طرف سے امام بارگاہوں اور بریلوی مسجدوں پر حملے اِسی فتنہ انگیزی کی ایک دوسری شکل ہے۔ عامۃ المسلمین کا ضمیر اُن سازشوں کو اتحاد و یگانگت کے جذبوں سے ناکام بناتا آیا ہے' مگر مذہب کے نام پر کاروبار کرنے والے نام نہاد مذہبی راہنما نفرت کے شعلے بھڑکانے میں لگے ہوئے ہیں کہ مفادات کی دکانداری ایک وبا کی طرح پھیلتی جارہی ہے۔

.....☆.....

اِس بار محرم کے جلوسوں اور مجلسوں کی حفاظت کے انتظامات واقعی بڑے عمدہ تھے' لیکن عاشورے کے دن راولپنڈی کے راجا بازار میں جمعۃ المبارک کی نماز کے وقت بڑا حادثہ رونما ہوا۔ انتظامی سطح پر تحقیقات سے جو حقائق سامنے آئے ہیں' وہ بڑے روح گداز اور دلفگار ہیں۔ دکھ یہ ہے کہ مولانا غلام اللہ کا یہ مدرسہ اگرچہ دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتا ہے' مگر اِس میں ہر مسلک اور ہر مکتبۂ فکر کے علما اور دانش ور اِس کی سالانہ تقریب میں شامل ہوتے اور مذہبی رواداری کا عظیم الشان مظاہرہ کرتے رہے۔ جناب آغا شورش کاشمیری' ہمارے دوست شیخ رشید' جناب مظفر شمسی' جناب ع غ کراروی' جناب میاں محمد حیات اور محمود احمد منٹو اِس کے سہ روزہ سالانہ اجتماع میں شریک ہوتے اور اِسلام کے بنیادی تصورات اور تعلیمات پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ ایسے اداروں کو نذرِ آتش کرنے والے شرپسند دور دراز علاقوں سے آئے تھے۔ انتہائی لرزہ خیز واقعات کے باوجود میڈیا' علماء اور عام شہری نے غیر معمولی بصیرت اور دانائی کا ثبوت دیا۔ مناظر ٹی وی پر دکھائے گئے نہ واقعات کی آتش گیر کوریج ہوئی۔ اِس حادثے کے ردِعمل میں جذبات سے مغلوب نوجوانوں نے ایک گروہ نے راولپنڈی کی بعض مسجدیں اور امام بارگاہیں نذرِ آتش کر دیں' لیکن سنی اور شیعہ دونوں فرقے مل جل کر آگ پر قابو پالینے میں کامیاب رہے۔ اِس ایمان افروز منظر سے یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ راولپنڈی ایک پرامن شہر ہے اور یہاں شیعہ اور سنی ایک دوسرے کا احترام کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ اعتماد اور تعاون کے مضبوط رشتوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ سانحۂ راولپنڈی نے چند ساعتوں کے لیے پورا ملک ہلا ڈالا تھا اور یہ سوال زبانِ زدِ عام و خاص تھا کہ یہ خوں آشام واقعہ فوج کے اہم ترین مرکز اور وزیرِ داخلہ کے اپنے شہر میں کیوں رونما ہوا' انتظامیہ اور پولیس ناگہانی حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے کیوں تیار نہیں تھی اور مسلم لیگ نون کی قیادت کیوں منظر سے غائب رہی۔

سانحۂ راولپنڈی سے ہمیں پہلا سبق یہ ملا ہے کہ فرقہ وارانہ منافرت کے جو خطرناک جراثیم ہماری کتابوں' ہمارے مدرسوں اور نام نہاد علما کی تقریروں میں پرورش پاتے رہتے ہیں' اُن کے علاج کے ایک سائنٹیفک لائحہ

عمل کی صورت گری وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ ملی یک جہتی کونسل یہ عظیم کارنامہ نہایت عمدگی سے سرانجام دے سکتی ہے۔ حال ہی میں علامہ ابوالخیر زبیر اُس کے صدر اور جناب لیاقت بلوچ سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے ہیں۔ اُن دونوں کا ایک وسیع حلقۂ اثر بھی ہے اور اُن کے اندر تنظیمی صلاحیتیں بھی بے کراں ہیں۔ نئے تقاضوں کے مطابق ایک ایسا ضابطۂ اخلاق ترتیب دیا جانا چاہیے جو مذہبی رواداری کی حقیقی معنوں میں نشوونما کرتا رہے اور فرقہ وارانہ تشدد سے جو بھیانک سماجی مسائل پیدا ہوتے جارہے ہیں' اُنہیں حکمت سے حل کرنے کے لیے قومی سطح پر ایک تحریک اُٹھائی جائے۔ آغاز اِس بنیادی نکتے سے ہونا چاہیے کہ تکفیر اور تبرا کا سلسلہ باہمی رضامندی سے فوری طور پر بند کیا جائے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ بعض مدرسوں کی طرف سے شیعہ حضرات کو کافر قرار دینے کے فتوے جاری ہوئے اور یہ بھی ایک خطرناک حقیقت ہے کہ بعض انتہا پسند شیعہ صحابہ کرامؓ پر تبرا بھیجتے اور اُن کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دونوں طرف کے معتدل علما اُن خبیث کلمات کی بندش میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سانحۂ راولپنڈی سے دوسرا سبق یہ ملا ہے کہ جرائم پیشہ اور دکانداری چمکانے والے قانون شکن عناصر مسلکی جماعتوں میں داخل ہو کر فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔ ایک جامع حکمتِ عملی کے تحت اُن کی سرکوبی سخت ضروری ہے۔ اِسی طرح نفرت پھیلانے والے واعظوں اور ذاکروں کا حکومت بھی کڑا احتساب کرے اور حاضرین بھی اپنی ناپسندیدگی اور بیزاری کا منظم طریقے سے اظہار کو اپنا شعار بنائیں۔ انگلستان میں آپ کسی کے خلاف نفرت آمیز بات یا تقریر نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ایسا کریں گے' تو قانون کا شکنجہ آپ کا گلا دبوچ لے گا۔ اِس ضمن میں لاؤڈ اسپیکر کے غیر ضروری استعمال پر پابندی لگانے سے بھی ماحول کو سازگار بنانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اِس امر پر بھی غور کیا جانا چاہیے کہ تمام اسکولوں اور مدرسوں میں اعلیٰ ثانوی درجے تک ایک ہی نصاب پڑھایا جائے اور اِس کے بعد قرآن' حدیث' فقہ' علم کلام اور تقابلِ ادیان میں تخصیص کے لیے اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جائے۔ سب سے زیادہ اہمیت سماجی سطح پر تعلقات کو فروغ دینے کی ہے۔ اِس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ سارے مسالک کے طلبہ تقریری مقابلوں میں اجتماعی طور پر شرکت کریں اور ایک دوسرے میں گھل مل جائیں۔ مسجدوں میں شیعہ اور امام بارگاہوں میں سنی نماز ادا کریں۔ یہ مظاہرِ حقیقی رواداری کو پروان چڑھائیں گے۔ سانحۂ راولپنڈی میں جل جانے والی مسجد' مدرسے اور دکانوں کی تعمیر کا بوجھ پنجاب حکومت کو اُٹھانا اور کام کسی تاخیر کے بغیر شروع کر دینا چاہیے۔ عام مطالبہ یہ ہے کہ غفلت کے مرتکب سرکاری افسر اور اہل کار سخت سزاؤں کے مستحق ہیں اور وہ شرپسند بھی جو بیرونی جتھوں کو وقت سے پہلے مسجد کے قریب لے آئے تھے۔ یوں فرائض سے کوتاہی برتنے اور قانون توڑنے والے سرکاری عمال اور شرپسند عناصر کی حوصلہ شکنی ہوگی اور لوگ اُن سے عبرت پکڑیں گے۔

.....☆.....

اہلسنت والجماعت کے امیر مولانا محمد احمد لدھیانوی نے 22 نومبر کو مسجد تعلیم القرآن کے باہر نمازِ جمعہ ادا کرنے اور پرامن مظاہروں کا اعلان کیا تھا۔ اِسی روز اسلام آباد کے جناح کنونشن ہال میں پاکستان ویژن 2025ء کے حوالے سے ایک تقریب منعقد ہوئی جس کا اہتمام پروفیسر احسن اقبال وزیر منصوبہ بندی نے کیا۔ اس تقریب میں پندرہ سو اہم لوگوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور وزیراعظم نواز شریف کو اپنا ویژن قوم کے سامنے پیش کرنا تھا۔ اندیشہ تھا کہ سانحۂ راولپنڈی سے پیدا شدہ حالات کے سبب شرکا کی تعداد بہت کم ہوگی، مگر جب راقم الحروف، جناب سجاد میر، جناب رؤف طاہر، جناب عطاء الرحمٰن اور جناب سکندر حمید لودھی کے ہمراہ ہال میں داخل ہوا، تو ایک گلزارِ کہکشاں کھلا ہوا تھا۔ شاداب جذبوں سے سرشار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اور پُرعزم خواتین ایک نئے عہد کی تلاش میں کشاں کشاں چلی آ رہی تھیں۔ وہاں بزنس ایڈمنسٹریشن، تعلیم، صحت، زراعت، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، معیشت اور تعمیرات کے ماہرین سے ملاقاتیں ہوئیں جن کے چہرے نورِ اُمید سے تمتما رہے تھے۔ تقریب شروع ہوئی، تو وزیراعظم کے شانہ بشانہ چاروں وزرائے اعلیٰ اور آزاد کشمیر کے وزیراعظم تشریف فرما تھے۔ جناب احسن اقبال نے اِس جلوۂ گاہ شوق کی تزئین میں سخت ریاضت اور ذہنی مشقت کی تھی۔ یہ تقریب پورے وفاق کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اُن کا خطبۂ استقبالیہ اس وضاحت سے شروع ہوا کہ ہماری حکومت نے فروری 1999ء میں 2010ء کا ویژن پیش کیا تھا اور اگر اُس پر عمل درآمد ہو جاتا، تو ہمارے ملک کی صورتِ حال آج کی طرح دگرگوں نہ ہوتی۔ انھوں نے حاضرین سے کہا کہ ہمیں ترقی کا سفر طے کرنے کے لیے روزانہ سولہ سولہ گھنٹے کام کرنا اور مشکلات کے پہاڑوں سے امکانات کے چشمے تراشنا ہوں گے۔ وفاقی چیمبر کے صدر جناب زبیر احمد نے کہا کہ صنعت وتجارت کی پوری برادری پاکستان کی تعمیر وترقی میں حکومت کی پشت پر کھڑی ہے۔ ہم نہایت معیاری اشیا تیار کر کے ملکی برآمدات میں بہت بڑا اضافہ کریں گے اور توانائی کا بحران حل کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں گے۔ وزیرِ خزانہ جناب اسحٰق ڈار نے وہی باتیں دہرائیں جو وہ پہلے کئی اجتماعات میں کر چکے تھے۔ غیر معمولی ریاضت کے خوگر ہونے کے باجود اُن کا علمِ کلام بڑا بوجھل اور حقائق سے آنکھیں چُرا رہا تھا۔

جناب وزیراعظم کا خطاب حددرجہ شگفتہ اور بے ساختہ لگا۔ اُنہوں نے فی البدیہہ تقریر میں کمال ملکہ حاصل کر لیا ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں کہا کہ میرے نزدیک اسٹیٹس مین (Statesman) وہ شخص ہے جو ریاست کو ہر معاملے میں سب سے مقدم رکھتا ہے۔ اُنہوں نے یقین دلایا کہ وہ اِس معیار پر پورا اُترنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور بڑے پن کا ثبوت دیتے ہوئے برملا اعتراف کیا کہ ماضی میں اپنی جماعت کے مفاد پرست لوگوں کے جھانسے میں آ کر میں نے سردار اختر مینگل کی حکومت ختم کی تھی جو بہت بڑی حماقت اور بہت بڑی سیاسی غلطی تھی، تاہم اِس بار کفارہ

ادا کرنے کی میں نے شعوری کوشش کی ہے۔ بلوچستان کی حکومت ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کے سپرد کر دی ہے اور مینڈیٹ کے مطابق تحریکِ انصاف کو حکومت سازی کا کھلے دل سے موقع دیا ہے۔ اُنہوں نے وزیراعظم آزاد کشمیر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ یار لوگ آپ کا تخت اُلٹ دینا چاہتے تھے، لیکن میں نے آپ سے فون پر کہا تھا کہ ہم اکھاڑ پچھاڑ کے حق میں نہیں کہ اِس طرح جمہوریت کو نقصان پہنچتا ہے۔ جناب نواز شریف پر تنقید ہو رہی تھی کہ وہ میڈیا میں نظر نہیں آتے اور اُن کی کارگزاری کا اخبارات میں بہت کم چرچا ہو رہا ہے۔ اُنہوں نے براہِ راست جواب دینے کے بجائے حاضرین کو بتایا کہ میں نوجوانوں کی تقدیر بدل دینے اور ملکی معیشت کو توانا کرنے کے لیے دن رات منصوبے سوچتا اور اُن کے خدوخال سنوارتا رہتا ہوں اور یوں ٹی وی اسکرین پر آنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اُنہوں نے قدرے سخت لہجے میں کہا کہ اب چودہ روز کے اندر مجرم کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں گے اور جج صاحبان نقاب پہن کر مقدمات سن کر فیصلے کر سکیں گے۔ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم سیاسی جماعتوں سے عہد لے رہے ہیں کہ معیشت اور سیکیورٹی پر کوئی سیاست نہیں ہوگی۔ اُنہوں نے آخر میں یہ نوید سنائی کہ وہ 2025ء میں پاکستان کو مضبوط، روشن خیال اور خوشحال پاکستان دیکھنا چاہتے ہیں۔

.....☆.....

راولپنڈی میں تعلیم القرآن مسجد کے باہر مولانا محمد احمد لدھیانوی نے نمازِ جمعہ کی امامت کرائی جس میں ہزاروں نمازی شریک ہوئے اور کمال درجہ پُرامن رہے۔ اُدھر جناح کنونشن ہال اُمیدوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور حیات بخش دھوپ میں آرزوؤں کا چمن کھلا ہوا تھا۔ بارہ سو کے لگ بھگ وہ افراد جو پاکستان کے بنانے میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں، وہ نمازِ جمعہ ادا کرنے جوق در جوق آ رہے تھے۔ دوسری صبح جناب احسن اقبال سے ملاقات ہوئی، تو اُنھوں نے بتایا کہ اِس بار بڑے صنعت کار سے چھوٹے تاجر اور بڑے زمین دار سے چھوٹے کاشت کار اور فنِ تعمیرات کے بڑے بڑے ماہرین سے لے کر ٹیکنیشن اور علم و ہنر کے عالمی ماہرین سے لے کر پرائمری اسکول کے اساتذہ تک سب بڑے شوق اور پوری یک سوئی کے ساتھ ویژن 2025ء کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے اور پاکستان کے مستقبل سے گہری وابستگی کا والہانہ اظہار کر رہے تھے۔ یہ منظر فروری 1999ء کے منظر سے یکسر مختلف اور ایقان افروز تھا۔

راولپنڈی اور اسلام آباد کے باخبر حلقوں میں عسکری قیادت کی تبدیلی، فاضل چیف جسٹس کی ریٹائرمنٹ اور ایران کے ساتھ 7 ممالک کے ایٹمی معاہدے پر مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں اور بعض سیاسی نجومی عجب عجب پیشین گوئیاں کرتے رہے۔ جبکہ میرے نزدیک معاملات بالکل سادہ اور مستقبل کے لیے بڑے خوش آئند ہیں۔ وجدان کہتا ہے کہ فوجی کمان کی تبدیلی کے لیے جو تقریب 29 نومبر کو ہو رہی ہے، اُس میں آئین کے مطابق سارے مراحل طے ہو جائیں

گے۔ 26 نومبر کی صبح جنرل کیانی شہید اور ڈیوٹی ادا کرتے ہوئے وفات پا جانے والے سپاہیوں اور جمعداروں کے لواحقین کو فلیٹس کی چابیاں دینے لاہور آئے تھے۔ اِس تقریب میں درجن کے لگ بھگ صحافی بھی شریک ہوئے۔ میں نے جنرل صاحب سے پوچھا کہ آپ کے عزائم کیا ہیں۔ اُنہوں نے بے ساختہ جواب دیا کہ میں جنوری سے اپنے اِس ارادے کا اظہار کرتا آیا ہوں کہ میں آئندہ کوئی ذمے داری قبول نہیں کروں گا۔ اُنہوں نے بتایا کہ بلوچستان کی طرح فوج نے فاٹا میں بھی زبردست فلاحی اور تعمیری کام کیے ہیں۔ فوج اپنے سپہ سالار کیانی کے اِس احسان کو کبھی فراموش نہیں کرے گی کہ اُنہوں نے پہلی بار نان کمیشنڈ فوجی جوانوں کے لیے فلیٹس فراہم کرنے کا بھی آغاز کیا ہے اور اعلیٰ ترین سطح پر ہر فارمیشن میں جوانوں کے مفادات کی حفاظت کے لیے نان کمیشنڈ جونیئر افسر تعینات کیے ہیں۔ ارادے کا اظہار کرتا آیا ہوں کہ میں آئندہ کوئی ذمے داری قبول نہیں کروں گا۔ اُنہوں نے بتایا کہ بلوچستان کی طرح فوج نے فاٹا میں بھی زبردست فلاحی اور تعمیری کام کیا ہے۔ فوج اپنے سپہ سالار کیانی کے اِس احسان کو کبھی فراموش نہیں کرے گی کہ اُنہوں نے پہلی بار نان کمیشنڈ فوجی نوجوانوں کے لیے فلیٹس فراہم کرنے کا بھی آغاز کیا ہے اور اعلیٰ ترین سطح پر ہر فارمیشن میں جوانوں کے مفادات کی حفاظت کے لیے نان کمیشنڈ جونیئر افسر تعینات کیے ہیں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ سپریم کورٹ کے سینئر ترین فاضل جج آئین کے مطابق پاکستان کے چیف جسٹس کے منصب پر فائز ہو جائیں گے۔ آرزوؤں اور تبدیلیوں کی ایک نئی صبح طلوع ہو رہی ہے۔ ایران کے ایک دانش مندانہ اقدام نے عالمی سیاست کی بساط اُلٹ دی ہے۔ ایرانی صدر جناب روحانی نے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے مغربی ممالک سے پُرامن ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے پر معاہدہ کر لیا ہے جو اُن کی قائدانہ عظمت کا بین ثبوت ہے۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ ہم ایٹمی اسلحے کی تیاری میں دلچسپی نہیں رکھتے اور امن کے زبردست حامی ہیں۔ ایران کا مغربی ممالک سے معاہدہ ایران اور پاکستان دونوں کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ اب گیس پائپ لائن بھی تعمیر ہو جائے گی اور گیس کی قیمت میں بھی کمی واقع ہونے کی توقع پیدا ہو چلی ہے۔ ایران کا مغرب سے تیس سالہ تنازع ختم ہو جائے گا اور اگلے سال سے پابندیاں کم ہونا شروع ہو جائیں گی جس کے باعث اِس کی معیشت کو بہت سنبھالا ملے گا۔ پاکستان کے مشیرِ خارجہ تہران پہنچ گئے ہیں اور نئے حالات کے مطابق ایک نئی حکمتِ عملی وضع کی جا رہی ہے۔ پاکستان میں زرِمبادلہ کے ذخائر ساڑھے تین ارب ڈالر کی تشویش ناک سطح پر آ گئے ہیں جن میں فوری اضافے کی شدید ضرورت ہے۔ ان حالات میں کچھ وقت کے لیے بیرونی دوروں پر پابندی لگا دینی چاہیے اور زرعی معیشت پر غیر معمولی توجہ دینے سے صورتِ حال میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ 2025ء ویژن کی تقریب کے مندوبین کہہ رہے تھے کہ پاکستان نے ابھی تک چاول اور کپاس کا معیاری بیج تیار نہیں کیا ہے اور تعمیرات کے میدان میں پاکستان کی نیک نام کمپنیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پاکستان کو سعودی عرب کے ساتھ اپنے مشترک مفادات کو فروغ دینا ہوگا کہ اِس خطے میں توازنِ طاقت کی بساط تبدیل ہو رہی ہے۔

دفتر کنٹونمنٹ بورڈ سرگودھا

ٹینڈر

کنٹونمنٹ بورڈ سرگودھا کے منظور شدہ ٹھیکیدار جنہوں نے مالی سال 14-2013 کی رجسٹریشن فیس اور دیگر واجبات دفتر کنٹونمنٹ بورڈ میں جمع کروا دیئے ہیں اور ایک حالیہ کارآمد کاپی پاکستان انجینئرنگ کونسل (PEC) کی جمع کرادی ہے سے مقررہ فارم پر ایم ای ایس شیڈول آف ریٹس 2009 (ترمیم شدہ) کی بنیاد پر مندرجہ ذیل اوریجنل کاموں کے لئے سر بمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ درخواستیں برائے ٹینڈر فارم کے اجرا کیلئے مورخہ 9 دسمبر 2013ء تک درخواستیں زیر دستخطی کو کام کے دن دفتری اوقات میں پہنچ جانی چاہئیں ٹینڈر فارم کی قیمت مورخہ 10 دسمبر 2013 کو جمع کرانا ہوگی۔ ٹینڈر فارم مورخہ 11 دسمبر 2013 کو جاری کیے جائیں گئے جو کہ مورخہ 12 دسمبر 2013 کو دن 11:00 بجے وصول کیے جائیں گئے اور آدھا گھنٹہ انتظار کے بعد ٹینڈر وصول کرنے بند کردے جائیں گے اور ٹینڈرز بولی دہندگان یا انکے مجاز نمائندوں کی موجودگی میں دن 11:30 بجے کھولے جائیں گے۔

(ORIGINAL WORKS FOR THE YEAR 2013-14)

Sr #	Description of works	Estimated Cost Rs.	Earnest Money. Rs.	Cost of Tender form non- refundable. Rs.	Completion time
01.	Construction of Hall on First Floor Queen Hotel	4.00	0.08	1500	06 Months

شرائط و ضوابط:

1- تخمینہ لاگت کے 2 فیصد کے مساوی زر بیعانہ بشکل کال ڈیپازٹ بنام کینٹ ایگزیکٹو آفیسر سرگودھا منسلک کرنا ہوگی بصورت دیگر ٹینڈرز زیر غور نہ ہوگا۔ چیک / نقد رقم قابل قبول نہ ہوگی۔

2- مشروط ٹینڈرز زیر غور نہ ہوگا۔

3- کنٹونمنٹ بورڈ ریٹ کی معقولیت اور کام کے قابل عمل ہونے کے لیے ریٹ کا تجزیہ (Analysis) مانگنے کا حق رکھتا ہے۔

4- جس فرم / کنٹریکٹر کے ریٹ منظور کیے جائے گے اس کو Non-Judicial سٹمپ پیپر پر اگریمنٹ کرنا ہوگا۔

5- تخمینہ لاگت پراجیکٹ کی تکمیل / فائنلزیشن تک کم یا زیادہ ہوسکتا ہے۔ کنٹریکٹر اضافی کام اپنے دیے گئے ریٹ پر کرنے کا پابند ہوگا۔

6- کینٹ بورڈ کسی قسم سٹورز مہیا نہیں کرے گا۔

7- کام مجاز اتھارٹی / سائیٹ کلیرنس کی منظوری کے بعد دیا جائے گا۔

8- ٹینڈرز او پر دیے گئے شیڈول اور تاریخ منظور نہ ہونے / مسترد ہونے کی صورت میں ری ٹینڈرنگ کا شیڈول درج ذیل ہوگا۔

(a) ٹینڈر فارم کا اجرا مورخہ 17 دسمبر 2013

(b) ٹینڈر فارم کی وصولی مورخہ 18 دسمبر 2013 دن 11:00 بجے ہوگی۔ اور آدھا گھنٹہ انتظار کے بعد ٹینڈر وصول کرنے بند کردے جائیں گے اور ٹینڈرز بولی دہندگان یا انکے مجاز نمائندوں کی موجودگی میں دن 11:30 بجے کھولے جائیں گے۔

9- دیگر شرائط وضوابط کسی بھی کام کے دن دفتری اوقات میں کینٹ ایگزیکٹو آفیسر کے دفتر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور ویب سائٹ www.cbs.gov.pk اور پیپرا کی ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہے۔

10- کینٹ بورڈ کوئی بھی یا تمام ٹینڈر منظور یا مسترد کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

ضیاء الرحمٰن
کنٹونمنٹ ایگزیکٹو آفیسر سرگودھا

PID (I) 2111/13

رسول اللہ ﷺ اور شرارتی بچے

عاصم محمود

بچے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہیں۔ لیکن والدین کی اکثریت بچوں کے حقوق سے عموماً ناواقف ہوتی ہے۔ حالانکہ بحیثیت والدین انھیں ادا کرنا ہر ذی شعور کی ذمہ داری ہے۔ ہمارے دین نے تو ان دیکھے اور پیٹ میں پلتے بچے کو بھی کچھ حقوق عطا کیے ہیں۔ انہی کی وجہ سے وراثت کی تقسیم تک رُک جاتی ہے اور طلاق کا معاملہ بھی زیرالتوا ہوتا ہے۔

فی الحال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا؟ بچوں کی قدرتی ضروریات اور شرارتوں پر آپ ﷺ نے کیسا رویہ پیش کیا؟ کتب سیرت عیاں کرتی ہیں کہ آپ ﷺ بچوں کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوئے مثالی صبر، برداشت اور بھلائی کا مظاہرہ فرماتے تھے۔

قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے کہ اگر ایک مسلمان خدا تعالیٰ کا قرب پانا چاہتا ہے، تو اُسے چاہیے کہ وہ اُسوہ حسنہ کے مطابق عمل کرے۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا ہوگا کہ جب چھوٹے بچے کوئی غلط حرکت کرتے تھے تو حضور اکرم ﷺ انھیں کس انداز میں تنبیہ فرماتے۔ آج کل تو کئی چھوٹے بچے اپنی شرارتوں سے بڑوں کی قوت برداشت کا خوب امتحان لیتے اور اکثر انھیں غصے میں لے آتے ہیں۔

نوزائیدہ بچوں کے ساتھ سلوک

ایک برس سے چھوٹے بچے بڑے جاذب نظر، گول مٹول اور فرشتہ صورت ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کہ گود میں اٹھا کر خوب پیار کیا جائے۔ ان کی معیت میں انسان فطری خوشیاں پاتا اور بڑا لطف اٹھاتا ہے۔ لیکن جونہی

خصوصاً مرد حضرات بازو پر نمی اور ناک میں بو محسوس کریں، تو ان کی تیوری چڑھ جاتی ہے۔ وہ ناگواری کا اظہار کر کے بچے کو واپس ماں کی گود میں ڈالتے اور بک جھک کرتے غسل خانے کا رخ کرتے ہیں۔

لیکن ایسی صورت حال میں آنحضورﷺ نے کبھی اس قسم کا ناپسندیدہ رویہ پیش نہ فرمایا۔ آپﷺ اکثر بچوں کو اپنی آغوش میں لیتے اور زانو پر بٹھاتے تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں کسی قسم کا ''ڈائپر'' موجود نہ تھا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے: ''ایک بار ایک لڑکا رسول اللہﷺ کی خدمت میں لایا گیا تاکہ آپﷺ اُسے تحنیک دے دیں۔ (یعنی کھجور چبا کر اس کے تالو پر مل دیں) اسی دوران بچے نے پیشاب کر دیا۔ تب رسول اللہﷺ نے پانی منگوایا اور اس سے وہ جگہ دھو ڈالی جہاں بول گرا تھا۔'' (البخاری)

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ حضور اکرمﷺ نے ناگواری یا نفرت کا اظہار نہیں فرمایا اور نہ ہی کراہت سے بچے کو ماں کے حوالے کیا۔ حالانکہ اس نے آپﷺ کے بدن کو ناپاک کر ڈالا تھا۔ یہ رویہ بتاتا ہے کہ نبی کریمﷺ نوزائیدہ کی فطری ضروریات بخوبی سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کے ساتھ کمال درجے کے حلم و برداشت کا مظاہرہ فرماتے۔

نوزائیدہ بچہ خود پہ قابو نہیں رکھتا۔ اسی لیے کسی بھی وقت کہیں بھی پیشاب کرتا اور کبھی منہ سے دودھ نکال دیتا ہے۔ ناک بہنا بھی معمول ہے۔ رسول کریمﷺ بچوں کی اس فطرت سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے کبھی بچہ آپﷺ پر پیشاب بھی کر دیتا، تو رسول اللہﷺ گھبراہٹ یا بے چینی کا مظاہرہ نہ فرماتے۔

شرارتوں پر ردعمل

بچے جب تین چار سال کے ہو جائیں، تو متحرک، چونچال اور متجسس ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر طرح طرح کی شرارتیں کرتے اور انوکھے کرتب اپناتے ہیں۔

کتب سیرت بتاتی ہیں کہ آنحضورﷺ اس عمر کے بچوں پر بھی شفقت فرماتے۔ ایسے بچوں کو نہ صرف مسجد میں آنے کی اجازت تھی، بلکہ دوران نماز اگر وہ معصوم شرارتیں کرتے، شور مچاتے یا عبادت میں مخل ہوتے، تب بھی آپﷺ مثالی صبر و برداشت عیاں فرماتے۔

النسائی میں حضرت عبداللہؓ بن شداد سے ایک حدیث بیان ہوئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''میرے والد ایک دن نماز عشا پڑھنے مسجد نبویﷺ تشریف لے گئے۔ جب رسول اللہﷺ امامت کرانے تشریف لائے، تو حضرت حسنؓ (یا حضرت حسینؓ) آپﷺ کے مبارک کاندھوں پر سوار تھے۔ نبی کریمﷺ نے نواسے کو اپنے قریب زمین پر بٹھایا، تکبیر پڑھی گئی اور آپﷺ نماز پڑھانے لگے۔

''ایک بار آپﷺ کا سجدہ خاصا طویل ہو گیا۔ میرے والد کو تشویش ہوئی۔ انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا، تو جانا کہ نواسے آپﷺ کی کمر مبارک پر سوار ہیں۔ چناں چہ وہ پھر سجدے میں چلے گئے۔

''نماز ختم ہوئی، تو چند صحابہؓ آپﷺ کے پاس آئے اور دریافت کیا: ''نبی کریمﷺ! دوران نماز ایک بار آپﷺ نے اتنا طویل سجدہ کیا کہ ہم سمجھے، آپﷺ کو کچھ ہو گیا ہے۔ یا پھر آپﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔''

''رسول اللہﷺ نے تبسم فرمایا اور گویا ہوئے ''کچھ بھی نہیں ہوا۔ دراصل نواسے میری کمر پر سوار تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اُن کے کھیل میں خلل پڑے۔ چناں چہ اُن کے اترنے کا انتظار کرتا رہا۔''

یہ حدیث بھی آشکارا کرتی ہے کہ حضور اکرمﷺ بچوں کی شرارتوں پر کمال ضبط و برداشت کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ نبی کریمﷺ نے سجدہ طویل فرما دیا تاکہ بچہ اپنے معصوم کھیل سے لطف اندوز ہوتا

رہے۔ گو سجدے کی طوالت سے صحابہ کرامؓ متوحش ہو گئے جو آپﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھ رہے تھے۔

بچوں کی راہنمائی کا طریق

بچوں کو چوما یا محبت سے آغوش میں لیا جائے، تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ انھیں پسند ہوتا ہے کہ ان کو مثبت انداز میں چھُوا جائے۔ یہی وجہ ہے، نفسیات کی جدید تحقیق والدین کو بتاتی کہ طویل لیکچر اور پیچیدہ نصیحتیں کرنے سے بہتر ہے کہ عملی طور پر بچوں کی غلطیاں درست کی جائیں۔ نفسیات نے جو طریق کار اب دریافت کیا ہے، نبی کریمﷺ چودہ سو سال قبل اُسے بیان فرما چکے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے ''ایک بار بہ موقع فصل صحابہ کرامؓ رسول اللہﷺ کی خدمت میں کھجوریں لانے لگے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ نبی کریمﷺ کے سامنے کھجوروں کا ڈھیر جمع ہو گیا۔ نزدیک ہی حضرت حسنؓ و حسینؓ کھیل رہے تھے۔ کھیل کھیل میں ایک نواسے نے منہ میں کھجور ڈال لی۔

رسول اللہﷺ نے یہ دیکھ کر نواسے کے منہ سے ہاتھ کے ذریعے کھجور نکالی اور فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آل رسولﷺ کا کوئی فرد خیرات نہیں کھایا کرتا۔'' (البخاری)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ ایک مسئلے کے فوری اور مؤثر حل کی خاطر کیسی عمدہ حکمت عملی اپنانی چاہیے۔ نبی کریمﷺ نے خود نواسے کے منہ سے کھجور نکالی اور مختصر لفظوں میں وجہ بھی بیان فرما دی۔ ورنہ آپ کسی بچے کو لاکھ کہیے، وہ کبھی اپنے منہ سے از خود مزے دار کھجور کبھی نہیں نکالے گا۔

آج کل بیشتر والدین کا وتیرہ ہے کہ وہ بچوں پر وجہ بے وجہ برستے رہتے ہیں۔ جھڑکتے ہوئے حکم دیا جاتا ہے کہ فلاں شے کو مت چھوؤ، اس جگہ مت جاؤ یا یہ کام کرو۔ عموماً بچہ یہ ہدایات نظر انداز کر دیتا ہے۔ تب انا و غصے کے مارے والدین مہمانوں کے سامنے بھی اس کی دھنائی کر ڈالتے ہیں۔

درج بالا حدیث والدین کو درست طریق کار بتاتی اور ان کی راہنمائی کرتی ہے۔ یہ کہ بالغ کو چاہیے، وہ چیخنے کے بجائے خود اٹھے اور ہاتھ سے بچے کو خطرے سے دور کر دے۔ ساتھ ساتھ مختصر اور شُستہ الفاظ میں اُسے وجہ بھی بتا ڈالے۔ درج ذیل حدیث بھی اس حکمت عملی کی تائید کرتی۔

ابوداؤد میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں ''رسول کریمﷺ بہترین اخلاق و عادات کے حامل تھے۔ ایک دن آپﷺ نے مجھے کسی کام سے بھیجنا چاہا۔ (میرا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا) لہٰذا میں نے کہا: ''اللہ کی قسم، میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن میرا دل کہتا تھا کہ رسول اللہﷺ نے جو حکم دیا ہے، اُسے بجا لاؤ۔''

''آخرکار میں (کام کی خاطر) باہر نکل آیا۔ گلی میں چند لڑکے کھیل رہے تھے۔ میں رک کر، انھیں دیکھنے لگا۔ اچانک نبی کریمﷺ میرے پیچھے تشریف لے آئے اور انھوں نے مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا، تو آپﷺ مسکرا رہے تھے۔ آپﷺ نے فرمایا: اے صغیر (ننھے) انس اپنے کام سے جاؤ۔ میں نے کہا: ''رسول اللہ! میں جاتا ہوں۔''

یہ حدیث بتاتی ہے کہ حضور اکرمﷺ نے ہاتھ کے استعمال اور ہلکی پھلکی ڈانٹ کے امتزاج سے ننھے حضرت انسؓ کو یاد دلایا کہ وہ کام کرنا بھول گئے۔ دراصل نبی کریمﷺ جانتے تھے کہ گلی میں کھیلتے لڑکے دوسرے لڑکوں کی توجہ بھی کھینچ لیتے ہیں۔

حدیث یہ بھی واضح کرتی ہے کہ بچہ جب کچھ بڑا ہو جائے، تو اس سے چھوٹے موٹے اور آسان کام کرائے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کئی بچے فوراً کہنا نہیں مانتے اور خصوصاً دوسرے بچوں کے کھیل بہت جلد ان کی توجہ کھینچ لیتے ہیں۔

سمجھانے کا بلیغ انداز

سات آٹھ برس کی عمر میں بچہ برے اور بھلے کے مابین تمیز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ جب کسی ایسے بچے کو غلط حرکت کرتا دیکھتے، تو اُسے بہت پیار، شفقت اور جامع و بلیغ الفاظ میں سمجھاتے۔ اس کو بتاتے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ یہ نہیں کہ اُسے ڈانٹتے ڈپٹتے اور دوسروں کے سامنے ذلیل کرتے۔

حضرت ابو سلمہؓ جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔ حضرت ام سلمہؓ کے بطن سے آپ کے چار بچے تولد ہوئے تھے۔ 3ھ میں آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح فرمایا، تو ان کے چاروں بچے بھی آپ ﷺ کی تولیت میں آ گئے۔ تب حضرت عمر بن ابو سلمہؓ سات آٹھ سال کے تھے۔ ان سے بخاری و مسلم میں درج ذیل روایت آئی ہے:

''میں لڑکے کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کی نگہداشت میں تھا۔ جب کھانا کھانے لگتا، تو کبھی کبھی میں دونوں ہاتھوں سے کھانے لگتا۔ ایک دن نبی کریم ﷺ نے مجھے شفقت سے فرمایا: کھانے سے پہلے اللہ کا نام لو (یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھو)، سیدھے ہاتھ سے کھاؤ اور جو کچھ سامنے پڑا ہے، اس میں سے لو۔''

چھوٹے، بڑے بچے زیادہ عرصہ کسی بات یا کام کی طرف متوجہ نہیں رہتے، توانائی کی بہت زیادہ مقدار رکھتے اور انتہائی متجسس طبیعت پاتے ہیں۔ اسی لیے وہ دنیا کی ہر شے کھوجتے اور دیکھتے بھالتے ہیں جن میں بیشتر ان کے لیے نئی ہوتی ہیں۔

لیکن بہت سے والدین غلط فہمی کے باعث اپنے بچوں کی فطری ضروریات اور رویوں کو منفی انداز میں لیتے ہیں۔ لیکن وہ صبر و برداشت کا مظاہرہ کریں اور ڈانٹ ڈپٹ یا مار پیٹ کے بجائے پیار محبت سے سمجھانے کا طریقہ اپنائیں تو بچے ان کی ہدایات جلد سمجھ جائیں گے۔

یاد رکھیے، بچے بچیاں اللہ تعالیٰ کا انمول تحفہ ہیں۔ لہٰذا ان سے درشت و کرخت سلوک ہرگز نہ کیجیے۔ ابھی تو اللہ تعالیٰ بھی ان کے ''گناہ'' لکھنا شروع نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ معصوم و نیک روحیں اگر دانستہ بھی کوئی برتن توڑ ڈالیں، الماری میں کسی قیمتی شے کو چھوئیں، تو انھیں ہاتھ نہ لگائیے بلکہ نرمی سے سمجھائیے اور ان کی توجہ بانٹ دیں۔

جو ماں یا باپ بچوں پر سختی کرے، ان سے درشتی کے ساتھ پیش آئے، وہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں معتوب قرار پاتا ہے۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو والدین اپنے چھوٹے، کمزور اور بے بس بچوں پر ظلم کرتے اور کسی قسم کی ندامت یا شرمندگی محسوس نہیں کرتے، وہ بڑھاپے میں تنہائی اور بے بسی کی تصویر بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ظلم کا شکار اولاد ان کی نگہداشت نہیں کرتی اور یوں انتقام لیتی ہے۔ بچپن کی یادوں کے باعث وہ والدین سے نفرت کرنے لگتی ہے۔

والدین اور تمام بالغ مرد و زن کو چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً اُسوۂ حسنہ کا مطالعہ کریں۔ یہ پڑھیں اور جانیں کہ نبی کریم ﷺ نے بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا۔ یوں ہدایت پا کر وہ بھی بچوں کے ساتھ درست رویہ اپنائیں گے۔ اسی طرح والدین نہ صرف اولاد کے انتقام بلکہ اللہ تعالیٰ کے قہر سے بھی بچ سکتے ہیں۔

○○○

ایک سعید روح کا ماجرا

ان کا قبولِ اسلام ان کے والد کو بہت بھاری پڑا تھا

ایک خوفناک خواب کیسے سراسر خیر بنا؟

آنحضور ﷺ نے آپ کو یمن کا حاکم بنا دیا

انھیں تین دن تپتے پتھروں کے درمیان رکھا گیا جہاں سایہ تھا نہ ہونٹ تر کرنے کے لیے پانی کی ایک بوند

وہ نعمتوں سے بھرے اور سرداری سے سجے گھر میں پیدا ہوئے۔ ان کا باپ قریش میں صدارت و زعامت کے منصب پر فائز تھا۔ ان کا شجرۂ نسب یوں ہے: خالدؓ سعید بن العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف!

نور کی شعاعوں نے شرماتے شرماتے امانتدار جناب محمد ﷺ کے بارے میں یہ سرگوشی کرتے ہوئے مکہ کے کونوں گوشوں میں پھیلنا شروع کیا کہ محمد ﷺ غارِ حرا کے اندر اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں، تو خالدؓ بن سعید کے قلب نے اس نورانی سرگوشی کو ہمہ تن گوش اور حاضر باش ہو کر سننا شروع کر دیا!

ان کا دل خوشی سے محوِ پرواز ہو گیا گویا ان کا اور رسالت محمد ﷺ کا آپس میں کوئی وعدہ ہوا تھا جو پورا ہو رہا تھا۔ آپؓ روشنی کی ان شعاعوں اور کرنوں کے پیچھے چلنا شروع ہو گئے۔ آپؓ جب بھی اپنی قوم کے سرداروں کو اس دینِ جدید کے بارے میں گفتگو کرتے دیکھتے، تو ان کی باتیں سننے کے لیے بیٹھ جاتے لیکن دل میں اس دین کی محبت چھپائے ہوتے اور اس دوران کچھ باتیں ذہن نشین بھی کر لیتے جو ان کے اندر تاثیر چھوڑ جاتیں۔

یہ نوجوان اس بہت بڑی خوشی کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔ اگر اس کے باپ کو علم ہو جاتا کہ اس کا بیٹا محمد ﷺ کی دعوت کو اپنے دل میں اس قدر محبوب رکھتا ہے، تو باپ، عبد مناف کے خداؤں کی خاطر اسے زندگی سے محروم کر ڈالتا۔

قارئین کرام! ایک بات مسلمہ ہے کہ جب کوئی معاملہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے اور دل کو

لبالب بھر دے، تو پھر کوئی قوت ایک دم اس کو دل سے نہیں نکال سکتی۔ یہی معاملہ اس سدید فطرت اور سلیم طبع نوجوان کا تھا!

ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضرت خالدؓ رات کو نیند میں بھی بیدار ہی رہے۔ اس روز وہ جان لیوا پُر تاثیر و عطر بیز عجیب وغریب خواب دیکھتے رہے۔ آپؓ نے دیکھا کہ وہ آگ کے ایک بہت بڑے الاؤ اور دہکاؤ کے قریب کھڑے ہیں اور ان کا باپ انھیں آگ میں پھینکنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے انھیں دھکے دے رہا ہے۔ پھر آپؓ رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ ان کی طرف آتے ہیں اور اپنے دست مبارک سے ان کا تہبند پکڑ کر انھیں کھینچ لیتے ہیں اور آگ سے دور کر دیتے ہیں۔

حضرت خالدؓ صبح نیند کی بے ہوشی سے آزاد ہوئے، تو اپنے نئے دن کا پروگرام لیے ہوئے تھے۔ جلدی سے جناب ابوبکر صدیقؓ کے گھر جاتے ہیں اور آپؓ سے سارا خواب بیان کرتے ہیں اور یہ خواب اپنی تعبیر آپ تھا اس کی کوئی تعبیر تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

حضرت ابوبکرؓ ان سے فرماتے ہیں: ''یہ تو سراسر خیر ہے جو میں تمھارے لیے چاہتا ہوں۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں ان کے اتباع کا عہد کر لیجیے یہ اسلام تمھیں آگ سے بچالے گا۔''

حضرت خالدؓ رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں آپ ﷺ تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ سے ملتے ہیں اور آپ ﷺ کی دعوت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ ﷺ جواب دیتے ہیں کہ میری دعوت یہ ہے:

''تم اللہ وحدہٗ پر ایمان لاؤ اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، اللہ کے بندے اور رسول محمد ﷺ پر ایمان لاؤ۔

ان بتوں کی پرستش چھوڑ دو جو نہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ تکلیف دے سکتے ہیں اور نہ نفع پہنچا سکتے ہیں۔''

حضرت خالدؓ زبانِ رسالت علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے یہ جواب سنتے ہیں تو اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ اپنے دستِ مبارک سے اسے تھام لیتے ہیں۔ حضرت خالدؓ دستِ رسالت میں اپنا ہاتھ دے کر اعلان کرتے ہیں:

''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

جس روز حضرت خالدؓ بن سعید ایمان لائے اس وقت تک چار افراد سے زیادہ مسلمان نہیں تھے۔ اس لحاظ سے وہ پانچ اوّلین مسلمانوں میں سے تھے۔

اس ''حادثہ'' کی خبر حضرتِ خالدؓ کے باپ سعید تک پہنچ جاتی ہے۔

سعید بن العاص کا کوئی بیٹا اسلام لے آئے؟ یہ تو سعید بن العاص کی رائے میں ایسی حرکت تھی جو اسے قریش کے سامنے ذلیل ورسوا کر دینے کے مترادف تھی اور اس کی سرداری و سیادت کے پاؤں تلے سے زمین سرکا دینے والی تھی!

سعید نے بیٹے کو بلایا اور پوچھا: ''کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے محمد ﷺ کی پیروی کر لی ہے اور تم انھیں ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتے ہوئے سنتے ہو؟''

بیٹے نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! وہ تو صادق ہیں اور میں ان پر ایمان لے آیا ہوں اور ان کا پیروکار بن گیا ہوں!''

باپ نے اسی وقت ان پر ضربوں کی بارش کر دی۔ پھر ان کو گھر کے ایک تاریک کمرے میں ٹھونس دیا جو ان کی جیل قرار پائی۔ باپ، بیٹے کو مسلسل بھوکا اور پیاسا رکھ رہا تھا اور بیٹا بند دروازے کے پیچھے سے با آواز بلند پکار رہا تھا: ''اللہ کی قسم وہ سچے ہیں اور میں ان پر ایمان رکھتا ہوں۔''

سعید نے محسوس کیا کہ اس نے بیٹے پر تشدد کی جو انتہا کی ہے وہ ابھی ناکافی ہے لہٰذا اس کو مکہ کے تپتے صحرا میں لے جاتا ہے۔ جہاں اسے تین دن تک دہکتے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کے درمیان رکھتا ہے وہاں کوئی سایہ ہے نہ ہونٹ تر کرنے کے لیے پانی کا قطرہ!

باپ تشدد کا یہ حربہ آزما کر بھی ناکام رہتا ہے۔ لہٰذا بیٹے کو گھر لے آتا ہے، اسے کبھی لالچ دیتا ہے، کبھی ڈراتا اور دھمکاتا ہے لیکن بیٹا حق کے مانند ثابت قدم اور غیر متزلزل رہتا ہے، پھر باپ سے کہتا ہے:

''میں کسی چیز کی خاطر ہرگز اسلام نہیں چھوڑوں گا، اسی پر جیوں گا اور اسی پر مروں گا۔''

باپ گرجتا ہے:

''بدبخت مجھ سے دور ہو جا! لات کی قسم! میں تمھیں کھانے کو کچھ نہیں دوں گا۔''

بیٹا جواب دیتا ہے: ''اللہ بہترین رازق ہے!''

اب بیٹا غلہ و اناج اور راحت و آرام اور لباس و طعام سے اس بھرے پُرے گھر کو چھوڑ کر فقر و فاقے کو گلے لگا لیتا ہے!

قارئین کرام کیا یہ تعجب خیز بات نہیں ہے؟

ہاں تعجب خیز تو ہے، مگر یہ بھی ایک سوال ہے کہ کیا ان کے ساتھ ان کا ایمان نہیں تھا؟

کیا ضمیر کی کامل راہنمائی اور دین کی پوری سچائی ان کا تحفظ کرنے والی نہیں تھی؟

پھر یہاں بھوک کا کیا کام تھا؟ فاقے سے کیا خطرہ تھا؟ اور تشدد کا کیا خوف تھا؟

جب انسان اپنے آپ کو اس حق جیسے بہت بڑے حق کے ساتھ پائے جس کی طرف جناب محمد رسول ﷺ بلا رہے ہوں، تو پھر کیا دنیا میں کوئی ایسی قیمتی شے رہ جاتی ہے جو اللہ کی ملکیت ہو اور وہی اسے تقسیم کرنے والا ہو اور وہ انسان کو نہ ملے؟

حضرت خالدؓ نے اسلام قبول کر کے اور دین کی راہ پر ثابت قدمی کا بے مثال مظاہرہ کر کے گویا اپنے جسم و جان اور دنیا و جہان کی قربانی پیش کر کے عذاب و تشدد کو بھی ''تشدد'' سے دوچار کر دیا اور فقر و فاقہ کے اوپر ایمان بٹھا دیا!

جب رسول ﷺ نے اپنے اہل ایمان ساتھیوں کو حبشہ کی دوسری ہجرت کا حکم فرمایا، تو حضرت خالدؓ بن سعید ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے اس ہجرت کے لیے رختِ سفر باندھا۔ حضرت خالدؓ کو مشیت الٰہی کے مطابق وہاں جتنا عرصہ ٹھہرنا تھا، ٹھہرے۔ پھر ہجرت کے چھٹے برس اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے ملک واپس آگئے۔

نبی ﷺ کا کوئی غزوہ ایسا نہیں جس میں حضرت خالدؓ بن سعید پہلی صفوں میں نہ ہوتے! آپؓ قبولیتِ اسلام میں سبقت اور عقیدہ و ضمیر کی استقامت کے پیش

نظر محبت و اکرام کا مرکز قرار پاگئے تھے۔ آپؓ اپنے عزم کی حرمت کے پاسبان تھے، اس پر کسی لغزش کا مظاہرہ کرتے نہ کسی سودے بازی کا ذہن میں خیال آنے دیتے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے قبل آپؓ کو یمن کا حاکم مقرر فرمایا۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلیفہ بن جانے اور لوگوں سے بیعت لینے کی خبر آپؓ تک پہنچی، تو آپؓ اپنی ذمہ داری چھوڑ کر مدینہ آگئے۔

حضرت خالدؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اس قدر احترام و اکرام کرتے اور آپ کے فضل کے بے پناہ معترف تھے کہ اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ مگر خلافت کے بارے میں آپؓ کی رائے یہ تھی کہ مسلمانوں میں اس کے سب سے زیادہ حقدار بنو ہاشم میں سے حضرت عباسؓ یا حضرت علی بن ابی طالبؓ ہیں۔

اس رائے اور اختلاف کے پیشِ نظر آپؓ نے جناب ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی اور الگ ہی رہے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ انھیں وہی غیر معمولی محبت اور احترام دیتے رہے جو اس سے قبل دیتے تھے۔ جناب ابوبکر صدیقؓ نے آپؓ کو اس بات پہ مجبور نہیں کیا کہ میری بیعت کرو اور نہ اس بات پہ ناراض ہوئے کہ آپؓ نے میری بیعت نہیں کی۔ مسلمانوں میں جب ان کا ذکر آتا، تو حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کے مقام و مرتبے کے شایانِ شان ان کی تعریف و توصیف فرماتے۔

کچھ وقت گزرا، تو حضرت خالدؓ کے موقف میں تبدیلی آگئی اور وہ ایک روز مسجد کے اندر صفوں کو چیرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پاس چلے گئے جو منبر پر تشریف فرما تھے اور آپؓ کی سچی اور پکی بیعت کرلی۔

پھر جب حضرت ابوبکر صدیقؓ شام کی طرف لشکر

پرہیز علاج سے بہتر ہے لیکن پرہیز صحیح اور مستند معلومات کے بغیر ممکن نہیں

- کیا آپ اپنی بیماری کی نوعیت کو سمجھنا چاہتے ہیں؟
- شوگر آنکھوں کو کیا نقصان پہنچاتی ہے؟ اس سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟
- کیا عینک اُتر سکتی ہے؟
- لیزر سے عینک اُتارنے کا آپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
- کیا آپ کو لیزر لگوانے کا مشورہ دیا گیا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آرہی کہ لگوائیں یا نہ لگوائیں؟

ڈاکٹر آصف کھوکھر آئی سرجن
ایم بی بی ایس (پنجاب) ایم سی پی ایس (آئی) ایم اے (علوم اسلامیہ)
Email: drasifkhokhar@hotmail.com

اس طرح کے سوالوں کے جواب اور جدید ترین طریقہ ہائے علاج سے متعلق معلومات کے لیے

مندرجہ ذیل ویب سائٹ کا مطالعہ کریں

www.drasifkhokhar.com

آنکھوں کی بیماریوں سے متعلق اُردو کی واحد ویب سائٹ

روانہ فرماتے ہیں، تو حضرت خالدؓ بن سعید کے ہاتھ میں پرچم تھماتے ہیں۔ اس طرح حضرت خالدؓ لشکر کے کمانڈر بن جاتے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ لشکر مدینہ سے روانہ ہوتا، حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ بن سعید کی امارت کے خلاف رائے دے دی اور خلیفہ سے ان کی معزولی کا مطالبہ مسلسل کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت خالدؓ کی امارت کا فیصلہ تبدیل کرادیا۔

حضرت خالدؓ کو خبر ملتی ہے، تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے کہ:

''اللہ کی قسم! میں اپنے تقرر کے تمھارے فیصلے پر خوش ہوا نہ اپنی معزولی کی خبر پر ناراض۔''

ادھر خلیفۂ رسول جناب صدیقؓ معذرت کے لیے اور اپنے مؤقف کی وضاحت کے لیے حضرت خالدؓ کے گھر جاتے ہیں۔ ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے ساتھیوں میں سے آپ کے چچازاد عمروؓ بن العاص اور شرحبیلؓ بن حسنہ میں سے آپ کس کو پسند کرتے ہیں کہ وہ کمانڈر ہو؟

حضرت خالدؓ جو جواب دیتے ہیں وہ ان کی عظمت اور تقویٰ و کردار کی نشاندہی کرتا ہے۔

فرماتے ہیں: ''چچازاد قریبی ہونے کی بنا پر مجھے محبوب ہے اور شرحبیلؓ دین کی بنیاد پر۔''

پھر آپؓ شرحبیلؓ بن حسنہ کے دستے میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شامل ہونے کا انتخاب کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ لشکر کی روانگی سے قبل حضرت شرحبیلؓ کو بلاتے ہیں اور ان سے فرماتے ہیں: ''خالدؓ بن سعید کو دیکھ لو، اپنے اوپر ان کے حق کو اسی طرح پہچانو کہ اگر تم ان کی جگہ ہوتے اور وہ تمھاری جگہ تو تم چاہتے کہ وہ تمھارے حق کو پہچانیں؟

تم اسلام میں ان کے مقام و مرتبے سے بخوبی واقف ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے جب وفات پائی، تو یہ آپ ﷺ کی طرف سے گورنر تھے۔ میں نے بھی ان کو ذمہ داری دی لیکن پھر اس فیصلے کو تبدیل کردیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ فیصلہ ان کے دین میں کسی خیر کا باعث بن جائے۔ مجھے تو کسی کو امیر بنانے میں کوئی ذاتی دلچسپی اور خوشی نہیں ہے! میں نے اُنھیں کمانڈروں میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا، تو انھوں نے اپنے چچازاد کے بجائے آپ کو منتخب کیا۔

جب تمھیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے کہ تمھیں کسی متقی و خیر خواہ کی رائے درکار ہو تو ابوعبیدہؓ بن جراح پہلے، معاذؓ بن جبل دوسرے اور خالدؓ بن سعید تیسرے آدمی ہیں جن سے تمھیں رائے لینے کا آغاز کرنا چاہیے۔ تم ان لوگوں میں سراسر خیر اور بھلائی ہی پاؤ گے اور ہاں...... ان کی رائے کو نظر انداز کرکے اپنی رائے ٹھونسنے اور اسے مخفی رکھنے سے اجتناب کرنا۔''

شام کے اندر مرج الصفر کے مقام پر جہاں مسلمانوں اور رومی افواج کے درمیان تباہ کن معرکہ برپا ہوا۔ حضرت خالدؓ ان لوگوں میں سرِفہرست تھے جن کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوچکا تھا۔

یہ جلیل القدر شہید جس نے اپنی بھرپور جوانی سے لے کر شہادت تک زندگی کا ایک ایک لمحہ صادق و شجاع مومنانہ کردار میں بسر کیا، شہدائے معرکہ میں اس طرح دکھائی دے رہے تھے جس طرح ہمیشہ زندگی میں پرسکون اور صمیم عزم رہے۔ اس پر لوگوں نے بے ساختہ کہا: یااللہ! خالدؓ بن سعید سے راضی ہوجا!

(بشکریہ منشورات)

زوال بلاوجہ نہیں آتا

ہندوستان کی بادشاہی کیوں ہمیشہ بے وفا رہی؟

میاں محمد افضل

طوائف الملوکی کے ان دس بدترین سالوں کا ماجرا جن کو تاریخ نے یاد رکھا اور سامانِ عبرت بنایا

ہندوستان کے تخت پر ترک سلاطین (خلجی خاندان و تغلق خاندان) نے تیرھویں صدی کے آغاز سے چودھویں صدی عیسوی کے آخر تک دو سو سال حکومت کی۔ ان سے پہلے دو سو سال ہندوستان کی سرزمین سلطان محمود غزنوی اور سلطان محمد غوری جیسے افغان اور ترک بادشاہوں کے طوفانی حملوں کا تختۂ مشق بنی رہی۔ جم کر حکومت ترک سلاطین نے کی لیکن افسوس کہ ماسوائے چند کے ان بادشاہوں کی اکثریت لہوولعب، فسق و فجور، بے جا خونریزی، مردم کشی اور حرص و آز جیسی ناقابل معافی برائیوں میں غرق رہی۔ غیاث الدین تغلق اور فیروز شاہ تغلق جیسے بادشاہ اگر ان برائیوں سے محفوظ تھے، تو بھی انھوں نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ اور سربلندی کے لیے کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ برصغیر میں مسلمان بادشاہوں کو حکومت کرنے کا بہت طویل موقع میسر آیا لیکن کسی بادشاہ نے (ایک دو مستثنیات کے سوا) اسلام کو اس سرزمین میں غالب اور مستحکم کرنے میں دلچسپی نہ لی بلکہ اکثریت جہاد کے مقاصد سے اِعراض کرتے ہوئے محض کشور کشائی اور خزانہ جمع کرنے اور غیر مسلموں کے زیر اثر اسلام کو ضرر پہنچانے والے کام کرتی رہی۔ ان حالات میں قدرت کی طرف سے تیمور اور نادر شاہ نازل ہو کر ان کو سزا دیتے رہے، تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

آئیے دیکھیں کہ تیمور کے حملے (1398ء) سے پہلے دو سو سالوں میں سلاطین دہلی کیا کیا کرتے رہے اور ان کے ہاتھوں انسانیت کی کیسی تذلیل ہوتی رہی زوال کبھی بغیر وجہ کے نہیں آتا، اس کا کوئی وقت بھی طے نہیں ہوتا۔ حکمران اور اقوام جب وہ افعال اعلانیہ انجام دینے لگتے ہیں جو خدائے بزرگ و برتر کو ناپسند ہیں تو وہ اُن کو ڈھیل دیتا ہے کہ وہ راہِ راست پر آجائیں اور اُس کے بعد دنیا کے لیے عبرت کا نشان بنا دیتا ہے۔ تب وہ اپنے دفاع کے قابل رہتے ہیں نہ اپنے ملک اور قوم کے۔ کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ بطور مُشتے از خروارے، چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

سلطان التمش نے وفات پائی، تو اس کے بیٹے رکن الدین نے پہلے حکومت سنبھالی، اس کے بعد رضیہ سلطانہ کو موقع ملا۔ تاریخ فرشتہ میں رکن الدین کے بارے میں لکھا ہے:

''اس نے انتظامی امور کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی اور شب و روز عیش و عشرت میں بسر کرنے لگا: خزانہ بڑی فراخدلی سے گویوں اور بھانڈوں پر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سارا وقت پینے پلانے اور عیاشی کی نظر کرنے لگا۔'' رضیہ سلطانہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ایک حبشی غلام یاقوت کی گرویدہ ہو گئی ''یاقوت حبشی نے رضیہ سلطانہ کے دل میں کچھ ایسا گھر کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ امیر الامرا بن گیا، اس کا اثر یہاں تک

> تاریخ فیروز شاہی کے مصنف ضیاء الدین برنی کا بیان ہے: ''قہر و غصہ کی حالت میں وہ (بلبن) خدا کے ڈر کو بھول جاتا۔ باغیوں اور سرکشوں کو قتل کرنے میں ان کی صلاحیت اور دینداری کو پسِ پشت ڈال دیتا، اپنی مرضی کرتا خواہ وہ کام شرع کے مطابق ہوتا یا خلاف۔''

بڑھا کہ جب رضیہ گھوڑے پر سوار ہونے لگتی، تو اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے گھوڑے پر بٹھاتا۔'' (تاریخ فرشتہ) بالآخر بغاوت ہوئی اور رضیہ سلطانہ قتل ہو گئی۔

علاؤ الدین مسعود بن رکن الدین فیروز شاہ کے بارے میں مورخ گواہی دیتے ہیں کہ شراب نوشی اور عیاشی کی کثرت نے اسے عدل و انصاف سے محروم کر دیا اور رعیت پر ظلم و جبر اور جائدادوں کی ضبطی کے علاوہ کوئی کام نہ کیا اور ملک میں فساد پھیلا۔ غیاث الدین بلبن بیدار مغز حکمران تھا لیکن مخلوق کو سزا دینے میں حدود سے تجاوز کرتا تھا۔

تاریخ فیروز شاہی کے مصنف ضیاء الدین برنی کا بیان ہے: ''قہر و غصہ کی حالت میں وہ (بلبن) خدا کے ڈر کو بھول جاتا۔ باغیوں اور سرکشوں کو قتل کرنے میں ان کی صلاحیت اور دینداری کو پسِ پشت ڈال دیتا، اپنی مرضی کرتا خواہ وہ کام شرع کے مطابق ہوتا یا خلاف۔''

بلبن کا جانشین معز الدین کیقباد حد درجہ عیاش اور نفس پرست تھا۔ تاریخ فرشتہ میں ہے: ''جب قسمت نے کیقباد کو فرمانروائی کے درجہ تک پہنچایا، تو اس نے بڑی فراخدلی سے عیش کوشی اور نفس پرستی میں اپنا وقت ضائع کرنا شروع کر دیا۔ گویوں، مسخروں، شرابیوں اور عیش پرستوں کے اقبال کا ستارہ بلند ہو گیا۔ گلی گلی کوچے کوچے گانے بجانے، ناچ، راگ رنگ کی محفلیں جمنے

لگیں۔ دہلی کے ہر گوشے سے غزل خواں شیریں آواز آنے لگے، شرعی قوانین کی کوئی پروا نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں شراب کے سیلاب میں بہا دیا گیا ہے۔ حالت یہ ہوئی کہ قاضی اور محتسب جیسے لوگ بھی ان اعمال خبیثہ میں مبتلا ہو گئے۔'' بادشاہ ادنیٰ قسم کے سفلی جذبات کی تسکین میں کھویا تھا۔ شراب و شباب و کباب کے علاوہ اسے اپنی مطلق العنانی کا کوئی مصرف نظر نہ آتا تھا۔ بادشاہ کے مزاج کی رنگینی دیکھ کر اس کے مصاحب نت نئے فتنہ ہائے روزگار، اس کے سامنے پیش کرتے اور منہ مانگا انعام پاتے۔ بادشاہی ذوق و عشرت کی تنوع پسندی کا یہ عالم کہ بازاری فاحشہ عورتوں سے لے کر رقص و موسیقی کے ماہر، حسین، امرد ساقی گری اور دیگر تمام اس قسم کے کام کرتے اور بادشاہ کے منظورِ نظر تھے۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے: ''خوش الحان اور حسین لوگ، ہنسانے والے مسخرے اور بھانڈ دربار میں آ گئے۔ فسق و فجور کا رواج عام ہو گیا، شراب اور عرق بیچنے والوں کی ہمیانیاں سونے اور چاندی کے ٹنکوں سے بھر گئیں۔ حسین بدکار اور مشہور فاحشہ عورتیں سونے اور زیورات میں غرق ہو گئیں..... کم عمر لڑکوں کے گانے، عربدہ جُو رقاصاؤں کے ناچنے، ملیح دلرباؤں کے کرشموں اور ان جفاکار بے وفاؤں کے غمزہ و ادا سے لشکر کے من چلے عاشق دیوانے ہو جاتے..... عاشق مزاج نوجوان اور پریشان حال دیوانے اپنے سر و ڈھنے اور کپڑے پھاڑتے تھے۔ حسن پرستوں نے ان حسینوں کی محبت میں ناقوس ہاتھوں میں لے لیے اور بتوں کی طرح ان کی پوجا کرتے تھے..... عقل مندان پر فریفتہ اور علما معصیت میں مبتلا ہو گئے۔ زاہدوں نے عبادت سے ہاتھ کھینچ لیا اور عابدوں نے شراب خانوں کے دروازوں کو پکڑ لیا۔ شرم و حیا درمیان سے اٹھ گئی۔ عزت و آبرو جاتی رہی، بے حیائی پھیل گئی۔ قبوں میں شراب کی سبیلیں لگا دی گئیں۔'' کثرت عیاشی سے بادشاہ کیقباد حکیموں اور طبیبوں کے تمام ترنسخوں اور کشتوں کے باوجود ہمت سے محروم ہو گیا، قوت فیصلہ جاتی رہی، امرا اور سازشی عناصر چھا گئے بالآخر اسے قتل کر کے دریائے جمنا میں بہا دیا گیا۔

> معزالدین کیقباد کا جانشین جلال الدین فیروز شاہ خلجی نسبتاً بہتر تھا لیکن اخلاقی خرابیوں کو دور کرنے کی اس نے کوئی کوشش نہ کی، بلکہ اپنے پیش رو کی طرح عیش و نشاط کی طرف متوجہ رہا۔ اس کے دور میں بھی خوبرو ساقیوں اور مطربوں کی قدر ہوتی رہی۔ لطیفہ گو، گویئے، غزل خواں اور شراب نوش مصاحب بادشاہ کو پسند تھے۔

معزالدین کیقباد کا جانشین جلال الدین فیروز شاہ خلجی نسبتاً بہتر تھا لیکن اخلاقی خرابیوں کو دور کرنے کی اس نے کوئی کوشش نہ کی، بلکہ اپنے پیش رو کی طرح عیش و نشاط کی طرف متوجہ رہا۔ اس کے دور میں بھی خوبرو ساقیوں اور مطربوں کی قدر ہوتی رہی۔ لطیفہ گو، گویے، غزل خواں اور شراب نوش مصاحب بادشاہ کو پسند تھے۔

مورخ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں: ''سلطان کی

مجلس کے ساقی ہیبت خان کے لڑکے نظام خریطہ دار اور یلدز ساقیوں کے سردار تھے۔ یہ لوگ حسن و جمال اور کرشمہ سازی میں ایسے تھے کہ جو زاہد یا عابد ان کو دیکھتا زنار باندھ لیتا اور اپنی جانماز کو شراب خانے کا بوریا بنا لیتا۔ سلطان کی مجلس کے مطربوں میں محمد شاہ چنگی چنگ بجاتا، فتوحا، فقاعی کی بیٹی اور نصرت خاتون گانا گاتیں ان کی کم عمری اور نسوانی آواز سے پرندے ہوا میں سے نیچے اتر آتے۔ سننے والوں کے ہوش اڑ جاتے۔ دل تڑپنے لگتے.....'' جلال الدین کو اس کے بھتیجے علاؤ الدین نے حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے دھوکے سے قتل کیا۔ اس سلسلے میں تاریخ فیروز شاہی کا مصنف لکھتا ہے ''اپنے ولی نعمت کا خون بہانے کی نحوست کی وجہ سے اس (علاؤ الدین) نے بے گناہوں کا اتنا خون بہایا کہ فرعون نے بھی نہ بہایا تھا'' واقعی علاؤ الدین کا انجام اس کی بدکرداریوں کی وجہ سے بہت عبرتناک ہوا۔

> اس بادشاہ کو اکبر کی طرح ایک نیا دین ایجاد کرنے کا خیال بھی آیا تھا حالانکہ دوسری طرف وہ دین میں فتنہ کے خلاف تھا۔ اس کے دور میں ایک فرقہ ''اباحتی'' نام سے ابھرا جو ممنوعات و محرمات کو ناجائز نہیں سمجھتا تھا اور ماں بہن سے تعلق کو روا خیال کرتا تھا۔ سیاست اور حکومت کے معاملے میں سلطان کسی شرعی قید یا حد کا قائل نہ تھا۔ مورخ اس سلسلے میں اس کو ایک سنگدل اور ظالم حکمران کہتا ہے۔ جب اس فوج کے تین ہزار نومسلموں نے بعض شکایات کی بنا پر بغاوت کی، تو نہ صرف ان باغیوں کو (جو فرار ہو گئے تھے) چن چن کر قتل کیا بلکہ ان کی عورتوں کو بھی رسوا اور بے آبرو کیا گیا، بچوں کو ماؤں کے سامنے چیر کر پھینک دیا گیا۔

علاؤ الدین خلجی نے انتہائے تکبر میں اپنا خطاب اسکندر ثانی رکھا۔ اس نے محض جبر کے زور پر ضروری اشیا کی قیمتوں کو بڑھنے سے روکے رکھا۔ ابتدائی چند سالوں میں بہت عیاشیاں کیں اپنے حرم کو ہندوستان کے طول و عرض کی خوبصورت عورتوں سے بھر لیا، یہاں تک کہ ہر سال اس کے تین چار بیٹے پیدا ہوتے تھے۔ ذاتی کردار میں تضادات تھے، ملک نائب کی محبت میں سلطان اندھا بنا رہا۔ یہ شخص سلطان کا مفعول تھا۔ مصنف تاریخ فیروز شاہی نے اس شخص کے بارے میں ''پیش بریدہ پس دریدہ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جن کے ترجمے کی ضرورت نہیں۔

اس بادشاہ کو اکبر کی طرح ایک نیا دین ایجاد کرنے کا خیال بھی آیا تھا حالانکہ دوسری طرف وہ دین میں فتنہ کے خلاف تھا۔ اس کے دور میں ایک فرقہ ''اباحتی'' نام سے ابھرا جو ممنوعات و محرمات کو ناجائز نہیں سمجھتا تھا اور ماں بہن سے تعلق کو روا خیال کرتا تھا۔ سیاست اور حکومت کے معاملے میں سلطان کسی شرعی قید یا حد کا قائل نہ تھا۔ مورخ اس سلسلے میں اس کو ایک سنگدل اور ظالم حکمران کہتا ہے۔ جب اس کی فوج کے تین ہزار نومسلموں نے بعض شکایات کی بنا پر بغاوت کی، تو نہ صرف ان باغیوں کو (جو فرار ہو گئے تھے) چن چن کر قتل کیا بلکہ ان کی عورتوں کو بھی رسوا اور بے آبرو کیا گیا، بچوں کو ماؤں کے سامنے چیر کر پھینک دیا گیا۔

اس نے گھر گھر جاسوس بھیجے، امرا کو ایک دوسرے کے گھر جانے اور ملنے سے منع کر دیا۔ زبان کھولنا جرم ٹھہرا جس کی شدید سزا دی جاتی۔ عجیب و غریب

سزائیں ایجاد کیں، زنا کی سزا کے لیے مردانہ خصوصیت سے محروم کر دیا جاتا۔ اس کے ظلم وستم دیکھ کر علما، فقہا نے سچ بات کہنا ترک کیا اور وہ بادشاہ کی مرضی کے مطابق تاویلیں کرتے۔ اسی بادشاہ کے دور میں حضرت نظام الدین اولیاؒ، امیر خسروؒ اور حضرت رکن الدینؒ جیسے بزرگ ہوئے۔ ایک دنیا حضرت نظام الدین اولیاؒ کے دروازے پر جمع رہتی، لیکن بادشاہ کو کبھی جانے اور ملنے کی توفیق نہ ہوئی۔ محض گمان کی بنا پر بے گناہ لوگوں کو قتل کر دینا اس کا وتیرہ تھا۔ ''مختلف قسم کے نشوں کی وجہ سے جو غصہ اس پر سوار رہتا اس کے سبب کسی کی مجال نہ ہوتی کہ کسی مجبور اور ضرورت مند کی عرضی اس کی خدمت میں پیش کر سکے۔ اپنی انتہائے جہالت کی بنا پر احکام ومصالح حکومت کو شریعت سے بالکل الگ سمجھتا۔ نماز روزہ کے متعلق اس کو کچھ علم نہ تھا۔ اس کے مرنے کے بعد کئی ہزار قیدی اور جلا وطن لوگوں نے رہائی پائی'' (تاریخ فیروز شاہی)۔ علاؤ الدین خلجی نے بیس سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ اس کے زمانے میں لوگ ظلم و جور کی چکی میں پستے اور آہ تک نہ کر سکتے تھے۔ اسلام کو بادشاہ کے کسی اقدام سے فائدہ نہ پہنچا۔ وہ کافور ہزار دیناری نامی ایک شخص کے عشق میں دنیا اور آخرت برباد کرتا رہا۔ اسے ملک نائب (وزیر) مقرر کیا۔ کہتے ہیں کہ جب بادشاہ سخت بیمار ہوا تو اسی ملک نائب نے اس کا کام تمام کیا۔ سلطان علاؤ الدین کے مرنے کے بعد مکافات کا پہیہ حرکت میں آیا۔ اسی ملک نائب نے جس کا سلطان عمر بھر دیوانہ رہا بادشاہ کے خاندان کے افراد کو چن چن کر مارا۔ سلطان کی بیوہ کو قید میں ڈالا۔ اس کے بیٹوں کی آنکھیں نکالیں، بعض کو قتل کر دیا۔ اس سلسلے میں ضیاء الدین برنی نے یہ واقعہ نقل کیا ہے: ''ان دنوں میں جب کہ سلطان علاؤ الدین کے بیٹوں کو قتل اور اندھا کیا جا رہا تھا اور ان کے خاندان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ ایک دوست نے شیخ بشیر دیوانہ سے جو صاحب کشف و کرامات تھے، دریافت کیا کہ علائی خاندان کے لوگ کیوں تباہ ہو رہے ہیں اور پستی میں گر رہے ہیں؟ شیخ بشیر دیوانہ (مجذوب) نے جواب دیا کہ علاؤ الدین کی بادشاہت کی بنیاد نہ تھی جو تخت اور حکومت اس طریقے سے حاصل کی جاتی ہے جیسے اس نے حاصل کی تھی وہ اسی طرح برباد ہو کے رہتی ہے.....''

ایک ایسا حکمران جسے پیغمبری کا دعویٰ کرنے کا خیال سوجھا ہو، نیا دین ایجاد کرنے چلا ہو، ساتھ ہی علم سے بے بہرہ ہو، دینی علوم سے ناواقف ہو، قتل ہمیشہ روا رکھتا ہو، چچا کو قتل کر کے بادشاہ بنا ہو، قوم لوط کے فعل میں غرق رہا ہو۔ اس کا انجام ایسا ہی ہونا تھا!

علاؤ الدین کے بعد تھوڑا عرصہ اتھل پتھل رہی، بالآخر قسمت کی دیوی سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی پر مہربان ہوئی۔ اس نے ایک ایک کر کے پہلے اپنے سب بھائی قتل کرائے۔ قطب الدین، سفا کی اور فسق میں علاؤ الدین سے بھی چند قدم آگے تھا۔ برصغیر میں اسلام کو اس کی وجہ سے بڑا شدید نقصان پہنچا کہ وہ کٹر ہندو نواز تھا۔ ایک نوجوان امیر خسرو ملک سے اس کے تعلق کے چرچے اکناف عالم میں پھیلے۔ ابن بطوطہ یہ گواہی دیتے ہیں: ''خسرو ملک دراصل ہندو تھا اور ہندوؤں کی بہت جانبداری کرتا تھا۔'' تاریخ فیروز شاہی کا مصنف کہتا ہے: ''خسرو ملک (خسرو خان) کا تعلق

ایک ادنیٰ قبیلے ''پرواز'' سے تھا۔ قطب الدین اس کا دیوانہ ہو گیا اور اس کو بہت مرتبے عطا کیے بلکہ اپنی ہوس پرستی کی وجہ سے وزارت کا عہدہ بھی اس کے حوالے کر دیا'' (تاریخ فیروز شاہی) اس بادشاہ کو اللہ والوں، خاص طور پر حضرت نظام الدین اولیاؒ سے عداوت تھی۔

تاریخ فرشتہ کا مصنف رقمطراز ہے: ''قطب الدین مبارک شاہ کی بری حرکتیں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ وہ اکثر اوقات عورتوں کی طرح زیور پہن لیتا تھا اور اسی عالم میں مجمع میں آ کر لوگوں سے بات چیت کرتا تھا۔ بادشاہ کے محل میں بازاری اور گھٹیا عورتیں ہر وقت جمع رہتیں اور بادشاہ کے اشارے سے نامی گرامی اور ممتاز امرا سے مذاق کر کے ان کی توہین کرتی تھیں۔''

تاریخ فرشتہ کا مصنف رقمطراز ہے: ''قطب الدین مبارک شاہ کی بری حرکتیں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ وہ اکثر اوقات عورتوں کی طرح زیور پہن لیتا تھا اور اسی عالم میں مجمع میں آ کر لوگوں سے بات چیت کرتا تھا۔ بادشاہ کے محل میں بازاری اور گھٹیا عورتیں ہر وقت جمع رہتیں اور بادشاہ کے اشارے سے نامی گرامی اور ممتاز امرا سے مذاق کر کے ان کی توہین کرتی تھیں۔''

اس نے اپنے کئی وفادار امرا کو خسرو خان کے کہنے پر قتل کرایا۔ اس کے دور میں مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں۔ خسرو خان اس کے دربار میں زنانہ کپڑے پہن کر آتا اور بادشاہ بہت خوش ہوتا۔ قاضی ضیاء الدین اور دیگر مخلص افراد کے انتباہ کے باوجود بادشاہ نے خسرو خان کے ساتھ وابستگی اور خلوت وجلوت کا یہ تعلق جاری رکھا۔ آخر اسی خسرو خان نے اسے غداری سے قتل کیا۔ خسرو خان نے بادشاہ کو شیشے میں اتار کر محل کے عقبی دروازے کی چابیاں حاصل کیں، ایک رات اپنے رشتہ داروں کو محل میں لایا جو سب مسلح تھے، خسرو خان نے خود بادشاہ کو قابو کیا اور اسے مار ڈالا۔ تاریخ فیروز شاہی کا مصنف لکھتا ہے: ''یہ ولدالزنا کمینہ شخص (خسرو) ہر وقت سلطان کو ہلاک کرنے کے متعلق سوچتا رہتا۔ ظاہر میں تو وہ ایک بدکار اور بے شرم عورت کی طرح اپنا جسم اس کے حوالے کر دیتا، لیکن باطن میں وہ سلطان کی زیادتی پر غصہ کرتا اور خون کے گھونٹ پیتا رہتا تھا۔'' بادشاہ نے نماز ترک کر دی، ماہ رمضان میں علانیہ کھاتا پیتا، اس کے دربار میں ایک کمین بھانڈ امرا کو ماں اور بیوی کی گالیاں دیتا اور اکثر بلند مرتبہ شرفا کے کپڑوں پر ننگا ہو کر پیشاب کر دیتا اور بعض اوقات بالکل برہنہ دربار میں آجاتا اور فحش بکتا تھا۔ بادشاہ اس سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ پھر جو ہوا سو ہوا۔ بادشاہ کے قتل کے بعد خسرو خان اور اس کے ہندو رشتہ دار سلطانی حرم میں جا گھسے۔ سلطان کی ایک بیوی کی بے حرمتی کی اور بعد میں اُسے قتل کر دیا۔ پھر خاندان کے دوسرے افراد کو تہ تیغ کیا۔ خسرو خان نے تخت نشین ہوتے ہی محل میں بت پرستی شروع کر دی۔ قطب الدین کی بیوی کو اپنے حرم میں ڈال لیا۔ خاص خاص مسلمان امراء کے خاندانوں پر قبضہ کیا اور مسلمان عورتوں اور کنیزوں سے

خسرو اور ہندو پروار رشتے دار متمتع ہونے لگے۔ ''ہندو اور پروار لوگ جن کا غلبہ ہو چکا تھا قرآن مجید کے نسخوں کو کرسیوں کے طور پر استعمال کرنے لگے، محرابوں میں بت رکھ کر ان کی پوجا کرنے لگے۔'' (تاریخ فیروز شاہی)

جب ہندوستان میں گائے ذبح کرنا ممنوع ٹھہرا

خسرو خان کے بارے میں ابن بطوطہ نے اپنے سیاحت نامہ میں لکھا ہے کہ وہ ایک ایسا نو مسلم تھا جو بعد میں مرتد ہو گیا، تاہم علانیہ اس نے کبھی دوبارہ ہندو بننے کا اظہار نہ کیا۔ ابن بطوطہ لکھتے ہیں: ''جب خسرو خان بادشاہ ہوا، تو اس نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں سے نوازا اور حکم دیا کہ تمام ملک میں کوئی شخص گائے ذبح نہ کرے۔'' تاریخ فیروز شاہی کا مصنف لکھتا ہے کہ '' اس گمراہی اور بربادی کے زمانے میں جب ہندوؤں کے غلبے سے کفر کا رواج بڑھ گیا تھا اور مملکت کے تمام علاقوں میں ہندو اعلیٰ مناصب پر فائز تھے، وہ خوشیاں مناتے اور خواب دیکھتے تھے کہ دہلی پھر ہندوؤں کی ہو جائے گی اور مسلمان کمزور بلکہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔'' خسرو خان نے یہ تصور کر لیا تھا کہ اگر خزانہ پانی کی طرح بہایا جائے، تو ہر شخص کو خریدا جا سکتا ہے اور واقعی اس نے بہت سے مسلمان امرا کو دولت اور رشوت کے بل بوتے پر اپنا ہمنوا بنایا لیکن ایک چھوٹا گروہ اس کی حرکات پر ناخوش تھا۔ آخری سلطان قطب الدین کے ایک امیر غازی ملک نے بغاوت کی ابتدا اور راہنمائی کی، خسرو خان کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اسے گرفتار کر کے ٹھیک اس جگہ لے جا کر (شاہی محل میں) قتل کیا جہاں اس نے اپنے محسن بادشاہ کو قتل کیا تھا۔ قتل کے بعد اس کا سر محل کی چھت سے نیچے پھینک دیا گیا۔ یہ غازی ملک تغلق تھا۔ اس نے غیاث الدین تغلق کے نام سے حکومت کی۔ مسلمانوں کے لیے یہ مختصر مگر بھلائی کا دور تھا۔ جن لوگوں نے سلطان قطب الدین کی بیوی کا نکاح غیر شرعی انداز میں خسرو خان سے کیا تھا غیاث الدینؒ نے انھیں سخت سزائیں دیں۔

کہا جاتا ہے کہ جونا خان نے افغان پور کے پاس ایک نیا محل صرف تین دن کے عرصے میں تیار کروایا اور اپنے والد (بادشاہ) کو وہاں کھانے کی دعوت دی۔ کھانا کھانے کے بعد جونا خان محل سے باہر نکلا جب کہ بادشاہ اور مصاحبین وہاں موجود رہے۔ جونا خان کے باہر نکلتے ہی محل گر گیا اور بادشاہ مصاحبین سمیت دب کر مر گیا۔ ایک مورخ کے مطابق بجلی کے اچانک گرنے سے محل زمین بوس ہوا تھا۔ ابن بطوطہ کا خیال ہے کہ جونا خان نے بادشاہ کو ہلاک کیا اور جب محل گرا، تو اس نے لوگوں سے کہا کہ ملبہ ہٹانے میں تاخیر کی جائے تاکہ بادشاہ کے ہلاک ہونے کا پورا یقین ہو جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب ملبہ ہٹایا گیا، تو بادشاہ زندہ تھا لیکن جونا خان کے اشارے پر اس کا کام تمام کر دیا گیا۔

بعض تواریخ میں غیاث الدین تغلق کی حادثاتی موت کا ذمہ دار اس کے بیٹے جونا خان کو ٹھہرایا جاتا ہے جو بعد میں محمد شاہ تغلق کے خطاب سے بادشاہ بنا۔ کہا جاتا ہے کہ جونا خان نے افغان پور کے پاس ایک نیا محل صرف تین دن کے عرصے میں تیار کروایا اور اپنے والد (بادشاہ) کو وہاں کھانے کی دعوت دی۔ کھانا کھانے کے بعد جونا خان محل سے باہر نکلا جب کہ بادشاہ اور مصاحبین وہاں موجود رہے۔ جونا خان کے باہر نکلتے ہی محل گر گیا اور بادشاہ مصاحبین سمیت دب کر مر گیا۔ ایک مورخ کے مطابق بجلی کے اچانک گرنے سے محل زمین بوس ہوا تھا۔ ابن بطوطہ کا خیال ہے کہ جونا خان نے بادشاہ کو ہلاک کیا اور جب محل گرا، تو اس نے لوگوں سے کہا کہ ملبہ ہٹانے میں تاخیر کی جائے تاکہ بادشاہ کے ہلاک ہونے کا پورا یقین ہو جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب ملبہ ہٹایا گیا، تو بادشاہ زندہ تھا لیکن جونا خان کے اشارے پر اس کا کام تمام کر دیا گیا۔

محل صرف تین دن کے عرصے میں تیار کروایا اور اپنے والد (بادشاہ) کو وہاں کھانے کی دعوت دی۔ کھانا کھانے کے بعد جونا خان محل سے باہر نکلا جب کہ بادشاہ اور مصاحبین وہاں موجود رہے۔ جونا خان کے باہر نکلتے ہی محل گر گیا اور بادشاہ مصاحبین سمیت دب کر مر گیا۔ ایک مورخ کے مطابق بجلی کے اچانک گرنے سے محل زمین بوس ہوا تھا۔ ابن بطوطہ کا خیال ہے کہ جونا خان نے بادشاہ کو ہلاک کیا اور اپنے والد (بادشاہ) کو وہاں کھانے کی دعوت دی۔ کھانا کھانے کے بعد جونا خان محل سے باہر نکلا جب کہ بادشاہ اور مصاحبین وہاں موجود رہے۔ جونا خان کے باہر نکلتے ہی محل گر گیا اور بادشاہ مصاحبین سمیت دب کر مر گیا۔ ایک مورخ کے مطابق بجلی کے اچانک گرنے سے محل زمین بوس ہوا تھا۔ ابن بطوطہ کا خیال ہے کہ جونا خان نے بادشاہ کو ہلاک کیا اور جب محل گرا، تو اس نے لوگوں سے کہا کہ ملبہ ہٹانے میں تاخیر کی جائے تاکہ بادشاہ کے ہلاک ہونے کا پورا یقین ہو جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب ملبہ ہٹایا گیا، تو بادشاہ زندہ تھا لیکن جونا خان کے اشارے پر اس کا کام تمام کر دیا گیا۔

ہندوستان کی بادشاہی ہمیشہ بے وفا رہی ہے۔ بیٹے سے باپ اور باپ سے بیٹے قتل کرواتی رہی۔ غیاث الدین تغلق کو اپنی تمام اچھائیوں کے باوجود سونے اور چاندی سے عشق تھا۔ اس نے ایک ایسا محل تیار کروایا تھا کہ اس کی اینٹوں پر سونے کے پترے چڑھے تھے، جب سورج طلوع ہوتا، تو اس محل کی طرف کوئی شخص نظر نہیں جما سکتا تھا۔ محل میں ایک بڑا حوض بنایا گیا تھا جس میں سونا پگھلا کر بھر دیا گیا تھا۔ محمد شاہ تغلق کی بعض خوبیوں کو اس شقاوت اور خونخواری نے گہنا دیا تھا۔ ایک طرف نمازی پرہیزگار اور دوسری طرف بات بات پر انسانوں کا قتل ناحق۔ یہ کس قسم کی دینداری تھی؟ ایک روز اُس نے نو آدمی محض اس بات پر قتل کر دیے کہ انھوں نے جماعت کے ساتھ نماز ادا نہیں کی تھی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے: ''ایسا کبھی شاذ و نادر ہوتا تھا کہ اس کے دروازے پر کوئی شخص قتل نہ کیا جاتا۔ اکثر لاشیں دروازے پر پڑی رہتیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں محل کی طرف جا رہا تھا، میرا گھوڑا ایک سفید سی چیز دیکھ کر بدکا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ میرے ساتھی نے کہا یہ ایک شخص کا سینہ ہے جس کے تین ٹکڑے کیے گئے ہیں۔ یہ بادشاہ چھوٹے بڑے جرم پر برابر سزا دیتا تھا۔ نہ اہل علم کا لحاظ کرتا نہ شرفا کا اور نہ صالحین کا۔''

حضرت شیخ شہاب الدین خراسانی ایک نیک بزرگ اور عالم دین تھے۔ بادشاہ نے انھیں نجی خدمت کے لیے بلایا۔ انھوں نے انکار کیا، تو ان کی ڈاڑھی نوچی گئی اور قید میں ڈال دیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ اپنے اس قول کو واپس لیں کہ بادشاہ ظالم ہے۔ شیخ نے انکار کیا اور کہا کہ میں شہیدوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے کھانا بھجوایا انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ انھیں گوبر کھلایا جائے اور اس کام پر ہندوؤں کو مامور کیا۔ انھوں نے زبردستی اس نیک مرد کو گوبر کھلایا۔ اس کے بعد اُن کا سر قلم کر دیا گیا۔ شیخ صالح شمس الدین ایک تارکِ دنیا زاہد تھے، ایک بار ان کی محفل میں کسی امیر کا ذکر آیا کہ وہ بادشاہی کے لائق ہے۔ کسی طرح بادشاہ کو خبر پہنچی، تو بادشاہ نے شیخ صالح اور ان کے بیٹوں کو قتل کروا دیا۔ یہی سلوک شیخ علی حیدر جیسے ولی اللہ کے ساتھ کیا گیا۔ روایت ہے کہ بادشاہ کے ظلم و ستم سے اکتائے ہوئے عوام رقعے لکھ کر لفافے پر لکھتے ''بادشاہ کے سر کی قسم کہ بادشاہ کے سوا ان کو کوئی نہ کھولے۔'' اور یہ خط رات کو دیوان خانے میں ڈال جاتے۔ بادشاہ ان خطوں کو کھولتا، تو ان میں گالیاں درج ہوتیں۔ مورخ لکھتے ہیں کہ سزا دینے کے لیے بادشاہ نے تمام دہلی والوں

کو بے گھر کیا اور حکم دیا کہ نئے آباد کردہ شہر دولت آباد چلے جائیں جو وہاں سے کوسوں دور تھا۔ ابن بطوطہ لکھتے ہیں کہ ''لوگوں نے دولت آباد جانے سے انکار کیا، تو منادی کرادی گئی کہ تین دن کے بعد کوئی شخص نہ رہے۔ بہت سے لوگ چل پڑے اور بعض گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ پورے شہر کی تلاشی لی جائے۔ دو آدمی ایک گلی میں ملے ایک اندھا اور دوسرا لولا۔ دونوں کو بادشاہ کے پاس لایا گیا۔ بادشاہ نے لولے کو منجنیق سے اڑا دیا اور اندھے کے لیے حکم دیا کہ اسے دہلی سے دولت آباد تک جو چالیس دن کا راستہ ہے گھسیٹ کر لے جائیں۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔

بادشاہ نے اپنے بھانجے بہاؤ الدین گشتاسپ کو سرکشی کے الزام میں یہ سزا دی کہ اس کی زندہ کھال کھنچوائی، اس کا گوشت چاولوں میں پکوا کر اس کے بیوی بچوں کو کھانے کے لیے بھیجا گیا۔ خاندان کے محسن اور اپنے منہ بولے چچا حاکم ملتان کشلو خان کا بغاوت کی سزا میں سر کاٹ کر شہر کے دروازے پر لٹکایا اور شہر کے قاضی کریم الدین کی زندہ کھال کھنچوائی۔

محمد شاہ تغلق نے اذیتیں اور سزائیں دینے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کیے۔ اس نے جلاد ہاتھی تیار کیے اور انھیں مجرموں کو کچلنے کی خاص تربیت دی گئی تھی۔ جلاد ہاتھیوں کے دانتوں پر دندانے دار آہنی خول چڑھے ہوتے تھے جن کے دونوں طرف دھار ہوتی۔ جب کسی شخص کو ہاتھی کے سامنے سزا کے لیے لایا جاتا، تو ہاتھی اسے سونڈ میں لپیٹ کر اوپر پھینکتا اس کے بعد اسے دانتوں میں لے لیتا۔ اگر بادشاہ چاہتا، تو اسے قاتل دانتوں سے چیر دیا جاتا ورنہ ہاتھی اپنے پاؤں سے کچل ڈالتا۔ اکثر بچاروں کی لاشیں کتوں کے سامنے ڈال دی جاتیں۔

محمد شاہ تغلق نے اذیتیں اور سزائیں دینے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کیے۔ اس نے جلاد ہاتھی تیار کیے اور انھیں مجرموں کو کچلنے کی خاص تربیت دی گئی تھی۔ جلاد ہاتھیوں کے دانتوں پر دندانے دار آہنی خول چڑھے ہوتے تھے جن کے دونوں طرف دھار ہوتی۔ جب کسی شخص کو ہاتھی کے سامنے سزا کے لیے لایا جاتا، تو ہاتھی اسے سونڈ میں لپیٹ کر اوپر پھینکتا اس کے بعد اسے دانتوں میں لے لیتا۔ اگر بادشاہ چاہتا، تو اسے قاتل دانتوں سے چیر دیا جاتا ورنہ ہاتھی اپنے پاؤں سے کچل ڈالتا۔ اکثر بچاروں کی لاشیں کتوں کے سامنے ڈال دی جاتیں۔

محمد شاہ نے رعیت خصوصاً امراء کے حالات کی جاسوسی کا نظام قائم کر رکھا تھا۔ وہ گھروں میں کام کرنے والی لونڈیوں، بھنگنوں اور غلاموں سے جاسوسی کرواتا۔ ابن بطوطہ نے اس سلسلے میں ایک روایت لکھی ہے: ''کہتے ہیں کہ ایک امیر رات کے وقت اپنی بیوی کے ساتھ سویا ہوا تھا۔ امیر نے بیوی کے ساتھ قربت کا ارادہ ظاہر کیا، تو زوجہ نے بوجوہ اسے کہا تمھیں بادشاہ کے سر کی قسم، ایسا نہ کرو لیکن امیر نہ مانا۔ بادشاہ نے اگلے روز اس امیر کو اپنے سامنے طلب کیا اور اس سے کہا کہ تو نے ایسا ایسا کہا تھا۔ اس بات پر اُسے قتل کر دیا گیا۔'' محمد تغلق نے لوگوں سے

لگان کی وصولی میں بہت سختی کی، تنگ آ کر لوگوں نے اپنے کھلیانوں کو جلا دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ان تمام لوگوں کو قتل کر دیا جائے، چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔

تاریخ فرشتہ کا مصنف لکھتا ہے: ''کسی بادشاہ کے حالات میں ایسے واقعات نہ دیکھے گئے تھے۔ اس کا اعمالنامہ سیاہ ہے۔ بادشاہ شکار کھیلنے جاتا تھا مگر جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے بجائے ہزاروں انسانوں کے خون سے تیر و خنجر کی پیاس بجھاتا اور پھر ان مقتولوں کے سر کاٹ کر حصار کے کنگرہ پر لٹکاتا۔''

تاریخ فیروز شاہی کے مصنف نے حیرت و استعجاب کے ساتھ لکھا ہے کہ ایک طرف محمد شاہ تغلق انہی صفات کے حامل لوگوں اور سفلوں کے خلاف باتیں کہتا تھا دوسری طرف اس نے اپنے ہاں انہی صفات کے حامل لوگوں کو اونچے اونچے مرتبے دیے۔ نجبا ایک گویا تھا اسے اتنا نوازا کہ ملتان، گجرات اور بدایوں کے صوبے عطا کیے۔ اسی طرح عزیز خمار کو، اس کے بھائی کو، فیروز حجام کو، منکا طباخ کو اور لدھا نامی مالی کو بہت اعلیٰ عہدے دیے۔ علیم الدین نامی ایک شخص کے زیر اثر جو فلسفے کا عالم تھا، بادشاہ اہل سنت والجماعت کے عقیدے کی بہت سی باتوں بلکہ بعض احادیث کی خلاف ورزی کرنے لگا۔ اسی وجہ سے قتل جیسے ناقابل معافی فعل کو اپنے لیے جائز سمجھتا تھا۔ تاریخ فرشتہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے ایک دن حکم دیا کہ نماز عیدین اور نماز جمعہ آئندہ سے ادا نہیں کی جائیں گی۔ اس پر بادشاہ کے خلاف مسلمانوں میں مزید نفرت پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس بادشاہ نے ہندوستان میں مسلمانوں کے قبرستانوں کی آبادی میں بے پناہ اضافہ کیا۔ دہلی کے ہزاروں افراد کو نقل مکانی اور سفر کی صعوبتوں میں ہلاک کر دیا۔ دوسری طرف مذہبی معاملات میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی اور اسلام کے وقار کو شدید نقصان پہنچایا۔

محمد شاہ کے بعد فیروز شاہ تغلق نے ہندوستان کی حکومت سنبھالی۔ اس کا دور بہت اچھا تھا۔ بادشاہ کا انداز حکومت بہرحال سیکولر رہا۔ ان کے جانشین غیاث الدین تغلق کو جہاں بانی سے خاص رغبت نہ تھی۔ تاریخ فرشتہ میں ہے: ''تغلق شاہ جوانی کے نشہ میں مست عیش و نشاط میں وقت گزارنے لگا۔ عدل و انصاف سے بالکل الگ تھلگ ہو گیا اور ملک میں استبداد پھیل گیا۔'' آٹھویں صدی ہجری کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا۔ تیمور نے انہی دنوں ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا سوچنا شروع کر دیا تھا اور بالآخر 800ھ میں دہلی پر قبضہ کیا۔ دورِ تغلق شاہ سے لے کر حملہ تیمور تک دس سالوں میں ہندوستان مستقل طوائف الملوکی کی زد میں رہا۔ اس دوران کوئی چھ بادشاہ آئے اور گئے، بلکہ زیادہ تر قتل ہوئے۔ بغاوتیں عام پھیل گئیں، لوگوں کا سکون لٹ گیا، مکینوں نے آبادیاں چھوڑ کر ویرانوں کا رخ کر لیا۔ بادشاہوں کو لوگوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے مفاد سے معمولی سی دلچسپی بھی نہ تھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب پندرہ دن تخت دہلی خالی پڑا رہا۔ بقول فرشتہ ''دہلی میں مختلف ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ایک طرح کا انقلاب آچکا تھا، سلطنت کی مضبوطی اور طاقت ختم ہو رہی تھی، ملک میں چاروں طرف بغاوت و سرکشی کی آگ پھیل رہی تھی، ہندو ہر طرف سوئے ہوئے فتنوں کو بیدار کرنے میں مصروف تھے، خصوصاً مشرقی ہندوؤں نے خوب فتنہ پردازی شروع کر دی تھی۔''

ملکی مفاد کا قابلِ قدر منصوبہ اندھے کنویں میں

کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا خواب

آج تک کیوں شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا؟

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی درازیٔ عمر اور حفاظت کے لیے تربیلا ڈیم بنایا جانا تھا

عبدالسّلام عارف

خیبر پختونخواہ حکومت تربیلا ڈیم سے پیدا کردہ بجلی کا منافع (رائلٹی) لینے کی خاطر وفاقی حکومت پر دباؤ بڑھاتی رہتی ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اسے اے۔جی۔این قاضی فارمولے کے مطابق 11 فیصد اضافے کے ساتھ یہ منافع ہر سال ادا کیا جائے۔ چند سال قبل خیبر پختونخواہ کے وزرا نے کچھ زیادہ ہی جارحانہ رویہ اپنالیا تھا۔ ان کے وزیر زراعت نے حکومت پنجاب کو دھمکی بھی دی کہ اگر ضرورت کے مطابق گندم نہ فراہم کی گئی تو وہ زبردستی لے جائیں گے۔

انھیں علم نہیں تھا کہ آبپاشی کے لیے مطلوبہ مقدار میں پانی دستیاب ہوگا تو وافر گندم پیدا ہوگی۔ لیکن جب

پانی ذخیرہ کرنے کے لیے کالا باغ ڈیم تعمیر کرنے کی بات کریں، تو ان کے بھائی بند اسے بم مار کر اڑا دینے کی دھمکی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ کالا باغ ڈیم ''سندھ طاس'' معاہدہ کے تحت سب سے پہلے تعمیر ہونا تھا۔ پھر اس کی حفاظت اور درازیٔ عمر کے لیے تربیلا ڈیم تعمیر کیا جاتا۔

1960ء میں مقتدرہ قوتوں اور عالمی بینک کے اشتراک وتعاون سے بھارت و پاکستان کی حکومتوں کے مابین ''سندھ طاس'' معاہدہ طے پایا۔ پاکستان کی جانب سے صدر ایوب خان، بھارت کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو اور عالمی بینک کے صدر یوجین بلیک نے معاہدے پر دستخط کیے۔ منصوبے کے تحت 3 مشرقی دریاؤں ستلج، بیاس اور راوی کا پانی بھارت کو ملا جب کہ تین مغربی دریاؤں چناب، جہلم اور سندھ کا پانی پاکستان کے حصے میں آیا۔ یوں اس معاہدے کی بدولت پاکستان کے پانچ دریاؤں میں سے تین دریاؤں کا کلی کنٹرول بھارت کے قبضے میں چلا گیا۔ بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جن 5 دریاؤں کی بدولت پنجاب، ''پنج آب'' کہلاتا ہے، اس صوبے کے باسیوں سے پوچھے بغیر 3 دریاؤں کا پانی غیروں کو سونپ دیا گیا۔ گویا معاہدے سے مکمل طور پر صوبہ پنجاب متاثر ہوا۔ اس لیے تو بھارت کو پابند کیا گیا کہ وہ پاکستان کا یہ نقصان پورا کرے وہ اسی سلسلے میں متبادل تعمیراتی اخراجات میں عالمی بینک اور دیگر مالیاتی اداروں کی مالی معاونت کرتا رہا۔

سندھ طاس معاہدہ کے تحت 2 بڑے ڈیم (کالا باغ، منگلا) 5 بیراج، ایک سائفن اور 8 رابطہ نہریں تعمیر ہونا تھیں۔ ان نہروں کے ذریعے اس علاقے کو آبپاشی اور پینے کے لیے پانی فراہم کیا جانا تھا جو مشرقی دریاؤں کے پانی سے سیراب ہوتا تھا (اور جن کا کنٹرول اب بھارت کے پاس چلا گیا)۔

اس منصوبے کی تعمیر و تکمیل کی ذمہ داریاں واپڈا کے سپرد کی گئیں جس نے تقریباً ایک دہائی میں سندھ طاس معاہدے کے 16 اجزا (Components) مکمل کر لیے، ماسوائے تربیلا ڈیم کے جو 1974ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ سب سے پہلے کالا باغ ڈیم تعمیر ہونا تھا لیکن صدر ایوب خان کے گرد جمع کوتاہ نظر مفاد پرستوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے علاقے کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کے لیے تربیلا ڈیم کی تعمیر کو ترجیح دیں۔ کالا باغ ڈیم ان کے آبائی وسکونتی علاقے سے 100 میل نیچے تعمیر ہونا تھا۔

وہ لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئے اور قومی مفاد کے بجائے علاقائی مفاد کے پیش نظر کالا باغ معرض التوا میں ڈال کر تربیلا ڈیم کی تعمیر کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اتنی عجلت میں ہوا کہ منصوبے کے بنیادی تقاضے بھی پورے نہ کیے جا سکے، جنھیں اصولی طور پر پورا کرنے کے لیے تقریباً 8 برس کا عرصہ درکار تھا۔ چناں چہ تربیلا ڈیم کے منصوبے کی تعمیر میں کئی فنی اور تکنیکی نقائص رہ گئے۔ اس کے متعلق ملکی اور غیر ملکی فنی ماہرین نے حکومت پاکستان کو خبردار کر دیا تھا۔ بلکہ انھی خدشات کے پیش نظر عالمی بینک اور دیگر مالیاتی اداروں نے تربیلا ڈیم کی تعمیر کے لیے فنڈز فراہم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تب صدر ایوب نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنایا اور کالا باغ ڈیم کے لیے مختص سرمایہ تربیلا ڈیم کی تعمیر پر خرچ کر دیا۔

فنی ماہرین کے خدشات بعدازاں 100 فیصد درست ثابت ہوئے۔ 1974ء ہی میں تربیلا ڈیم کی

ایک سرنگ میں ٹوٹ پھوٹ نے ماہرین کو مجبور کردیا کہ وہ فوراً ڈیم خالی کردیں۔ اگر سرنگ پانی سے لبالب بھری ہوتی تو تربیلا سے کراچی تک ملک کو شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔

طویل عرصہ تک اس ڈیم میں کسی نہ کسی فنی خرابی کے حوالے سے اخبارات میں خبریں شائع ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ وہاں پر کام کرنے والے ایک غیر ملکی انجینئر نے فنی خرابیوں سے دل برداشتہ ہوکر خودکشی بھی کرلی۔ طویل عرصے بعد واپڈا کی کاوشوں اور پاکستانی انجینئروں کی شب روز محنت سے بعض نقائص پر قابو پایا جاسکا۔

جب کالا باغ ڈیم کی تعمیر معرض التوا میں ڈالی گئی تو محب وطن فنی ماہرین نے احتجاج کیا۔ حکومتِ وقت نے لوگوں کو حوصلہ دیا کہ تربیلا ڈیم کی تعمیر سے ہمارے انجینئروں کو قابل قدر تجربہ حاصل ہوا ہے، لہٰذا وہ آئندہ کسی غیر ملکی فنی راہنمائی کے بغیر کالا باغ ڈیم اور اس جیسے کئی دوسرے ڈیم تعمیر کرسکیں گے۔ مگر صدر ایوب کے دور میں یہ ممکن نہ ہوسکا۔ بھٹو کے دور حکومت میں پانی کی متوقع کمی کے پیش نظر کالا باغ ڈیم تعمیر کرنے کی ضرورت پھر شدت سے محسوس ہوئی۔ اس ڈیم کی تعمیر کو ملکی اور غیر ملکی ماہرین نے انتہائی مفید اور ضروری قرار دیا۔ کہا گیا کہ اگر تربیلا ڈیم میں ٹھہرے پانی کو کالا باغ ڈیم میں لایا جائے تو اس میں کم سے کم گاد (مٹی) جمع ہوگی۔ یوں ڈیم کی زندگی 100 برس سے بھی زیادہ طویل تر ہوجائے گی۔

یاد رہے کالا باغ ڈیم کے قابل عمل ہونے کی رپورٹیں تیار ہوچکی تھیں۔ اس کا ایک ماڈل ندی پور کے مقام پر سالہاسال سے عملی طور پر کام کر رہا تھا۔ جس مقام پر ڈیم تعمیر ہونا تھا، وہاں کارکنوں کی رہائش وغیرہ کے لیے کالونی بھی تعمیر ہوگئی۔ تعمیراتی مشینری بھی پہنچ چکی تھی۔ تب تک کوئی سیاسی جماعت بھی اس ڈیم کی تعمیر میں رکاوٹ نہیں بنی تھی کیونکہ عوام الناس کو یہی بتایا گیا کہ ڈیم کلی طور پر پانی ذخیرہ کرنے کے لیے بنایا جائے گا۔

مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب رپورٹوں نے عیاں کیا کہ کالا باغ کا بجلی گھر صوبہ پنجاب میں تعمیر ہوگا۔ چناں چہ اس کی بجلی کا منافع (رائلٹی) بھی پنجاب ہی کو ملنا تھا۔ لیکن صوبہ سرحد کی حکومت نے مطالبہ کیا کہ منافع اسے ملنا چاہیے۔ تب وزیراعظم بھٹو نے سیاسی مفاد کی خاطر یہ مطالبہ قبول کرلیا۔ حالانکہ تربیلا ڈیم کی بجلی کا منافع خیبر پختونخواہ اسی لیے لیتا ہے کہ ڈیم کا بجلی گھر اس کی زمین پر واقع ہے۔

کالا باغ کی پن بجلی کا منافع اصولاً پنجاب کو ملنا چاہیے تھا۔ اسی خدشے کے پیش نظر ملکی مفاد سامنے رکھنے کے بجائے صوبائی عصبیت کے حامل افراد ڈیم کی کھل کر مخالفت کرنے لگے اور یہ کہنا شروع کردیا کہ اس کی تعمیر سے علاقہ ''نوشہرہ'' پانی میں ڈوب جائے گا اور سندھ اور بلوچستان بنجر ہوجائیں گے (کوئی ان افراد سے پوچھے، نوشہرہ تو بالائی سمت واقع ہے۔ اسی طرح سندھ و بلوچستان کے مخالف افراد سے کوئی پوچھے کہ وہ بتائیں، تربیلا اور منگلا ڈیم کی تعمیر کے بعد انھیں کئی گنا اضافی پانی ملا تو پھر کالا باغ کی تعمیر سے ان کا پانی کم کیسے ہوگا؟)۔

بھارت نے صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ان مفاد پرستوں کی بھرپور مالی امداد کی کیونکہ وہ تو شروع ہی سے پاکستان کو پانی کی مار، مار کر اس کی زراعت تباہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے پاکستانی قوم کو ڈیم

کی تعمیر کے مسئلے میں الجھا کر وہ چناب اور جہلم کے دریاؤں پر بگلیہار اور ولر ڈیم تعمیر کرچکا جو وہ قانونی طور پر نہیں بنا سکتا تھا۔ حال ہی میں ''بھارت دوستی بخار'' کے موسم میں ہمارے ایک وزیر بگلیہار اور ولر ڈیم کا مسئلہ سلجھانے گئے، جنھیں بڑی محبت سے نہ صرف بہلا کر واپس بھیج دیا گیا بلکہ بھارتیوں نے ان دریاؤں پر کئی دوسرے ڈیموں کی بھی تعمیر شروع کردی۔

کالا باغ ڈیم تعمیر نہ ہونے سے وقت کے ساتھ ساتھ ملک آبپاشی اور آب نوشی کے مسائل کا شکار ہوا تو محب وطن لوگوں کے اصرار پر جنرل ضیاء الحق نے پھر منصوبے پر پیشرفت کرنا چاہی۔ تب صوبہ سرحد کے جرنیل گورنر نے جو سابق چیئرمین واپڈا فضل رازق کے بھائی بھی تھے، منصوبے میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اس پر صدر ضیاء الحق نے چوں تک نہیں کی۔ (اور یہ بات آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ ایسا کیونکر ہوا؟)

بقول سابق وزیراعظم ظفر اللہ جمالی، 1985ء میں چاروں صوبوں کے گورنر اور وزرائے اعلیٰ کالا باغ ڈیم بنانے پر متفق ہوگئے تھے۔ وہ اس مسئلہ کو کابینہ میں بھی لے گئے لیکن تب کے وزیراعظم محمد خان جونیجو (مرحوم) کو بعض وزرا نے گمراہ کردیا۔ لہٰذا انھوں نے ڈیم بنانے کی تجویز پھر مسترد کردی۔

سربراہان مملکت اپنی مرضی و منشا کے فیصلے کرتے وقت عوام الناس تو کیا اسمبلی اور سینٹ کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ جو ذاتی فیصلہ انھیں اپنے مفادات کے مطابق لگے، اس پر عمل درآمد کے لیے کمربستہ ہوجاتے ہیں۔ لیکن جب اتنے اہم ڈیم کی تعمیر کا معاملہ ہو جو ملکی بقا کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، تو وہ تمام لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی شرط لگا دیتے ہیں۔

پاکستان میں سبھی ڈیموں کی تعمیر کے اخراجات وفاقی حکومت نے کلی طور پر برداشت کیے۔ اس میں کسی صوبے کا عمل دخل شامل نہیں تھا۔ یہاں تک کہ یہ بجلی گھر یا ڈیم کسی فنی خرابی کا شکار ہوجائیں تو کوئی صوبہ انھیں ٹھیک کرانے کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتا۔ ان بجلی گھروں اور ڈیموں کی دیکھ بھال، توسیع و مرمت اور انھیں رواں دواں رکھنے کی تمام تر ذمہ داری واپڈا کے ذمہ ہے جو وفاقی حکومت کا ایک ادارہ ہے۔ ہاں! اگر صوبے اپنے وسائل سے ڈیم اور بجلی گھر تعمیر کرکے پیدا شدہ بجلی فروخت کرتے، تو یہ ان کا استحقاق تھا کہ وہ آمدن سے منافع حاصل کریں۔ اب جب سارا قرضہ وفاقی حکومت نے حاصل کیا، وہی اسے مع سود واپس کر رہی ہے اور تاحال ان بندوں اور بجلی گھروں کی دیکھ بھال اور انھیں چالو رکھنے کی ذمہ داری بھی ''واپڈا'' کے ذمہ ہے تو پھر صوبے کس بنیاد پر رائلٹی کا مطالبہ کرکے اسے سیاسی جبر سے منوا رہے ہیں؟

پیر پگاڑا کے بقول کالا باغ ڈیم جائز ہے یا ناجائز، یہ پیپلز پارٹی کا لے پالک ہے کیونکر 1973ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے اس کی تعمیر پر پیشرفت کی اجازت دی۔ 1983ء میں ان کی بیٹی وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے بھی اسے تعمیر کرنے کے احکامات جاری کیے۔ لیکن بھٹو کے داماد اور بے نظیر کے شوہر آصف زرداری کی حکومت نے پھر اس کی تعمیر کو التوا میں ڈال دیا۔ اب عدلیہ نے ڈیم کی تعمیر سے متعلق تمام تر پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد اس کی تعمیر کے احکامات جاری کیے ہیں۔ دیکھیے محب وطن لوگوں کی جیت ہوتی ہے یا ملک کا مفاد نہ چاہنے والے کامیاب ہوتے ہیں؟ اور یہ قابلِ قدر منصوبہ اندھے کنویں میں پڑا رہتا ہے۔

کیریئر کونسلنگ

علوم الارض

(Geo/Earth Sciences)

کے ماہر کیسے بنیں؟

جانیے ان خصوصیات کو جو آپ کو اس شعبے میں کامیابی دلا سکتی ہیں

یوسف الماس

علوم الارض (Geo Sciences)، کرہ ارض کے طبعی عوامل سے متعلق سائنسی علوم ہیں۔ ان علوم میں ارضیاتی سائنسدان زمین کے تمام طبعی پہلوؤں کا مطالعہ کرتے ہیں جیسے اس کی ساخت اور بناوٹ وغیرہ۔ وہ زمین کے ماضی اور حال کا مطالعہ ایسے جدید ترین آلات کے ذریعے کرتے ہیں جو انہیں چٹانوں، پانی اور زمین کے دیگر اجزا کی ترکیب کا تجزیہ کرنے میں بہترین مدد گار ثابت ہو۔ بہت سے ارضیاتی سائنسدان (Geo scientists) قدرتی وسائل جیسے زیرزمین پانی، دھاتوں اور پٹرولیم وغیرہ پر تحقیق کرتے ہیں۔ جبکہ کچھ کے کام کا میدان کرہ ارض کے ماحول کو سمجھنا، اس کو زمینی حیات کے قابل رہنے اور قابل بنانے پر محیط ہے۔ ارضیاتی سائنس آگے مزید دو بڑی شاخوں میں تقسیم ہوتی ہے جن کے تحت پھر دیگر علوم آتے ہیں:

1۔ علم طبقات الارض (Geology)

2۔ ارضی طبیعیات (Geophysics)

علمِ طبقات الارض:

علمِ طبقات الارض میں درج ذیل امور زیر مطالعہ لائے جاتے ہیں:

1۔ کرہ ارض کی ابتدا کو سمجھنا۔

2۔ اس کی طبعی حالتوں میں تبدیلی کی تاریخ سے آگاہی حاصل کرنا۔

3۔ کرۂ ارض کے اجزا (چٹانیں، فوصل، زیرزمین مائع اشیا) کی شکل اور ہیئت وغیرہ میں وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والی تاریخی اور حالیہ تبدیلیوں سے آگاہ ہونا۔

4۔ کرہ ارض جن ٹھوس اور مائع عناصر سے مل کر بنا ہے ان کا علم۔

5۔ جو عوامل ماضی میں زمین کی طبعی حالت پر اثر انداز ہوئے اور جو ہو رہے ہیں ان کا مطالعہ۔

6۔ زمینی وسائل جیسے دھاتیں، قدرتی گیس، پٹرولیم وغیرہ کے نکالنے کے عمل کے لیے درکار بنیادی علم، ان کے اخراج میں حائل رکاوٹوں کا علم جس میں کچھ انجینئرنگ کے شعبہ جات بھی آجاتے ہیں۔

7۔ کرۂ ارض کی موسمیاتی تبدیلیوں کی تاریخ کا علم اور ان کی روشنی میں آج کی تبدیلیوں کو سمجھنا۔

ماہرین طبقات الارض کا بنیادی تعلق چٹانوں اور ان سے حاصل شدہ مواد سے ہوتا ہے جو کرہ ارض کے بیرونی حصے کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ماہرین اس سلسلے میں سائنس کے دیگر شعبہ جات جیسے کیمیا، طبیعیات اور حیاتیات (Biology) سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان علوم سے ماہرین طبقات الارض کا تعلق اتنا وسیع اور گہرا ہے کہ آج اس استفادے کی بدولت خود سے ارضی کیمیا، ارضی طبیعیات، جیو کرونالوجی (ارضیاتی تبدیلیوں کے مطالعے سے زمین اور زمین کے مختلف اجزا جیسے چٹانیں، فوصل وغیرہ کی عمر کا اندازہ لگانے کا علم) اور پیلنولوجی (فوصل اور مختلف قدیم جسیموں کے ارتقا وغیرہ کا علم) جیسے ارضی شعبہ جات وجود میں آچکے ہیں جن کی مدد سے ماہرین وقت کے ساتھ ساتھ کرۂ ارض میں آنے والی تبدیلیوں کو بہتر انداز میں جان پاتے ہیں۔

ارضی طبیعیات:

ارضی طبیعیات میں کرۂ ارض کے تمام طبعی امور زیر مطالعہ آتے ہیں۔ ارضی طبیعیات اور علم طبقات

قرآن سے میرا تعلق

میں نے تعلیم کا آغاز ہی قرآن مجید سے کیا۔ چار برس کی عمر تھی جب گاؤں کی مسجد میں درس لینا شروع کیا۔ ابتدائی پانچ پارے پڑھے تھے کہ یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ پرائمری تعلیم کے بعد جب مڈل میں داخلے کے لیے اپنے سرپرست چچا کے ہاں پہنچا تو انھوں نے خود ہی قرآن کی تعلیم دینا شروع کی۔ یہ تعلیم قرآن کو ناظرہ پڑھنے تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ متن کے اُردو ترجمے کے علاوہ مفصل تفسیر بھی شامل تھی۔ یہ تفسیر حقانی تھی۔ پھر پانچویں جماعت سے بی۔اے تک میں نے عربی کی تعلیم حاصل کی اور یوں قرآن مجید کی تفہیم میں خاصی مدد ملی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قرآن کے متعدد تراجم اور تفسیری نسخے زیر مطالعہ رہے لیکن اب میرا طریق یہ ہے کہ ترجمے کی صحت معلوم کرنی ہو تو مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ دیکھ لیتا ہوں اور کسی آیت کی تفسیر پیش نظر ہو، تو مولانا ابوالکلام آزاد سے استفادہ کرتا ہوں۔ یوں تو قرآن مجید کے کسی ایک حصے کو کسی دوسرے حصے پہ ترجیح دینا گستاخی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے نظریات پر اس آیت کا بے حد گہرا اثر ہے۔ ترجمہ۔ ''خداوند رحمان کے خاص بندے وہ ہیں جو آرام سے اور بغیر تکبر کے زمین پر چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ انھیں مخاطب کرتے ہیں تو وہ انھیں سلام کہتے ہیں۔'' (الفرقان:63)

قرآن مجید کے متعلق مجھے یہ واقعہ کبھی نہیں بھولے گا کہ ایک گاؤں میں ایک نوجوان کسی الزام میں پکڑا گیا۔ معاملے سے تھانے کو مطلع کرنے کے بجائے گاؤں کے ناموس کے نام پر معززین کی ایک پنچایت کے سامنے پیش کیا گیا تھا، پنچایت نے یہ اعلان کیا کہ اگر یہ نوجوان قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کہہ دے کہ اس پر الزام غلط ہے تو اپنا دعویٰ واپس لے لیا جائے گا۔ نوجوان نے بھی یہ دعوت قبول کرلی۔ قرآن مجید کا ایک نسخہ منگایا گیا اور جب نوجوان سے کہا گیا کہ وہ اُسے چھو کر قسم کھائے تو وہ ایک قدم آگے بڑھا بھی، مگر پھر جیسے سناٹے میں آگیا۔ اس کے جسم پر لرزا طاری ہوگیا۔ رنگ فق ہوگیا۔ ہونٹ کانپنے لگے اور آخر اس نے بچوں کی طرح بلک کر روتے ہوئے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ (احمد ندیم قاسمی)

الارض کے درمیان بہت سے امور مشترک ہیں اور بہت سے عملی کاموں میں دونوں علوم کے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ علم طبقات الارض (Geology) بنیادی طور پر کرۂ ارض اور اس کے اجزا کا بحیثیت مجموعی علم ہے جس میں جہاں ضرورت ہو علم طبیعات (Physics) کی بھی مدد لی جاتی ہے جبکہ ارضی طبیعیات (Geopghysics) صرف کرۂ ارض کے طبعی (Physical) امور سے بحث کرتا ہے۔ ارضی طبیعیات میں درج ذیل کا مطالعہ کیا جاتا ہے:

1۔کرہ ارض اور خلا میں اس کا ماحول

2۔زمین کی شکل، کشش ثقل (Gravity) اور مقناطیسی (Magnetic) حالتوں اور کیفیات کا مطالعہ

3۔زمین کے اندرونی ڈھانچا، اس کے اجزائے ترکیبی (جن سے مل کر بنی ہے)، زمین کی بیرونی پلیٹوں کی حالت، حرکات اور تبدیلیوں، لاوے، اندرون و بیرونِ زمین آتش فشانی عمل اور چٹانوں کی ساخت کا مطالعہ

4۔کرۂ ارض پر بخارات بننے سے لے کر بارشوں، برف باری، پانی کے ذخائر (سمندروں) اور ان میں تبدیلیوں کا مطالعہ۔

ماہر علوم الارض بننے کے لیے درکار خصوصیات:

1۔سائنسی رویہ

2۔حیاتیات، کیمیا اور ریاضی میں عبور

3۔تفصیلات تک پہنچنے کی جستجو

4۔تجزیاتی اور تنقیدی سوچ

5۔کھلا، تفتیشی اور تجزیاتی ذہن

6۔دو جہاتی (Two dimentional) ڈرائنگ کو سامنے رکھتے ہوئے سہ جہاتی (Three dimentional) صورت کا تصور کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت

7۔اچھی قوت مشاہدہ

8۔ثابت قدمی

9۔دیانتداری

10۔ٹیم کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت

11۔آؤٹ ڈور کام کرنے کی صلاحیت

طبقات الارض (Geology) اور ارضی طبیعیات (Geo physics) کے ماہرین کے کام کے عملی میدان یہ ہیں:

1۔ارضیاتی تحقیق اور سروے کے ملکی اور بین الاقوامی ادارے

2۔تیل اور گیس کی کمپنیاں

3۔معدنیات تلاش کرنے اور نکالنے والے ادارے

4۔کرۂ ارض کی ماحولیات کی تحقیق کے ادارے۔

5۔تعمیراتی ادارے

6۔زیرِ زمین آنے والی تبدیلیوں کے مطالعہ اور تحقیق کے ادارے۔ان اداروں میں زلزلوں، آتش فشاں اور سیلاب وغیرہ کے متعلق اعداد و شمار جمع کیے جاتے ہیں، ان کا تجزیہ اور ان پر تحقیق کی جاتی ہے، نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اور پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں۔

7۔آب پاشی کا محکمہ

8۔جنگلات

9۔جیوتھرمل توانائی کا شعبہ

10۔کالج اور جامعات

علوم الارض (Geo/Earth Sciences) کے تحت ذیلی شعبہ جات

نمبر شمار	پروفیشن	متعلقہ امور یا کام
1	ایٹموسفیر سائنٹسٹ (Atmospheric Scienctist)	موسمی تغیرات، زمین پر تابکاری (سورج کی شعاعوں سے) کے اثرات، اوزون کی تہ اور آلودگی سے متعلق موضوعات کا علم اور کام۔
2	انجینئرنگ جیولوجسٹ	ارضی اعداد و شمار، تکنیک اور اصولوں کی روشنی میں چٹانوں، زمینی مٹی اور زیرِ زمین پانی کا مطالعہ اور تجزیہ۔ پلوں، عمارات اور بندوں (Dams) پر پڑنے والی نمک، ارضیاتی تہدیلیوں کے اثر کا علم اور مطالعہ۔
3	انوائرمنٹل جیولوجسٹ	مرکزِ زمین کی مختلف سطحوں سے لے کر اوپر کی سطح اور پھر فضا تک زمین کی تمام سطحوں کا مطالعہ۔ یہ آلودگی، فاضل مادے کے اخراج اور شہری ترقی کی وجہ سے ماحول میں آنے والی تبدیلیوں جن میں سیلاب اور آتش فشانی عمل بھی شامل ہے پر کام کرتے ہیں۔
4	جیوکیمسٹ	اندرون زمین ٹھوس اور مائع حالتوں میں موجود عناصر کی کھوج اور مطالعہ۔ جیسے پٹرولیم سے متعلق جیوکیمسٹ کوئلے، تیل اور گیس میں موجود فاصل کے اجزائے ترکیبی کا مطالعہ کرتے ہیں۔
5	جیوکرونالوجسٹ	چٹانوں کی فرسودگی کے عمل، ان کی عمروں اور ان میں آنے والی تاریخی تبدیلیوں کی تحقیق۔
6	جیولوجسٹ	زمین کی تاریخ، اس کے مواد اور اس کی طبعی ساخت وغیرہ کی تحقیق و مطالعہ۔
7	جیومارفالوجسٹ	زمین کی اندرونی و بیرونی شکل اور ساخت پر موسمی تغیرات اور انسانی سرگرمیوں کی وجہ سے آنے والی تبدیلیوں کا مطالعہ۔
8	گلیشیل جیولوجسٹ	برفانی تودوں اور گلیشیر پر پڑنے والی طبعی اثرات کا مطالعہ۔
9	ہائیڈرالوجسٹ	بخارات بننے سے بارش اور برف باری کی صورت میں زمین پر برسنے اور پھر دریاؤں کے ذریعے سمندروں تک پہنچنے تک پانی کے سائیکل کا مطالعہ۔ میرین جیولوجسٹ سمندروں کی زمینی تہ (فرش)، براعظمی حد، ڈیراعظمی ترائیوں اور ساحلوں کے ماحول کی تحقیق اور مطالعہ۔
10	میٹرولوجسٹ	زمین کی فضا اور اس میں پائے جانے والے قدرتی عوامل اور موسموں کا مطالعہ۔
11	منرالوجسٹ (Mineralogist)	معدنیات کے بننے کے عمل، ان کے اجزائے ترکیبی اور خصوصیات کا مطالعہ۔
12	اوشنوگرافر (Oceanographer)	سمندر کی طبعی، کیمیائی، حیاتیاتی اور ارضیاتی حرکیات (Dynamics) کا مطالعہ۔
13	سیڈیمنٹالوجسٹ (Sedimentologist)	تیل، گیس اور کوئلے میں پائے جانے والے مٹی، ریت یا گاد وغیرہ کی حقیقت (Nature) اور ماخذ (Origin) وغیرہ کی تحقیق و مطالعہ۔
14	سیسمولوجسٹ (Selsmologist)	زلزلوں کا مطالعہ اور تجزیہ، زلزلے کی لہروں کی وجہ سے زمین پر آنے والی تبدیلیوں کی تحقیق۔
15	سوئل سائنٹسٹ (Soil Scientist)	زرخیز مٹی کی خصوصیات کا مطالعہ۔ یہ دیکھنا کہ مٹی کی زرخیزی کیسے برقرار رکھی جاسکتی ہے اور کس طرح اس تباہ کرنے والے عوامل کو ختم کیا جاسکتا ہے۔
16	سٹرکچرل جیولوجسٹ	ان زمینی قوتوں کا مطالعہ جو قشرِ ارض (Crust) کی شکل کو تبدیل کرتی اور اس میں توڑ پھوڑ کرتی ہیں۔
17	سٹریٹی گرافر (Stratigraphe)	چٹانوں کی تہوں میں مٹی، ریت یا گاد وغیرہ کے مطالعے کے ذریعے ان کی عمر، تشکیل اور اسی چٹان کی دیگر تہوں سے اس کے اشتراک و اختلاف کو جاننے کا علم۔ سٹریٹی گرافر بنیادی طور پر چٹانوں میں موجود تہوں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کرتا ہے۔
18	اکنامک جیولوجسٹ	زمین سے حاصل ہونے والی ہر قسم کی ٹھوس اور مائع اشیا کی اس نقطہ نظر سے کھوج اور مطالعہ کہ انہیں کیسے انسان کے لیے مفید بنایا جاسکتا اور بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔
19	ملٹری جیولوجسٹ	جنگی نقطہ نظر سے ارضی علوم کا مطالعہ۔
20	فورنسک جیولوجسٹ (Forensic Geologist)	جرائم کے خاتمے کے لیے ارضیاتی علوم کا مطالعہ۔

اصولِ مرفی

بیڑا غرق ہو مرفی کا، ظالم نے سچا لیکن بدترین اصول دریافت کیا

حسن رزاقی

"آپ" کے دوست کو پھر بچپن کا دورہ پڑا ہے۔ مزہ لینا ہو، تو آجائیں۔" یہ جمیلہ کا فون تھا۔

ریاض کا اور میرا ساتھ بہت پرانا تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی سائنس کالج اور انجینئرنگ کالج میں پڑھائی ختم کی اور اب اتفاق سے ایئر لائنیز سعودیہ کے شعبہ انجینئرنگ میں ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ ہم دونوں کی رہائش "سعودیہ سٹی" میں تھی۔ ریاض کا اپارٹمنٹ میرے گھر سے چند سو گز کے فاصلے پر تھا۔

میں دس بارہ منٹ بعد وہاں پہنچ چکا تھا۔ ریاض کچھ جھنجلائے ہوئے بیٹھے تھے۔ "کیا معاملہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں!" ریاض نے جواب دیا۔ آج ہر کام غلط ہو رہا ہے۔ "صبح دفتر جانے کے لیے باہر آیا، تو ایک اڑتے ہوئے پرندے نے قمیص پر گل کاری کر دی۔ قمیص بدل کر باہر آیا، تو گاڑی کا ٹائر پنکچر تھا۔ اس کو بدل کر دفتر پہنچا، تو امین سے جھڑپ ہوگئی۔ (امین ریاض کا باس تھا۔)

"آج راتب کا دن تھا۔" پھر مجھ سے سوال "آج تم دفتر کیوں نہیں آئے؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا۔

ریاض نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "راتب والے کے پاس میرا چیک نہیں تھا۔" سعودی عرب میں تنخواہ کو راتب کہتے ہیں۔ یہ 1980ء کی بات ہے۔ سعودیہ میں راتب..... تنخواہ..... ادا کرنے کا ایک انوکھا طریقہ تھا۔

مہینے کے اختتام سے دو تین دن پہلے پے رول (Pay Roll) کے شعبہ کے دو آدمی ہر دفتر میں جا کر وہاں کام کرنے والوں کو تنخواہ کے چیک بانٹا کرتے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ملازمین کی فہرست ہوتی تھی، دوسرے کے سر پر ایک کالے رنگ کی صندوقچی جس میں چیک موجود ہوتے تھے۔ چند سال بعد یہ انوکھا سلسلہ ختم ہوگیا اور چیک براہِ راست ملازمین کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروائے جانے لگے۔

ریاض نے اپنے چیک کی کتھا جاری رکھی۔ "جب نہیں ملا تو پے رول سیکشن گیا۔ انہوں نے میری دو ہفتہ کی تنخواہ کاٹ رکھی تھی۔ کیونکہ انھیں میری چھٹی کی درخواست نہیں ملی تھی۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے بعد آخرکار چیک لے کر دفتر واپس آگیا۔"

"شام کو چیک کیش کرانے بینک گیا، تو وہاں حسب معمول تین لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔"

سعودیہ سٹی کے نزدیک..... مدینہ روڈ پر..... الراجحی بینک کی شاخ تھی۔ سعودیہ سٹی میں رہنے والے ملازمین اپنی تنخواہ کے چیک اسی شاخ سے کیش کرواتے تھے جس دن تنخواہ ملتی تھی اس دن اس شاخ پر دو تین لائنیں لگتی تھیں جو سڑک تک پہنچ جاتی تھیں۔ ریاض اسی لائن کی شکایت کر رہے تھے.....

"خدا خدا کر کے میری باری آئی" ریاض نے اپنی درد بھری داستان آگے بڑھائی، پیسے لے کر گھر آیا، تو جمیلہ کو گروسری (Grocery) لینے المختار جانا تھا۔ گاڑی کے پاس آئے، تو ٹائر ایک بار پھر پنکچر ہو چکا تھا۔ میں نے غصے میں آکر ٹائر کو ٹھوکر ماری تو پھسل کر چاروں خانے چت۔ جمیلہ کو ہنسی آرہی تھی مجھے غصہ۔" جمیلہ کو اس ہنسی کی سزا دینا ضروری تھا۔

"میں نے جمیلہ سے کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گا اگر تمھیں گروسری لینی ہے، تو حسن کو فون کرلو۔" جمیلہ کی سزا تو سنائی جا چکی تھی۔ اب مرفی (Murphy) کی باری تھی۔

"یہ سارا قصہ مرفی کا ہے، نہ اس کمبخت نے اصول مرفی (Murphys' Law) دریافت کیا ہوتا نہ میری یہ درگت بنتی۔" مرفی کا قصور تو ثابت ہو چکا تھا۔ اب حرف سزا سننے کا انتظار تھا۔ "اگر وہ کمبخت میرے سامنے ہوتا، تو میں اسکا گلا گھونٹ دیتا۔"

مرفی کا دریافت کردہ اصول بہت سیدھا سادہ ہے۔

"اگر کوئی چیز غلط راہ پر جا سکتی ہے، تو جائے گی۔"

"If anything can go wrong;it will"

امریکی ذہن ہر چیز میں کاروبار کی تلاش میں رہتا ہے اس کو ہر چیز میں تجارت کا پہلو نظر آتا ہے۔ جب ماؤنٹ سینٹ ہیلن (Mount Sant Helen) سے خطرناک قسم کا لاوا نکلا، تو لوگوں نے اس کی راکھ کو بوتلوں میں بھر بھر کے بیچنا شروع کر دیا۔ امریکی ذہن نے "اصول مرفی" کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔

اصول مرفی کے کئی ذیلی اصول نکل آئے، کئی فردعات نے جنم لیا جن کو منطقی نتیجہ۔" (Corollory) کا نام دیا گیا..... ایک بہت ہی مشہور ذیلی اصول یہ ہے..... "آپ جس قطار میں کھڑے ہیں وہ قطار دوسری قطاروں کے مقابلہ میں سب سے آہستہ چلے گی۔ اگر آپ اس قطار کو چھوڑ کر تیز رفتار قطار میں آکھڑے ہوں گے، تو یہ قطار بھی سست ہو جائے گی اور آپ کی چھوڑی ہوئی قطار سب سے زیادہ رفتار سے چلنے لگے گی۔" ایسے ہی اور بے شمار ذیلی اصول نکل آئے۔ بالآخر یہ ذیلی اصول اس تعداد میں ہوگئے کہ ان کے باقاعدہ کتابچے بن کر کتابوں کی دکانوں پر بکنے لگے۔ امریکی ذہن "اصول مرفی" کو کاروبار میں بھول چکا تھا۔

سعودیہ میں، میں کرٹ کا ماتحت تھا۔

کرٹ کے ساتھ مجھے بوئنگ (Boeing) کمپنی کے ساتھ ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے سیاٹل (Seattle) جانا تھا۔ جدہ سے نیویارک سعودیہ کی پرواز سے اور نیویارک سے سیاٹل یونائیٹڈ ایئر لائنز (United Airlines) سے۔

جان-ایف- کینڈی ایئرپورٹ پر کئی ٹرمنل بنے ہوئے ہیں۔ ہر ٹرمنل پر صرف مخصوص ایئر لائنوں کے جہاز اتر سکتے ہیں۔ سعودیہ کا جہاز TWA کے ٹرمنل پر اترا تھا۔ وہاں سے یونائیٹڈ ایئر لائن کے ٹرمنل تک بذریعہ بس جانا تھا۔

میں یونائیٹڈ کے ٹرمنل میں کتابوں کی دکان میں چکر لگا رہا تھا کہ میری نظر "اصول مرفی" کے ایک کتابچہ پر پڑی۔ میں نے وقت گزاری کے لیے کتابچہ خرید لیا۔

چند صفحے پڑھے تھے کہ پرواز کا اعلان ہوگیا۔ میں اور کرٹ جہاز کی طرف چلے گئے۔ جہاز کے فضا میں بلند ہونے کے بعد میں نے دوبارہ ''اصول مرفی'' کا کتابچہ پڑھنا شروع کردیا۔ ایک ذیلی اصول حسب حال تھا۔

''جیسے ہی جہاز میں کافی سرو (Serve) کی جائے گی، پرواز ناہموار ہوجائے گی..... جہاز ہچکولے کھانے لگے گا۔ سبق یہ ملا کہ جہاز کے ناہموار ہونے کا سبب کافی سرو کرنا ہے۔'' مجھے یہ ذیلی اصول دلچسپ لگا..... میں نے کرٹ کو سنایا..... سن کر کرٹ نے کہا۔'' کیا بچوں کی طرح خوش ہورہے ہو۔ تمہارا بچپنا ابھی تک نہیں گیا۔ بند کرو اس نامعقول کتاب کو۔'' باس کا حکم تھا میں نے فوراً اس نامعقول کتاب کو بند کردیا۔ تھوڑی دیر بعد ائیر ہوسٹس ناشتا لے کر آگئی۔ ناشتے کی تھالی رکھنے کے بعد وہ ایک ہاتھ میں چائے کی کیتلی اور دوسرے میں کافی کی کیتلی لے کر آگئی۔ میں نے اپنی پیالی آگے بڑھا کر چائے طلب کی۔ کرٹ نے کافی مانگی۔

چائے تو خیریت سے میری پیالی میں انڈیل دی گئی لیکن جیسے ہی ائیر ہوسٹس نے کرٹ کی پیالی کی طرف کافی کی کیتلی بڑھائی..... جہاز کو ایک زوردار جھٹکا لگا کافی چھلک کر کرٹ کی قمیص کو داغدار کرگئی۔ ائیر ہوسٹس نے پیچھے کی طرف جھکولا کھایا۔ سنبھلنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ گیلری (Gallery) کی طرف لوٹ گئی۔

میں نے کرٹ کی طرف معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا۔ کرٹ نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا ''خبردار کچھ کہنا نہیں۔'' میں نے کچھ نہیں کہا۔

مرفی اگر اس وقت کرٹ کے سامنے ہوتا، تو وہ یقیناً اس کا گلا گھونٹ چکا ہوتا۔

بروز پیر مجھے اپنے وکیل سے سکھر ملنا تھا۔

پچھلے انتیس (29) سال کے قلیل عرصہ سے میں اس کوشش میں سرگرداں ہوں کہ عدالت کے ذریعہ قانونی طور پر اپنی زمین سے ناجائز قابضین کو ہٹاسکوں۔ یہ کوشش ہنوز جاری ہے۔ ہمارے قوانین کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ مجرموں کے حقوق کسی طور پامال نہ ہونے پائیں ان کو مکمل قانونی تحفظ حاصل ہو۔

اگر کسی کا دل چاہے، تو وہ آپ کی جائداد پر غیر قانونی طور پر قابض ہوسکتا ہے۔ لیکن آپ اس کو صرف قانونی کارروائی کے ذریعہ ہی اپنی جائداد سے بے دخل کرسکتے ہیں۔ وہ آپ کو ناجائز اور غیر قانونی طریقے سے بے دخل کرسکتا ہے مگر آپ اس کو بے دخل نہیں کرسکتے بدون عدالت کے حکم کے..... قانونی کارروائی کے۔

عدالتوں کے چکر کاٹنے پر معلوم ہوا کہ یہ قانونی کارروائی دادا شروع کرتا ہے اور اُس کا فیصلہ پوتا سنتا ہے۔ زیادہ تر فیصلے غیر قانونی قابضین کے حق میں ہوتے ہیں کہ ان کے حقوق کو کوئی پامال نہیں کرسکتا۔ جائداد کا جائز مالک بھی نہیں۔

حسن اتفاق سے اگر فیصلہ پوتے کے حق میں ہو بھی جائے، تو اصل جیت غیر قانونی قابض ہی کی ہوتی ہے کہ وہ تیس چالیس سال اس زمین سے فائدہ اٹھا چکا ہوتا ہے۔ اور بیچارہ مالکِ جائداد جو اس قابض کو ہٹانے کا گناہ کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ پچھلے تیس سال کا کرایہ یا کھویا ہوا منافع حاصل کرسکتا ہے۔

ان قانونی موشگافیوں کا توڑ صرف وکیلوں کے پاس ہوتا ہے۔ میرا اپنے وکیل سے پیر کے دن ملنا ضروری تھا، جس کے لیے مجھے اتوار کے دن کراچی سے پنوعاقل کا سفر کرنا تھا۔

یہ اتوار..... عام اتوار نہ تھا..... یوم عاشورہ تھا۔

بدامنی کا دَور دورہ تھا۔ متوقع دہشت گردی کے پیشِ نظر موٹر سائیکل کی سواری اور موبائل فون پر پابندی

عائد کردی گئی تھی۔ حالات کے پیشِ نظر میں وقت سے پہلے ہی اپنے ڈرائیور اور چوکیدار سمیت کینٹ اسٹیشن کے لیے روانہ ہوگیا کہ اگر راستے میں کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا، تو اپنی ہی گاڑی میں اسٹیشن چلا جاؤں گا، ورنہ دوسری سواری پر۔ حالات ٹھیک تھے۔ میں پونے سات بجے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ عوامی ایکسپرس آٹھ بجے چلنے والی تھی۔

پچھلے چار سال میں لگا تار کراچی اور پنوعاقل کے درمیان سفر کرنے سے تجربہ میں آیا تھا کہ نوے فیصد سے زیادہ مواقع پر کراچی سے سفر کا آغاز کرنے والی ٹرین وقت پر روانہ ہوتی ہے۔ لیکن ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بھی گاڑی وقت پر پنوعاقل پہنچی ہو۔ ایک گھنٹا سے لے کر نو گھنٹے تک کی تاخیر عام بات تھی۔

لیکن آج معاملہ الٹ تھا۔ گیارہ بجے گاڑی حیدرآباد سے ٹنڈو آدم کے لیے روانہ ہوچکی تھی اور پہلی دفعہ بالکل ٹھیک وقت پر نواب شاہ کے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔

نواب شاہ پر موبائل فون بند نہ تھے۔ میں نے پنوعاقل فون کرکے عمر دین کو خوشخبری سنائی کہ چار سال میں پہلی دفعہ امید ہے کہ گاڑی اپنے ٹھیک وقت پر پنوعاقل اسٹیشن میں داخل ہوگی۔

امید کا سلسلہ قائم رہا۔ ٹھیک چار بج کر ستر منٹ پر گاڑی روہڑی اسٹیشن میں داخل ہورہی تھی۔

ایک گھنٹا بعد پنوعاقل!!

عوامی ایکسپرس پلیٹ فارم نمبر 4 پر آکر رکی تھی۔ برابر والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی کھڑی تھی اس کا رخ بھی پنوعاقل کی جانب تھا۔ اتر کر معلوم کیا، تو پتا چلا کہ یہ ہزارہ ایکسپریس تھی جو کئی گھنٹے کی تاخیر کے بعد روہڑی پہنچی تھی۔ پہلے یہ گاڑی جائے گی اس کے بعد عوامی۔ ہزارہ بھی پنوعاقل رکتی ہے۔ دل میں آیا اس میں سوار ہوجاؤں، تو اور بھی پہلے منزل مقصود پر پہنچ جاؤں گا۔ پھر خیال بدل دیا۔

ہزارہ کے انجن نے سیٹی بجائی۔ لوگ دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے ڈبوں میں سوار ہونے لگے چند منٹ میں گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ چند منٹ بعد ہماری گاڑی کو چلنا چاہیے تھا۔ میں اطمینان سے اپنی برتھ پر آکر لیٹ گیا۔ نیند کی جھپکی آگئی۔ آنکھ کھلی تو گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور گاڑی ابھی تک روہڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اپنے اوپر غصہ آیا کہ اگر ہزارہ میں سوار ہوگیا ہوتا، تو اب تک پنوعاقل پہنچ چکا ہوتا۔

انہیں سوچوں میں مزید پندرہ منٹ گزر گئے۔

طبیعت اُکتا گئی تھی۔ ریل سے نیچے اُتر کر انجن کی طرف نظر ڈالی، تو انجن غائب۔

یااللہ انجن کہاں چلا گیا۔ اتنے میں دوسری طرف سے کراچی جانے والی گاڑی پر ایکسپریس لکھا ہوا تھا۔

یہ ہزارہ ایکسپرس کراچی جارہی تھی۔ یہ وہی گاڑی تھی جو گھنٹا سوا گھنٹا پہلے پنوعاقل کے لیے روانہ ہوئی تھی۔

منڈوڈیرو اور سانگی اسٹیشن کے درمیان اس کا انجن فیل ہوگیا تھا۔ یہ راستہ میں کھڑی ہوگئی تھی۔ جب تک پٹڑی خالی نہ ہو عوامی ایکسپریس آگے نہیں جاسکتی۔ اس کا ایک ہی حل تھا۔

عوامی کا انجن سانگی جاکر اس گاڑی کو کھینچ کر واپس روہڑی لائے تاکہ لائن خالی ہو جس کے بعد یہی انجن عوامی کو لے کر پنوعاقل روانہ ہو۔

چار سال میں پہلی دفعہ وقت پر پنوعاقل پہنچنے کی امید دم توڑ چکی تھی۔ اس میں بھی یقیناً مرفی کا خفیہ ہاتھ ہوگا۔

بدبخت مرفی اگر میرے سامنے ہوتا، تو میں اسکا گلا گھونٹ کر کرٹ اور ریاض کی صف میں شامل ہوچکا ہوتا

If anything can go wrong.....

اصول مرفی کا مضمون لکھے ہوئے مجھے چند ماہ ہوچکے تھے۔ میرے سامنے ایک دفعہ پھر سے کراچی سے پنوعاقل کے سفر کا مرحلہ درپیش تھا۔ کراچی سے

پنو عاقل کے درمیان پچھلے پچاس/پچپن اوٹ لوٹ (سندھی زبان میں کسی جگہ جانے اور واپس آنے کو اوٹ لوٹ کہتے ہیں.....) سفر سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ کراچی سے پنوعاقل کے درمیان سب سے اچھا اور معتبر سفر ''شالامار ایکسپریس'' سے کیا جاسکتا ہے۔ شالامار ایکسپریس بھی کسی کی تحویل میں چلائی جاتی ہے۔

یہ ٹرین کراچی سے صبح چھ بجے روانہ ہوتی ہے اور دوپہر بارہ بجے روہڑی پہنچا دیتی ہے۔ روہڑی اسٹیشن سے باہر آکر تھوڑی دیر کے فاصلہ پر پنو عاقل جانے والی ویگن مل جاتی ہے۔ اس سے پہلے میں تین دفعہ یہ سفر کامیابی کے ساتھ طے کرچکا تھا۔

چار مئی کا دن تھا۔ صبح ٹھیک چھ بجے شالامار ایکسپریس نے سیٹی دی اور ریل کے ڈبے کے پہیوں سے چرچر کی سی آواز آئی جو چند سیکنڈ بعد دم توڑ گئی۔ اگلے دس پندرہ منٹ گاڑی کبھی آگے اور کبھی پیچھے کی طرف سرکتی رہی۔ شاید ذہن بنا رہی تھی کہ آگے جاؤں یا پیچھے۔ آخر کار تھک کر اس نے دم سادھ لیا۔ معلوم ہوا کہ انجن خراب ہوگیا ہے۔ ٹھیک کیا جارہا ہے۔ اس سانحہ میں یقیناً مرفی کا خفیہ ہاتھ کارفرما رہا ہوگا۔ جس ٹرین کے لیٹ ہونے کے سب سے کم امکانات تھے چلنے سے پہلے ہی چار گھنٹے لیٹ ہوچکی تھی۔

دس بجے کے قریب انجن ٹھیک کیا جاچکا تھا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں ٹرین لانڈھی اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی۔ پھر لانڈھی سے روانہ ہونے کے لیے ٹرین نے سیٹی بجائی مگر ایک دفعہ پھر وہی صورت حال تھی جو کراچی میں پیش آئی تھی۔ مرفی نے ایک دفعہ پھر اپنا..... انجن دوبارہ خراب ہوچکا تھا۔ ایک گھنٹے بعد دوسرا انجن بھیجا گیا جو شالامار ایکسپریس کو لے کر آگے بڑھا۔

جس وقت ہم لوگ کراچی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑے ..... انجن کے ٹھیک کیے جانے کا انتظار کر رہے تھے ..... اس دوران عوامی ایکسپریس اور ہزارہ ایکسپریس کی روانگی کا اعلان کیا جاچکا تھا۔ عوامی ایکسپریس اگر اپنے وقت کے مطابق چلے، تو پانچ بجے تک روہڑی اسٹیشن پہنچ جاتی ہے۔ شالامار چونکہ پانچ گھنٹے لیٹ ہوچکی تھی ..... یہ بھی اب روہڑی اسٹیشن بارہ بجے دوپہر کے بجائے پانچ بجے پہنچے گی۔

اگر عوامی ایکسپریس بھی اس وقت روہڑی اسٹیشن پر کھڑی ملی، تو میں اس میں سوار ہوکر پنو عاقل جاسکتا تھا۔ اسٹیشن سے باہر جاکر پنو عاقل جانے والی ویگن کے انتظار کی زحمت اور پریشانی سے بچا جاسکتا تھا۔

روہڑی سے پہلے خیر پور کا اسٹیشن آتا ہے۔ خیر پور عوامی ایکسپریس کا سٹاپ ہے۔ مگر شالامار ایکسپریس یہاں نہیں رکتی۔ لیکن آج خوش قسمتی سے شالامار ایکسپریس خیر پور اسٹیشن سے چند منٹ پہلے ہی آچکی تھی۔

اسٹیشن پر عوامی ایکسپریس کھڑی تھی۔ اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن یہ صرف خوش نصیبی ہی نہیں تھی یہاں پر اچھی خبر بری خبر والی صورت حال تھی (Good news bad news)۔

اچھی چیز یہ تھی کہ میں شالامار ایکسپریس سے اتر کر عوامی ایکسپریس پر سوار ہوکر پنو عاقل جاسکتا تھا۔ اس طرح مجھے روہڑی اسٹیشن کے باہر گرمی میں پنو عاقل جانے والی ویگن کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

بری چیز یہ تھی کہ عوامی کے انجن میں آگ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ سائیڈ ٹریک (Side Track) پر کھڑی کر دی گئی تھی۔ جب نیا انجن آئے گا، تب یہ گاڑی چلے گی..... مرفی کا خفیہ ہاتھ پاکستان ریلوے کے پورے نظام پر مکمل طور سے حاوی ہوچکا ہے۔ پاکستان ریلوے اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اب ''دل میں حوصلہ نہ سکت بازوؤں میں ہے'' کہ میں مرفی کا گلا گھونٹ سکوں۔

کیا پاکستان اور بھارت

طویل رقابت اور جنگوں سے کوئی سبق سیکھا ہے؟

☆ پاکستان اور بھارت کے درمیان ازلی و ابدی دشمنی اور نفرت کا انجام آخر کیا ہوگا؟

☆ پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی اختلافات ہیں کیا؟

☆ کیا عالمی طاقتیں پاکستان اور بھارت کے مسائل حل کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں؟

☆ کیا پاکستان اور بھارت کے درمیان کبھی پرامن دوستانہ تعلقات قائم ہوسکیں گے؟

پروفیسر محمد فاروق قریشی

میں تقسیم ہند اور پاکستان اور بھارت 1947ء کی آزاد خودمختار ریاستوں کے قیام کے روزِ اوّل سے اب تک دونوں ممالک ایک لامتناہی رقابت اور مخاصمت میں مبتلا رہے ہیں۔ دنیا میں اس کا موازنہ صرف اسرائیل فلسطین تنازعے سے کیا جاسکتا ہے۔ دونوں اقوام میں بہت سی جغرافیائی، سیاسی، لسانی اور معاشرتی قربتوں کے باوجود بنیادی تقسیم اور اختلافات کی خلیج قومیتوں کی مختلف نظریاتی شناخت سے پیدا ہوئی جس کی جڑیں ہندوستان کی تاریخ، مذہبی عقائد، ثقافتی روایات اور معاشی تصورات میں گڑی ہوئی تھیں اور جو دو قومی نظریے کی شکل میں منظر عام پر آئی اور تقسیم ہند کا باعث بنی۔ بعد میں کچھ علاقائی اور سرحدی تنازعات نے مسئلے کو مزید پیچیدہ اور گمبھیر بنا دیا۔ اب چار باہمی جنگوں اور بے شمار بحرانوں کے بعد دونوں حریف ایٹمی قوت بن چکے ہیں اور مستقل عداوت اور مقابلہ بازی دونوں ممالک کی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کا راہنما اصول بن چکا ہے۔ دونوں اپنے اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں اور اس طرح ان کے تنازعات کا کوئی قابل قبول حل مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا۔ پاکستان اور بھارت پر مشتمل جنوبی ایشیا کو علاقائی اور عالمی امن کے حوالے سے انتہائی دھماکا خیز اور خطرناک ترین خطہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ عالمی طاقتوں کی توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی اختلافات ہیں کیا۔

1۔ تقسیم ہند: برصغیر کے ہندو اور مسلمان دونوں برطانوی استعمار سے آزادی چاہتے تھے لیکن چونکہ ہندو تعداد میں مسلمان، سکھ، بدھ اور عیسائی اقلیتوں کے مقابلے میں کئی گنا اکثریت رکھتے تھے، ان کے لیے برطانیہ سے آزادی حاصل کر لینا ہی سب سے بڑا ہدف تھا کیونکہ آزادی کے بعد کا جمہوری منظر نامہ ان کے لیے بہت خوش رنگ تھا جہاں ان کی اکثریتی حکومت کو صدیوں تک اقلیتوں کی طرف سے کسی مقابلے یا مزاحمت کا خطرہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جبکہ سب سے بڑی اقلیت کے طور پر مسلمان اسے اپنی سیاسی موت سمجھتے تھے اور وہ برطانیہ کے ساتھ ساتھ ہندو اکثریت سے بھی آزادی چاہتے تھے۔ چونکہ ہندو ہندوستان کو اپنا قدیمی آبائی وطن سمجھتے تھے اور مسلمانوں کو انگریزوں کی طرح بیرونی حملہ آور قرار دیتے تھے اس لیے ان کو ہندوستان کی تقسیم کسی طور گوارا نہ تھی۔ چناں چہ کانگریسی قیادت نے قیام پاکستان کی کھل کر مخالفت کی لیکن جب ان کی تمام تر کوشش اور مزاحمت کے باوجود ہندوستان تقسیم ہوگیا تو انھوں نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار گردانا۔ چناں چہ ہندوستان کے مسلمان ان کی دائمی عداوت اور نفرت کا نشانہ بن گئے۔ انھوں نے پاکستان کے قیام کو وقتی طور پر قبول کر لیا کیونکہ انھیں یقین تھا کہ پاکستان زیادہ عرصہ قائم نہیں رہے گا اور بہت جلد دونوں ملک پھر ایک ہوجائیں گے۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد پاکستان آنے والے مسلم مہاجرین کے قتل و غارت کے پیچھے بھی ان کا یہی جذبہ انتقام کارفرما تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دشمنی کم ہونے کے بجائے مسابقت اور مخالفت میں اضافہ ہی ہوا۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام میں بھارت کے گھناؤنے کردار نے پاکستان اور بھارت کے درمیان دشمنی کی خلیج کو مزید گہرا اور وسیع کر دیا۔ اس کا اظہار بھارت کی اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی نے ان الفاظ میں کیا ''ہم نے دو قومی نظریے کو بحرِ ہند میں غرق کر دیا ہے۔''

2۔ کشمیر: تقسیم ہند کا طے شدہ فارمولا یہ تھا کہ ہندو

اکثریت کے علاقے بھارت میں شامل ہوں گے اور مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کا حصہ بن جائیں گے۔ برطانوی ہندوستان میں شامل صوبوں' ریاستوں کے علاوہ بہت سی چھوٹی بڑی نیم آزاد و خودمختار ریاستیں بھی تھیں۔ ان کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرسکتی تھیں اور کسی تنازعے کی صورت میں ریاست کے عوام اپنا حقِ رائے دہی بھی استعمال کر سکتے تھے۔ان میں قابل ذکر ریاستیں کشمیر' حیدرآباد اور جوناگڑھ تھیں۔ حیدر آباد اور جونا گڑھ ہندو اکثریت کی ریاستیں تھیں جن کے حکمران مسلمان تھے جبکہ کشمیر مسلم اکثریت کی ریاست تھی جس کا حکمران ہندو تھا۔ بھارت نے اپنی برتر فوجی طاقت کے بل بوتے پر حیدرآباد اور جوناگڑھ پر قبضہ کرلیا اور ان کے مسلمان حکمرانوں کو بھارت کے ساتھ الحاق پر مجبور ہونا پڑا۔ بھارت نے کشمیر پر بھی قبضہ کرنے کے لیے اپنی فوجیں کشمیر میں اُتار دیں اور وادی کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ پاکستانی فوج نے بھی جوابی کارروائی کی اور کشمیر کے تھوڑے سے حصے پر قابض ہوگئی۔ بھارت نے اقوام متحدہ سے جنگ بندی کی درخواست اس وعدے کے ساتھ کی کہ کشمیر میں استصواب رائے کروایا جائے گا۔ چناں چہ اقوام متحدہ نے کشمیر میں استصواب رائے کے حق میں قرارداد منظور کی۔ لیکن جنگ بندی کے بعد بھارت اپنے وعدے سے مکر گیا اور اس نے آج تک کشمیر میں استصواب رائے نہیں کروایا۔ پاکستان سمجھتا ہے کہ کشمیر میں استصواب رائے تقسیم ہند کا نامکمل ایجنڈا ہے جسے بھارت کے وعدے' اقوام متحدہ کی قرارداد اور کشمیریوں کی خواہش کے مطابق حل ہونا چاہیے اور یہ بھی کہ کشمیر کے معاملے میں اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی اور اس ناانصافی اور کشمیریوں پر ظلم کا ذمہ دار بھارت ہے۔

لیکن بھارت نے تمام بین الاقوامی اور سفارتی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے اور کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دے رکھا ہے اور کشمیر پر کسی بھی باہمی تصفیے یا بین الاقوامی ثالثی کے امکان کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ کشمیر کا مسئلہ محض جغرافیائی' سیاسی اور قومی شناخت کے حوالے ہی سے اہم نہیں بلکہ اس کا براہ راست تعلق دونوں ممالک کے درمیان تقسیم ہونے والے آبی اور توانائی کے وسائل سے ہے جو دونوں ملکوں اور خصوصاً پاکستان کی زرعی معیشت اور صنعتی پیداوار کے لیے لائف لائن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کشمیر کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پاک بھارت تعلقات میں کشمیر کا مسئلہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس کو حل کیے بغیر دونوں ملکوں کے درمیان پائیدار امن اور اچھے ہمسایوں والے دوستانہ تعلقات کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔

3۔سندھ طاس آبی معاہدہ: آبی وسائل کی تقسیم کا جھگڑا بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنی پاکستان اور بھارت کی تاریخ۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان بہنے والے چھے دریاؤں یعنی سندھ' جہلم' چناب' راوی' ستلج اور بیاس کے پانیوں کی تقسیم کا معاملہ سب سے پہلے مئی 1948ء میں نیو دہلی میں دونوں ملکوں کی کانفرنس میں اُٹھایا گیا، لیکن کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ پاکستان سے کہا گیا کہ وہ اپنے لیے پانی کے متبادل ذرائع تلاش کرے۔ اس کے جواب میں پاکستان نے 1950ء میں رسمی طور پر بھارت سے احتجاج کیا کہ پاکستان کے آبی وسائل کی حدود کو متعین کیا جائے اور اس معاملے کو بین الاقوامی ثالثی عدالت میں لے جانے کی تجویز پیش کی جس کو بھارت نے مسترد کر دیا۔ بالآخر دس سال کی مذاکراتی

کوششوں اور تجاویز کے تبادلے کے بعد عالمی بینک کی مالی معاونت سے 19 ستمبر 1960ء کو دونوں ملکوں کے درمیان انڈس واٹر ٹریٹی (سندھ طاس آبی معاہدہ) پر دستخط کیے گئے۔ اس معاہدے کو دنیا میں ایک نہایت اہم معاہدہ سمجھا جاتا ہے جس پر دونوں ملکوں میں نصف صدی سے زائد عرصے کی مخاصمت کے باوجود عملدرآمد کیا جاتا رہا ہے۔ اس معاہدے کی رُو سے سندھ، جہلم اور چناب کے پانیوں پر پاکستان کا حق تسلیم کیا گیا جبکہ راوی، ستلج اور بیاس بھارت کے حصے میں آئے۔ 1978ء میں بھارت نے مقبوضہ جموں و کشمیر میں دریائے چناب پر سلال ڈیم تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ چناں چہ دونوں ملکوں کے درمیان ایک اور معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے مطابق بھارت ڈیم کی بلندی کو کم کرنے اور ڈیم کے پانی کو صرف بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرنے پر رضامند ہو گیا۔ لیکن 2005ء میں بھارت نے دریائے چناب پر 450 میگاواٹ کا ایک اور ڈیم یکطرفہ تعمیر کر لیا جس پر پاکستان نے ورلڈ بینک سے ثالثی کی درخواست کی۔ لیکن ورلڈ بینک کے ماہر نے 2011ء میں فیصلہ پاکستان کے خلاف دے دیا۔ اس پر پاکستان کے سماجی اور عسکری حلقوں میں بھارت کی ''آبی جارحیت'' کے خلاف زبردست احتجاج شروع ہو گیا۔ 2011ء میں بھارت نے 330 میگاواٹ کے کشن گنگا ڈیم کی تعمیر شروع کر دی جس پر دونوں ملکوں نے ایک دفعہ پھر بین الاقوامی ثالثی عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت نے بھارت کو مزید تعمیر سے روک دیا۔ تاحال عدالت کے فیصلے پر عمل درآمد کا انتظار ہے۔ پاکستان میں بعض گروپوں نے الزام لگایا ہے کہ انڈس واٹر کمیشن میں پاکستانی ماہرین اور وزارت خارجہ اور پانی و بجلی کی وزارت کے افسران پاکستان کے مفادات کا دفاع نہیں کر رہے اور خفیہ طور پر بھارتی منصوبوں کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ اسی طرح کا احتجاج بھارت اور مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھی کیا جا رہا ہے کہ حکومت کی طرف سے کیا جانے والا سندھ طاس معاہدہ ان کے حقوق کے منافی ہے کیونکہ ان کے ترقیاتی منصوبوں پر پابندیاں لگ رہی ہیں جبکہ پاکستان میں بھارت کے رویے کو منافقت اور دوغلا پن کا نام دیا جا رہا ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کی نظریں بین الاقوامی ثالثی عدالت کے متوقع فیصلے پر لگی ہوئی ہیں۔

4۔ سیاچن: یہ گلیشیر پاکستان اور بھارت کی متنازعہ سرحد کے ساتھ مشرق میں قراقرم پہاڑوں پر واقع ہے۔ 1984ء میں بھارتی فوج نے یکطرفہ طور پر گلیشیر کی بلندیوں پر قبضہ کر لیا جس کے جواب میں پاکستانی فوج کو بھی دنیا کے اس بلندترین میدان جنگ میں پوزیشن لینا پڑی۔ یہاں ہر طرف برف ہی برف ہے اور شدید سردی میں زندگی کو قائم رکھنا محال ہے۔ لیکن بھارتی حکمرانوں کی توسیع پسندی کی داد دینا پڑتی ہے بھارتی اسکالر اور تجزیہ نگار کانتی باجپائی نے اس کشمکش کو یوں بیان کیا کہ ''دو گنجے ایک کنگھی کے لیے لڑ رہے ہیں۔''

بھارتی حکومت کو یہ محاذ قائم رکھنے کے لیے بے شمار جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ حال ہی میں سیاچن کے گیاری سیکٹر میں سو سے زائد پاکستانی فوجی ایک برفانی تودے تلے دب کر جاں بحق ہو گئے۔ پاکستان کی حکومت اور فوج دونوں سیاچن کے معاملے پر کوئی سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں لیکن بھارتی فوج اس مہنگی ترین لڑائی کو جاری رکھنے اور کوئی تصفیہ نہ کرنے پر مُصر ہے۔ بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کے دور میں دونوں ملک سیاچن مسئلے کے حل پر تقریباً متفق ہو گئے تھے لیکن راجیو گاندھی کے اچانک قتل اور جنونی ہندو انتہا پسندوں

کے ہاتھوں بابری مسجد کے انہدام کے باعث معاہدہ تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ بعد میں انتہا پسند بھارتی سیکرٹری خارجہ مانی ڈکشٹ نے اسے سرد خانے میں پھینک دیا۔ بھارتیوں کے انکار کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ مستقبل میں پاکستان چین دوستی اور درہ قراقرم کے راستے ان کی کشمیر تک رسائی سے خوفزدہ ہیں۔ کشمیر پر قابض بھارتی فوج کو اس امکانی خطرے کے پیش نظر بھارت، سیاچن چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے جب تک کشمیر کا تنازعہ برقرار ہے سیاچن کا کوئی حل بھی خارج از امکان ہے۔ درحقیقت سیاچن کے معاملے میں بھارتی فوج حکومتی مصالحت کی پالیسی کو ویٹو کیے ہوئے ہے۔

5۔ تجارت: تقسیم ہند کے فوراً بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان تجارت کا حجم کافی زیادہ تھا۔ شاید یہ تقسیم سے پہلے کے اقتصادی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے تھا کہ پاکستان کی بھارت کو برآمدات 56 فیصد اور درآمدات 32 فیصد تھیں۔ 1950ء کے بعد ڈرامائی طور پر باہمی تجارت کم ہوگئی اور 1965ء کی جنگ کے بعد مزید کم ہوگئی۔ 1956ء میں پاکستان اور بھارت نے ایک تجارتی معاہدے پر دستخط کیے جس میں ایک دوسرے کو انتہائی پسندیدہ قوم کا تجارتی مرتبہ دیا گیا۔ 1970ء میں تجارت کو منتخب اشیا تک محدود کر دیا گیا۔ 1986ء میں پاکستان نے درآمدات کو بیالیس اشیا تک محدود کر دیا۔ 1987ء کے بعد سے سیاسی بحرانوں اور عدم اعتماد کے باعث باہمی تجارت میں کوئی بہتری دیکھنے میں نہیں آئی۔ پاکستان اور بھارت 1985ء اور 2004ء میں علاقائی تعاون اور تجارت کے معاہدوں سارک (SAARC) اور سافٹا (SAFTA) کے رکن بنے۔ ان کے علاوہ وہ بین الاقوامی جی-77 اور عالمی تجارتی تنظیم WTO کے رکن بھی ہیں۔ لیکن ان کے باوجود تجارت کی شرح انتہائی کم رہی۔ اپریل 2011ء میں پاکستان نے اعلان کیا کہ وہ تجارت کے لیے بھارت کو ''انتہائی پسندیدہ قوم'' کا درجہ دے گا' لوگوں میں روابط کو فروغ دے گا اور ویزہ سسٹم کو آسان کرے گا۔ اس کے جواب میں بھارت نے تجارتی اشیا کی فہرست پر فراخدلانہ نظرثانی کرنے کا وعدہ کیا۔ ان اعلانات کا سرحد کے دونوں طرف گرمجوشی سے خیرمقدم کیا گیا۔ پاکستان میں کچھ لوگوں نے کہا کہ کشمیر اور پانی کے تنازعات کو حل کیے بغیر تجارتی معاہدے غیرموثر رہیں گے اور یہ کہ تاریخ اور مستقبل کی نسلیں پاکستانی قیادت کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ باہمی تجارت وہ واحد چینل ہے جسے کھولنے کے لیے بھارت بے تاب ہے۔ شاید اسے اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے ایک قریبی منڈی کی ضرورت ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان کاروباری اور تجارتی وفود کے تبادلے بھی ہو رہے ہیں اور باہمی تجارت پر زور دیا جا رہا ہے، البتہ پاکستان کی طرف سے شکوک وشبہات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ لیکن کمزور معیشت کے حامل اور مقروض پاکستان کے لیے بھارت کے ساتھ تجارت بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے اور یہ اس کی معیشت کے لیے اچھا شگون ہوگا۔ تاہم دونوں ملکوں کے درمیان وسیع پیمانے پر ہونے والی اسمگلنگ سے مستفید ہونے والے افراد اور ادارے باقاعدہ تجارت کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔

6۔ سرکریک: پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک اور سرحدی تنازعہ پاکستانی صوبہ سندھ اور بھارتی راجستھان کے درمیان 96 کلومیٹر طویل آبی گزرگاہ سرکریک کی حدبندی ہے جو سندھ کے ڈیلٹا سے گزرتے ہوئے بحرہند میں جا گرتی ہے۔ اس سے سمندری حدود ماہی گیری اور معدنی وسائل کی تقسیم کا

معاملہ متنازعہ ہو گیا ہے۔ سرکریک کا تعلق پاکستان اور بھارت کے درمیان رن کچھ کے سرحدی تنازعہ سے بھی ہے۔ ان دونوں سرحدی تنازعات کا پاکستان' بھارت اور اقوام متحدہ کے مقررکردہ سہ رکنی ٹریبونل نے 1968ء میں فیصلہ کر دیا۔ لیکن سرکریک کی حد بندی بعد میں پھر متنازعہ بن گئی۔ یہ بظاہر آسان مسئلہ بھی ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔

پاک بھارت تعلقات پر حالیہ تاریخ میں اُبھرنے والے عوامل دوررس اثرات اور مضمرات کے حامل ہیں جو درج ذیل ہیں۔

اوّل: 1998ء میں دونوں ملکوں کا ایٹمی صلاحیت حاصل کر لینا۔

دوم: 9/11 کے حملوں کی وجہ سے پاکستان' بھارت اور دوسری طاقتوں کی پالیسیوں میں تبدیلی۔

سوم: پاکستان میں اسلامی شدت پسند عناصر کا زور پکڑنا جس سے پاکستان خود اور اس کے ہمسایہ ممالک متاثر ہو رہے ہیں۔

چہارم: عوامی جمہوریہ چین کا سپر پاور کے طور پر منظرعام پر آنا اور اس کا کشمیر' سیاچن اور دریائی پانی کے تصفیے میں ممکنہ کردار۔

پنجم: پاکستان کی معاشی بدحالی اور دیوالیہ پن کا خطرہ۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان مذکورہ بالا تنازعات کو حل کرنے کی متعدد رسمی اور غیر رسمی کوششیں کی گئی ہیں جو سب کی سب المناک ناکامی سے دوچار ہوئی ہیں۔ پاکستان نے ان تنازعات کے حل کے لیے اقوام متحدہ اور عالمی طاقتوں مثلاً امریکا' برطانیہ اور روس کو مداخلت اور ثالثی کے لیے آمادہ کرنے کی متواتر کوششیں کی ہیں لیکن عالمی طاقتوں نے اولاً سرد جنگ کی وجہ سے کوئی توجہ نہ دی کیونکہ پاکستان اور بھارت مخالف اتحادوں میں شامل تھے۔ سرد جنگ کے بعد واحد عالمی طاقت نے اپنے تبدیل شدہ مقاصد اور مفادات کی وجہ سے لاتعلقی اختیار کیے رکھی۔ وزیراعظم نواز شریف نے 23 اکتوبر 2013ء کو صدر اوباما سے اپنی ملاقات میں ایک دفعہ پھر کشمیر کے مسئلے میں مداخلت کے لیے زور دیا لیکن انھوں نے بھارت کی مخالفت کی وجہ سے معذرت کر لی۔ اقوام متحدہ چونکہ عالمی طاقتوں کا پروردہ ادارہ ہے وہ اپنے طور پر عالمی تنازعات حل کرنے میں بانجھ پن کا شکار ہو چکا ہے۔ کشمیر اور فلسطین کے تنازعات اس کی واضح مثالیں ہیں۔ چونکہ پاکستان اور بھارت نے معاہدہ تاشقند کے تحت اپنے تنازعات باہمی گفت وشنید سے حل کرنے کا معاہدہ کر رکھا ہے اس لیے **بھارت ہر قسم کی تھرڈ پارٹی مداخلت یا مصالحت کو یکسر مسترد کرتا رہا ہے۔ لیکن باہمی مذاکرات سے کسی مسئلے کو حل کرنے پر بھی تیار نہیں۔** باہمی بداعتمادی اور خوف کا یہ عالم ہے کہ دونوں ملکوں میں حکومتی اور غیر حکومتی (ٹریک II) سطح پر مذاکرات کے کئی دور ہو چکے ہیں لیکن نتیجہ صفر۔ امن اور دوستی قائم کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش سابق بھارتی وزیراعظم واجپائی اور وزیراعظم میاں نواز شریف نے 1999ء میں کی جب بھارتی وزیراعظم دوستی بس پر لاہور آئے اور تمام تنازعات کو حل کرنے کا عندیہ دیا۔ لیکن اس کوشش کو پاکستانی جرنیل پرویز مشرف نے کارگل کی مہم جوئی کے ذریعے سبوتاژ کر دیا۔ گزشتہ چند برسوں سے پاکستان اور بھارت کے دو مؤقر اشاعتی اداروں جنگ گروپ اور ٹائمز آف انڈیا کے اشتراک سے امن کی آشا کے نام سے دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وفود کے تبادلے ہو رہے

ہیں لیکن حکومتی سطح پر ابھی تک برف نہیں پگھلی۔ اکثر ایسی کوششوں کو بارآور ہونے سے پہلے ہی دونوں ملکوں کی فوج یا انتہا پسند گروپ ناکام بنا دیتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے سخت اور غیر مصالحانہ رویوں سے تھک ہار کر دوست ممالک نے بھی اپنی سفارتی کوششیں ترک کر دی ہیں۔ دونوں ایٹمی ملک ایک طرح کی سرد جنگ میں مصروف ہیں۔ یہ ایک المناک صورت حال ہے جو نہ صرف دونوں ممالک کے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان رقابت اور نفرت کئی نسلوں تک سفر کر چکی ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دشمنی دونوں ملکوں کی داخلی سیاست کی جڑوں میں اتر چکی ہے۔ یہ بیک وقت علاقائی بھی ہے، نظریاتی بھی۔ معاشرتی بھی ہے اور معاشی بھی ہے، اس کا تعلق انصاف اور لوگوں سے بھی ہے اور اقلیتوں سے بھی۔ یہ اس حد تک پہنچ چکی ہے جہاں سے واپسی ممکن نظر نہیں آتی۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت میں امن قائم کرنے اور دوستانہ تعلقات کو فروغ دینے کی کوششیں ناکام کیوں ہو رہی ہیں؟ اس کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ بھارتی حکومت اور اس کے دانشور کیا سوچ رہے ہیں۔ اسی طرح یہ جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ عالمی طاقتیں جنوبی ایشیا کے مستقبل کو کس نظر سے دیکھ رہی ہیں؟

بھارت اپنے رقبے، آبادی، عسکری طاقت اور سیاسی و معاشی استحکام کی بنیاد پر اپنے آپ کو نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کی ایک بڑی طاقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مستقبل میں سیکیورٹی کونسل کی مستقل ممبر شپ اس کا ایک اہم ہدف ہے۔ وہ چین کو اپنا اصل حریف سمجھتا ہے اور پاکستان کو صرف ایک کمزور لیکن خطرناک ہمسایہ سمجھتا ہے جو اپنے عدم استحکام سے اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بھارت اب امریکا کا عسکری اور ایٹمی حلیف بن چکا ہے اور دنیا میں بلند تر مرتبے کا خواہاں ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کو خطرناک چیلنجز کا سامنا ہے۔ بلوچستان میں باغیانہ کارروائیوں، شمالی علاقوں میں انتہا پسندوں کی تخریبی کارروائیوں اور کراچی میں لہو لہان امن و امان کی وجہ سے اس کی جغرافیائی اور سیاسی بقا کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ پاکستان عالمی اداروں کا مقروض، افراطِ زر اور شدید معاشی مشکلات کا شکار ہے۔ بدامنی، دہشت گردی اور پانی و توانائی بحران کی وجہ سے اس کا زرعی و صنعتی شعبہ جاں بلب ہے۔ سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر ہے۔ قرضے ادا کرنے کے لیے قرضے لیے جا رہے ہیں۔ فوج کی تعداد اور روایتی عسکری ساز و سامان کے اعتبار سے بھارت سے بہت پیچھے ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کی افواج کسی نہ کسی حوالے سے دونوں ملکوں کے درمیان نارمل تعلقات کے خلاف ہیں۔ اس وقت بھارتی حکومت اور پالیسی ساز پاکستان کے ساتھ کسی بڑے تصادم کے بغیر ''انتظار کرو اور دیکھو'' کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ ان کے خیال میں اگر پاکستان کی قیادت اپنے بحرانوں پر قابو پانے کے بعد کشمیر اور دوسرے تنازعات پر ان کے حسبِ منشا سمجھوتا کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے تو ٹھیک ورنہ وہ پاکستان کے بطور ریاست ناکام ہو جانے کا انتظار کریں گے۔ کیونکہ وہ عدم استحکام کا شکار ناکام ہوتی ہوئی ریاست سے کوئی معاہدہ کیوں کریں اور ایسے معاہدے کی افادیت کیا ہو گی؟ بھارتی حکومت کے کچھ عناصر گرتے ہوئے پاکستان کو ایک دھکا دینے کے بھی حامی ہیں۔ اسی لیے وہ دونوں ملکوں میں تجارت کی بحالی کے بھی خلاف ہیں کہ اس طرح پاکستان کی ناتواں معیشت

کو سہارا مل جائے گا۔ ان کے نزدیک پاکستان آئندہ پانچ سال یا کچھ زیادہ عرصہ قائم رہ سکتا ہے۔ ان کے لیے فوائد اٹھانے کا وقت اس کے بعد آئے گا۔ ان میں سے کچھ یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ پاکستان دوبارہ بھارت میں شامل ہو جائے گا۔ اس کے مقابلے میں بہت سے بھارتی یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ پاکستان ایک ایٹمی طاقت ہے اور اس کے سقوط کی صورت میں اسلامی شدت پسند غالب آ سکتے ہیں جو بھارت کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوں گے اور اس میں چین کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے بھارت کو چاہیے کہ وہ پاکستان کے ساتھ کشمیر اور دوسرے تنازعات کو حل کرے اور پرامن بقائے باہمی کے لیے پاکستان کی مدد کرے تاکہ یہ خطہ کسی ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ نارمل تعلقات بھارت کے بھی اتنے ہی مفاد میں ہیں جتنے پاکستان کے، کیونکہ ایک مخالف پاکستان کے ساتھ وہ ایشیا اور دنیا میں اپنا عظیم تر رول ادا نہیں کر سکے گا۔ کشمیر کے معاملے میں بھارتی حکومت کے سخت موقف، اقوام متحدہ اور عالمی طاقتوں کے رویے اور پاکستان کی سفارتی ناکامی کو مدنظر رکھتے ہوئے استصواب رائے کا انعقاد دور از امکان ہے۔ ایک ممکنہ سمجھوتہ جس پر تمام فریقوں کا کم و بیش اتفاق ہو سکتا ہے یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت موجودہ لائن آف کنٹرول کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیں جب کہ دونوں طرف کے کشمیریوں کے لیے اس کو نرم سرحد (Soft Border) بنا دیا جائے۔

جہاں تک جنوبی ایشیا کے بارے میں امریکا کی تازہ پالیسی کا تعلق ہے وہ یوں ہے کہ روس کے زوال اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا کے لیے ''ایٹمی عدم پھیلاؤ'' خارجہ پالیسی کا اہم اصول بن چکا ہے۔ 1998ء میں پاکستان اور بھارت دونوں نے ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی تو امریکا نے اس بات پر زور دیا کہ دونوں ملک ایٹمی ہتھیار کو ''جارحیت سے بچاؤ'' کے طور پر سنبھال لیں اور ایک باہمی نظام وضع کریں جو اس کے حادثاتی یا غلط استعمال کو روک سکے۔ اگرچہ امریکا، پاکستان اور بھارت کے بارے میں انفرادی پالیسی پر کاربند ہے لیکن وہ دونوں ملکوں کے نارمل تعلقات میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بھارت بلکہ پورا جنوبی ایشیا چین کے توسیعی ارادوں کے راستے میں دیوار بن جائے۔ امریکا پاکستان کو آئندہ سالوں میں ایک مستحکم جمہوری ملک دیکھنا چاہتا ہے تاکہ چین کے خلاف ایک مضبوط جمہوری بلاک وجود میں آ سکے۔ وہ چاہتا ہے کہ پاکستان اور بھارت باہمی مذاکرات سے اپنے تنازعات کو حل کریں لیکن اس میں مداخلت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کی بڑی وجہ بھارت کی مزاحمت اور ناپسندیدگی ہے۔ امریکا چاہتا ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں افغانستان کے استحکام اور امن میں مل کر کردار ادا کریں کیونکہ اسے 2014ء میں افغانستان سے امریکی اور نیٹو افواج کی واپسی اور اس کے بعد دونوں ملکوں اور خصوصاً پاکستان کے تعاون کی بے حد ضرورت ہے۔ امریکا چاہتا ہے کہ دونوں ملک کشمیر میں لائن آف کنٹرول کا فی الحال بین الاقوامی سرحد کے طور پر احترام کریں اور دونوں طرف حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں کو روکیں۔ اس کے بدلے میں امریکا دونوں ریاستوں کے ساتھ اپنا تعاون جاری رکھے گا اور علاقائی اقتصادی تعاون کے معاہدے کو یقینی بنائے گا۔ البتہ دونوں ہمسایہ ریاستوں کے درمیان خوشگوار تعلقات اور تعاون کو بڑھانے کا دارومدار خود انہی پر ہوگا۔

غذا نے ذیابیطس ختم کر ڈالا

بہت ممکن ہے آپ کو دوا کی بجائے غذا سے فائدہ ہو جائے

سین جبیں

یہ فروری 2012ء کی بات ہے، مشہور برطانوی اخبار ''گارڈین'' سے وابستہ پچاس سالہ صحافی رچرڈ ڈاوٹی (Richard Doughty) اپنا طبی معاینہ کرانے ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ اس کا وزن کچھ زیادہ تھا لیکن مجموعی طور پر رچرڈ نے خود کو فٹ رکھا ہوا تھا۔

وہ باقاعدگی سے کرکٹ کھیلتا اور شراب کو کبھی منہ نہ لگاتا۔ خود کو تندرست سمجھنے کے باعث ہی جب ڈاکٹر نے رچرڈ کو بتایا کہ وہ ذیابیطس قسم 2 میں مبتلا ہو چکا، تو وہ حیران رہ گیا۔

ڈاکٹر نے پھر اس موذی بیماری سے متعلق جو نکات بیان کیے، وہ سن کر رچرڈ خوفزدہ ہو گیا۔ مثلاً اگلے دس سال میں ممکن تھا کہ اسے انسولین لگوانی پڑے۔ بیماری اس کی آنکھوں، پیروں، کانوں اور دل کو متاثر کر سکتی تھی۔ نیز یہ کہ اس کے جلد مرنے کا امکان ہو چلا تھا۔ تاہم آخر میں ڈاکٹر نے ایک خوش خبری سنا کر رچرڈ کا خوف قدرے کم کر دیا۔

دراصل رچرڈ زیادہ فربہ نہیں تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ وہ چاہے، تو غذا کے ذریعے اپنا علاج کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ادویہ کے بجائے غذا سے اسے تندرستی مل جائے اور وہ ذیابیطس قسم 2 سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب رہے۔

ذیابیطس کی دو اقسام ہیں۔ اوّل قسم میں ہمارا جسم

انسولین ہارمون پیدا ہی نہیں کرتا جو ہمارے خون میں شکر کی سطح کنٹرول کرنے کا ذمے دار ہے۔ قسم دوم میں انسولین بہت کم جنم لیتا ہے۔ اس لیے وہ بھی اپنا کام مؤثر طور پر انجام نہیں دے پاتا۔ دونوں اقسام کے مریضوں میں جب شکر (یا گلوکوز) کی سطح بڑھ جائے، تو وہ اندرونی اعضا کو نقصان پہنچاتی ہے۔

رچرڈ نے جب سنا کہ غذا سے علاج ممکن ہے تو وہ انٹرنیٹ میں تحقیق کرنے لگا۔ مدعا یہ تھا کہ ایسا غذائی چارٹ ڈھونڈ سکے جس پر عمل کرنا آسان ہو۔ آخر اسے نیوکاسل یونیورسٹی سے وابستہ پروفیسر رائے ٹیلر کا علم ہوا۔

پروفیسر ٹیلر نے ذیابیطس قسم 2 میں مبتلا ایسے مرد و زن کے لیے ایک غذائی چارٹ ترتیب دیا تھا جو ادویہ سے دور رہنا چاہتے ہوں۔ اس چارٹ کے تحت آٹھ ہفتوں تک روزانہ صرف 800 حراروں پر مشتمل غذا کھانا تھی۔ یاد رہے، ایک صحت مند بالغ انسان عموماً 2000 تا 2500 حراروں پر مبنی غذا کھاتا ہے۔

رچرڈ نے اپنے ڈاکٹر کی راہنمائی میں اس غذائی چارٹ پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے گلوکوز ٹیسٹ کرنے والا آلہ خرید لیا تاکہ گھر پر ہی دوران تجربہ وہ اپنے خون میں شکر کی سطح بھی چیک کرتا رہے۔

غذائی شیڈول بڑا سخت تھا..... رچرڈ کو روزانہ تین لیٹر پانی نوش کرنا تھا۔ حراروں پر مبنی یخنیاں (سوپ) اور شیک پینے تھے۔ جبکہ 200 حرارے سبزیوں و پھلوں سے پانے تھے۔ ساتھ ساتھ اس نے ورزش بھی کرنا تھی تاکہ شیڈول کا بھرپور فائدہ حاصل ہو سکے۔

جب انسانی جسم کو مطلوبہ مقدار میں کھانا نہ ملے، تو وہ توانائی حاصل کرنے کی خاطر چکنائی کے اپنے ذخائر استعمال کرتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اعضا کے اندر جمع چربی استعمال ہوتی ہے۔

بہتر ہے زہر پی لو!

''حجاج بن یوسف'' نے اپنے دور کے مشہور طبیب ''شعیب بن زید'' سے فرمائش کی کہ مجھے طب کی کچھ اچھی باتیں بتاؤ۔ طبیب نے کہا:

☆ گوشت صرف جوان جانور کا کھاؤ۔

☆ جب دوپہر کا کھانا کھاؤ تو تھوڑی دیر سو جاؤ اور شام کا کھانا کھا کر چلو چاہے تمھیں کانٹوں پر چلنا پڑے۔

☆ جب تک پیٹ کی پہلی غذا ہضم نہ کر لو دوسرا کھانا نہ کھاؤ، چاہے تمھیں 3 دن لگ جائیں۔

☆ جب تک بیت الخلاء نہ جاؤ سونے کے لیے بستر پر نہ جاؤ۔

☆ پھلوں کے نئے موسم میں پھل کھاؤ، موسم جانے لگے، تو پھل کھانا چھوڑ دو۔

☆ کھانا کھا کر پانی پینے سے بہتر ہے زہر پی لو، ورنہ کھانا ہی نہ کھاؤ۔ (واصف ملک۔ لاہور کینٹ)

پروفیسر ٹیلر کا خیال تھا کہ جب پتے کے آس پاس چربی جمع ہو جائے، تو وہ انسولین بنانا چھوڑ دیتا ہے۔ لہٰذا انسان کم غذا کھائے اور ورزش کرے تو پتے کی چربی گھل جاتی ہے۔ یوں وہ دوبارہ انسولین پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہی نظریہ سامنے رکھ کر پروفیسر موصوف نے اپنا غذائی شیڈول تشکیل دیا۔

ظاہر ہے شروع میں کھانے کے نئے چلن سے ہم آہنگ ہوتے ہوتے رچرڈ کو بڑی دشواری پیش آئی۔ تاہم جب کبھی اسے بھوک ستاتی وہ پانی پی کر اسے ختم کر ڈالتا۔ تیسرے دن اس کا وزن کم ہونے لگا۔ تاہم اس کے خون میں گلوکوز کی سطح 6 ایم ایم (ملی مولز) فی لیٹر سے زیادہ رہی۔ (یاد رہے ایک صحت مند انسان جو ذیابیطس کا مریض نہیں ہوتا، اس کے خون میں گلوکوز یا شکر کی زیادہ سے زیادہ مقدار 6 ایم ایم فی لیٹر رہتی ہے)

چوتھے دن رچرڈ نے دس گھنٹے فاقہ کیا۔ تب اس کے خون میں گلوکوز کی سطح 5.40 ایم ایم فی لیٹر ہو گئی۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ لیکن چھٹے دن وہ سردی محسوس کرنے لگا حالانکہ ماہ جون کا گرم مہینا چل رہا تھا۔ حتیٰ کہ اسے جیکٹ پہننی پڑی تاکہ سردی سے بچ سکے۔ اس عجیب مشکل کے باوجود رچرڈ کا وزن خاصی تیزی سے کم ہو رہا تھا۔

آٹھویں دن دفتر کے ساتھی اسے ''گم ہوتا آدمی'' کے خطاب سے پکارنے لگے۔ وزن کی کمی نے اسے دوسروں کی نگاہوں میں کمزور بنا دیا تھا۔ نویں دن قبض اس سے چمٹ گیا۔ تاہم مسہل دوا کے بروقت استعمال سے یہ موذی مرض جاتا رہا۔

ڈاکٹر کی ہدایت پر رچرڈ نے نویں دن یعنی آٹھ روز بعد معمول کا کھانا کھایا اور چاولوں کے ساتھ مچھلی اڑائی۔ اس نے مزید دو دن پروفیسر ٹیلر کے غذائی شیڈول پر عمل کیا اور پھر مضرصحت غذاؤں سے بچتے ہوئے معمول کا کھانا کھانے لگا۔

رچرڈ کو صرف دو ماہ انتظار کرنا پڑا، لیکن آخر اسے خوش خبری مل گئی۔ ڈاکٹر نے ٹیسٹ کیا، تو اس کے خون میں گلوکوز کی مقدار 5.1 ایم ایم فی لیٹر پائی گئی۔ یہ 6 کے عدد سے کافی نیچے تھی۔ چناں چہ ڈاکٹر نے خوش ہو کر اسے بتایا ''آپ ذیابیطس سے چھٹکارا پا چکے۔''

یوں رچرڈ نے صرف گیارہ دن ذیابیطس ختم کرنے والے غذائی شیڈول پر عمل کیا اور اس خطرناک بیماری سے پیچھا چھڑا لیا۔ تقریباً ایک سال گزر چکا، اس کے خون میں شکر کی سطح معمول پر ہے۔

رچرڈ ہی نہیں دیگر مرد و زن بھی محض غذائی شیڈول پر ثابت قدمی سے عمل کرنے پر ذیابیطس قسم 2 سے نجات پا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر 53 سالہ امریکی شہری، کارلوس سیروینٹس (Carlos Cervantes) کو لمبے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔

2011ء کے موسم بہار میں جب کارلوس ہارٹ اٹیک کا نشانہ بنا، تو وہ 120 کلو وزن رکھتا تھا۔ اس کی بینائی متاثر ہو چکی تھی اور گردے بھی کام کرنا چھوڑ رہے تھے۔ خدشہ تھا کہ اگر خون میں شکر کی سطح کنٹرول نہ ہوئی تو اس کا ایک پیر کاٹنا پڑے گا۔ حتیٰ کہ کارلوس کے کانوں میں پھپھوندی پیدا ہو گئی جو جسم میں شکر کی انتہائی بلند سطح کا نتیجہ تھا۔

انہی دنوں اس نے ٹی وی پر پروفیسر ٹیلر کے غذائی منصوبے کا پروگرام دیکھا۔ آخری چارہ کار کے طور پر کارلوس روزانہ صرف 600 حراروں والی غذا کھانے لگا۔ اس نے کاربوہائیڈریٹ اور چکنائی پر مبنی سارے کھانے ترک کر دیے۔ صرف سبزی، پھل اور روکھا گوشت کھانے لگا۔ دو ماہ میں اس کا وزن ''40 کلو'' کم ہو گیا۔ اٹھارہ ماہ بعد کارلوس کا ذیابیطس جاتا رہا اور اسے تندرستی نصیب ہوئی۔

اسی طرح 67 سالہ ہنری کول (Henry Cole) نے بھی 600 حراروں پر مبنی غذائی منصوبہ بنایا لیکن من پسند غذائیں کھائیں۔ نیز روزانہ ڈیڑھ لیٹر پانی پیتا رہا۔ اکثر وہ شام چھ بجے کھانا کھاتا۔ تین ماہ میں اس کا وزن 80 کلو سے 70 کلو رہ گیا۔ نیز خون میں شکر کی سطح بھی معمول پر آ گئی۔

دیگر سائنس دان اب اس غذائی طریق علاج پر مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ یہ تو ثابت ہو چکا کہ مخصوص غذائیں ذیابیطس قسم 2 کو مار بھگاتی ہیں۔ اس ضمن میں وہ مزید تجربات کرنا چاہتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر قارئین میں سے یا اُن کا کوئی عزیز ذیابیطس قسم 2 کا شکار ہے اور وہ بھی غذائی طریق علاج اپنانا چاہے، تو بہتر ہے کہ پہلے کسی ماہر غذائیات سے مشورہ کر لے۔ ممکن ہے دوا کے بجائے غذا ہی سے تندرستی مل جائے۔

ناصر کاظمی

لطیف محسوسات کے شاعر

محمد امتیاز احمد

(ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی)

ناصر کاظمی (1925-1974ء) جدیدیت کے اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ناصر کاظمی لطیف محسوسات کے شاعر ہیں اور یہ حسیات ان کے اندر ہی سے جنم لیتی اور باہر آکر دائرہ در دائرہ پھیل جاتی ہیں۔ یہ بہت ہی نازک ہیں انہیں ذرا سی خراش لگتی ہے، تو اچھل پڑتی ہیں اور شاعر کے باطن میں کہرام مچاتی ہیں اور شعری صورت میں مقلب ہونے کے لیے بے تاب ہوتی ہیں، ان حسیات کو ناصر کی صورت میں ایک ایسا شاعر میسر آیا ہے جس کے پاس ایک ایسا قالب، قلب کی صورت میں موجود ہے جو ان کا مکمل سانچہ ہے اس لیے اپنے اس انتخاب پہ وہ حیران بھی ہیں اور نازاں بھی۔ بے ساختگی، برجستگی اور کفایت لفظی کے باوجود بھی وہ خیال و موضوع کی تکمیلیت کا جادو جگاتے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ پلک جھپکنے میں ہم نے جیسے کئی درماندہ کہانیوں کو پڑھ ڈالا:

ترے آنے کا دھوکا سا رہا ہے
دیا سا رات بھر جلتا رہا ہے
گا رہا تھا کوئی درختوں میں
رات نیند آ گئی درختوں میں
کل جنھیں زندگی تھی راس بہت
آج دیکھا انہیں اُداس بہت

حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''ناصر کاظمی کی غزل کے لسانی برتاؤ کا ایک خاتمی اور امتیازی وصف اس کی برجستگی ہے۔ شعر کہتے ہوئے کہیں سے بھی یہ ظاہر نہیں ہو پاتا کہ وہ اپنی طبیعت پر دباؤ ڈال رہے ہیں یا کسی قسم کا جبر کرتے ہیں بلکہ ان کے اشعار خودرو پودوں کی طرح اُگتے ہیں اور فضا رنگ اور روشنی سے منور ہو جاتی ہے۔ یہ برجستگی اور آمد طبع شاعر کے

غیر معمولی گداز، رچاؤ اور انہماک کو ظاہر کرتی ہے۔''

ناصر روزمرہ کے عام فہم، سادہ اور سلیس الفاظ و انداز میں اپنا قصۂ درد بیان کرتے ہیں۔ مانوس اور بے تکلف زبان استعمال کرتے ہیں۔ سکہ بند اور مروجہ معنی ہونے کے باوجود نادیدہ امکانات کو روشن کرتے ہیں۔ علیم صبا نویدی کہتے ہیں کہ:

''مزاج کی برانگیختگی اور اضطراب کے عالم میں بھی سوچوں کی سنجیدگی اگر دیکھنی ہو، تو وہ ناصر کاظمی کی غزلوں میں دیکھ سکتے ہیں۔''

ناصر کی غزلیں منجھے ہوئے ذہن کی پیداوار ہیں جن میں شعری تہذیب کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ شعر اُنھیں نکھرے ہوئے گلدستے کی طرح حسین صورت میں مرتب دکھائی دیتے ہیں جو کہ شائستگی کا پیکر معلوم ہوتے ہیں۔

غزل بنیادی طور پر علامتی صنف سخن ہے کیونکہ اس میں ابہام و ایہام، رمزیت و ایمائیت کو بنیادی دخل ہے۔ خیال کا مختصر پیکر ہوتا ہے جس میں کہ پوری کہانی کو بیان کرنا ہوتا ہے اور اس میں بھی ردیف و قافیہ اپنی جگہ پہلے سے گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے حد درجہ اختصار، احتیاط اور کفایت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اسی لیے اس میں خیال کی سطح پر دھندلے دھندلے نقوش چھوڑنے پڑتے ہیں اور ان نقوش کی اشاریت ہی سے پورے منظر نامے تک رسائی کرنا ہوتی ہے۔ ناصر نے علامتوں کا فنکارانہ استعمال کیا ہے، ناقدین نے ان کے ہاں یاد، رات، شہر، گھر، پانی، ہوا، سفر، چاند، سناٹا، آواز اور دوسری علامتوں کا ذکر کیا ہے۔ سناٹا ناصر کے ہاں تخلیقی کرب کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ وہ اس تخلیقی کرب میں مبتلا ہو کر ذات کی معنی آفرینی اور تہ در تہ جہاں کا رخ کرتا ہے اور وہاں سے تاثیر کے جوہر نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

''اس کے کلام کی تاثیر کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ یہ کلام ذات کی تہوں سے ابھرا ہے، ذہن کے بالا خانے سے نازل نہیں ہوا۔''

وہی وقت کی قید ہے درمیان
وہی منزلیں وہی فاصلے

ہجرت کے واقعے نے ان کی سانگی کو شدت سے جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ فسادات میں ناصر کے ساتھ بڑا سانحہ یہ ہوا کہ اس کے سب دوست احباب بچھڑ گئے جو اس کی متاع عزیز تھے۔ دوستوں سے بچھڑنے کا سب سے زیادہ کرب و غم ناصر اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے محسوس کیا ہے۔ ان کے بچھڑ جانے کے بعد زندگی ایک لاسمتی، لامقصدیت اور بے معنویت کا شکار ہو گئی۔ نقوش رفتگاں جب آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں، تو دل کے جذبات و احساسات میں ارتعاش پیدا ہونے لگتا ہے اور دل کے تار درد کے ساز چھیڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ''اے دوست'' کا تخاطب ان کے اکثر اشعار میں ملتا ہے اور اس تخاطب و آواز میں اداسی کی دبیز لہریں چھپی ہوئی ہوتی ہیں اور جیسے ہی وہ آواز دیتے ہیں ''اے دوست'' تو وہ تمام نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہ سارا کرب، دکھ، درد اور ہجر جو اس سے وابستہ ہے قاری پر عیاں یا کہنے دیجیے، مسلط ہوتا ہے:

کہاں ہے تو کہ تیرے انتظار میں اے دوست
اگرچہ دل تیری منزل نہ بن سکا اے دوست

ناصر کاظمی کی غزل نوسٹلجیا کی اچھی مثال کہی جاتی

ہے، اپنے ہم عصروں میں اثر انگیز، منفرد، پرسوز اور دردمند دل کی آواز ہے۔ ہجرت کے المیے میں ان کو میر کی بازگشت سنائی دی۔ انہوں نے ہجرت کو عمرانی معنی پہنا دیے۔ 48ء کے فسادات کے نتیجے میں ان کی غزل میں احتجاج اور غم و غصہ کی اونچی لے پائی جاتی ہے۔ اجڑتے شہر، جلتے گھر، لٹتی عصمتیں اور دلدوز چیخوں کے منظر نامے سے ان کی شاعری مرتب ہوئی ہے ''برگ نے'' کی غزل کا یہ شعر:

؎ شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

اُن کے شعری سفر کے بہت سے راز افشا کرتا ہے۔ اس غزل میں اُن کے موضوعات اور خیالات کے دھارے کا رخ معلوم ہوتا ہے، اُن کے شاعرانہ غم اور کرب کی بنیاد کا پتا چلتا ہے جس کی تفسیر و تشریح ان کی شاعری ہے۔ یہ غزل:

؎ گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اجڑی ایسا پھیلا سوگ

مذکورہ غزل کی دوسری کڑی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ بہت سارے اشعار اس سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں اور وہ ان کو ڈراما کی طرح Episodes میں پیش کرتے ہیں۔

گو کہ شخصی واردات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اجتماعی اضطراب کی عکاسی کرنے میں بھی ان کو ہنرمندانہ سلیقہ آتا ہے۔ مگر اس میں شور شرابا اور خون خرابا ان کے اعصاب پر حاوی نہیں ہوا ہے اور نہ ہی وہ اس کو جذباتیت کی رو میں بہا دیتے ہیں بلکہ اس کو اپنی تخلیق کی آنچ سے پگھلا کر موم کرکے شائستگی کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ بقول شمیم حنفی ان کی شاعری پیغام، عقیدے، نظریے اور حکمت سے عاری ہے مگر یہ مہذب انسان کی شاعری ہے۔

؎ اے ہم سخن وقت کا تقاضا ہے اب یہی
میں اپنے ہاتھ کاٹ لوں تو اپنے ہونٹ سی

اس کے سب زخم ہرے ہیں اور ذرا سے ٹکراؤ سے درد کی شدتیں جنم لیتی ہیں:

؎ ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ

ناصر کو بھی اپنے گمشدہ ماضی کی تلاش ہے:

ع کہاں کھو گیا مرا قافلہ کہاں رہ گئے مرے ہم سفر

''یاد وہ کلید ہے جس سے ہر رات ناصر اپنے سُونے مکان کے زنگ آلود تالے کو کھولتا ہے۔''

اگر یاد کی قوت ناصر کا ساتھ نہ دیتی، تو اس کا تن ہی نہیں من بھی کسی خستہ حال مشین کی طرح ہکلانے لگتا اور وہ شعر کہنے کی سکت ہی سے محروم ہو جاتا....

؎ پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے
دلِ ویران میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں داغ میں گل کے

وزیر آغا اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''برگ نے'' تو یادوں کا ایک ذخیرہ ہے جس میں طرح طرح کے واقعات، حادثات، ہجر، ملال، تنہائیاں، اُداسیاں، افسردگی، سونی راتیں، پت جھڑ، گل، گلشن، دوست، احباب سب ہی جمع ہیں اور سب آپس میں چہ میگوئیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

اپنا آبائی مسکن انبالہ اُن کی یادوں کا مسکن ہے:

؎ انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

؎ اے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا
لایا ہوں اس خرابے میں لعل مدفنی

لاہور کتنا ہی شہروں کا شہر نہ کہلائے مگر اپنے آبائی وطن سے انسان کو ایک فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ خارجی اور شعوری طور پر تو انسان دوسری جگہ بس جاتا ہے مگر داخلی اور لاشعوری طور پر وہ اپنے اسی گھر میں ہوتا ہے جہاں اس نے جنم لیا ہوتا ہے۔ جہاں اس نے اپنا بچپن بتایا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے خیالات کا دھارا اور تصور کا بہاؤ ہمیشہ اپنی جائے پیدائش کی طرف ہوتا ہے ایسی صورت حال میں یہ فطری سی بات ہے کہ انسان نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے اور وہ اس سے نجات پانے کے لیے اور ماضی میں مراجعت کرنے کے لیے تنہائی پسند کرتا ہے۔ جدیدیت میں ''تنہائی'' کا رجحان ناصر کی شاعری ہی سے پروان چڑھا اور اپنی مستحکم بنیاد بنانے میں کامیاب ہوا۔ ناصر نے بھی خود کو تنہائی کے جوکھم سے گزارا اور فرد کی تنہائی کو مختلف امیجز کے ذریعے اُجاگر کیا ہے۔ مثلاً درختوں، اینٹوں، گلیوں اور بارشوں وغیرہ سے۔ ایک انٹرویو میں پوچھے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے انتظار حسین کو کہتے ہیں:

''شاعر جو ہے وہ ساری انسانیت کے بارے میں سوچتا ہے۔ انسان جو بھی، جہاں بھی ہو، تخلیقی ہو سکتا ہے، اسے تخلیقی ہونا چاہیے، یہی اس کی معراج ہے، لیکن اس معراج کو پانے کے لیے اسے تنہائی کے جوکھم سے گزرنا پڑے گا۔'' ''برگ نے'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''ہمارے زمانے کا شاعر کئی اعتبار سے اکیلا ہے:

؎ تنہائی کا دکھ گہرا تھا
میں جنگل جنگل روتا تھا

اس غزل میں مطلع کے ایک شعر کے بعد ہر شعر میں تنہائی کا ذکر کیا ہے۔

''نشاط خواب، شہر غریب، نیا سفر، ان تین طویل نظموں کے علاوہ بارش کی دعا، گجرے پھولوں کے اور ساتواں رنگ''، مختصر نظمیں بھی ہیں۔ اس مجموعے میں وہ ایک ذمہ دار اور حساس فرد کی صورت میں سامنے آتے ہیں جس میں اُن کے دل میں مذہب اور اپنے وطن کی محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر جاتا ہے۔ انبالہ اُن کے لیے اب خوابوں کا شہر بن گیا اب اُن کی اولاد کا مسکن لاہور ہے۔ اب وہ کہہ اُٹھتے ہیں:

ع ''تو ہے میری زندگی اے میرے پیارے وطن''

انہوں نے غالب کے اشعار کی تضمین میں عمدہ نعت لکھی ہے۔ واقعی ناصر کو یہاں داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے اس کے لیے بہت ہی موزوں و مناسب غزل کا انتخاب کیا ہے:

؎ یہ کون طائر سدرہ سے ہم کلام آیا
جہانِ خاک کو پھر عرش کا سلام آیا
جبیں بھی سجدہ طلب ہے یہ کیا مقام آیا
زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زبان کے لیے

تھکی ہے فکر رسا اور مدح باقی ہے
قلم ہے آبلہ پا اور مدح باقی ہے
تمام عمر لکھا اور مدح باقی ہے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

دنیائے کرکٹ کا مردِ آہن

ہاشم آملہ

جو عمدہ کرکٹر ہی نہیں مثالی مسلمان بھی ہے

سید عاصم محمود

یہ نومبر 2004ء کی بات ہے کہ جنوبی افریقن کرکٹ بورڈ نے فیصلہ کیا، ہاشم آملہ کو قومی ٹیم میں شامل کیا جائے۔ یوں ہاشم آملہ جنوبی افریقن کرکٹ ٹیم کا حصہ بننے والے پہلے ہندوستانی نژاد مسلمان کھلاڑی بن گئے۔ ہاشم کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کیونکہ جنوبی افریقا میں ہزارہا نوجوان کرکٹ کھلاڑی سوتے جاگتے یہی خواب دیکھتے اور تمنا رکھتے ہیں کہ کسی بھی طرح قومی ٹیم میں شامل ہو جائیں۔

لیکن قومی ٹیم میں شامل ہوتے ہی نوجوان ہاشم کو ایک مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ شراب بنانے والی ایک کمپنی، کیسل(Castle) جنوبی افریقن ٹیم کی سپانسر تھی۔ لہٰذا ٹیم میں شامل تمام کھلاڑیوں پر لازم تھا کہ وہ اپنی ٹی شرٹس اور قمیصوں پر کمپنی کا لوگو یا نشان چسپاں کریں۔

ہاشم اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے نوجوان ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام میں شراب ممنوع ہے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے لباس پر کیسل کا نشان چسپاں کرانے سے انکار کر دیا۔ جنوبی افریقن کرکٹ بورڈ نے شروع میں انھیں ترغیب دی کہ پہلے ٹیسٹ میں نشان لگوا لو، پھر اس بابت کوئی فیصلہ کریں گے۔ مگر ہاشم نے انکار کر دیا۔ وہ پہلے ٹیسٹ سے قبل فیصد چاہتے تھے۔

اس وقت ہاشم کی عمر محض 21 سال تھی۔ انھوں نے بین الاقوامی کرکٹ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا، وہ محض بلے بازی کی خداداد صلاحیتیں رکھنے پر منتخب ہوئے تھے۔ دوسری طرف ان کا مقابلہ 102 سالہ بوڑھے جنوبی افریقین کرکٹ بورڈ سے تھا۔

ہاشم خوب جانتے تھے کہ اصرار پر انھیں قومی کرکٹ ٹیم سے نکالا بھی جا سکتا تھا۔ پھر بھی انھوں نے اپنے لباس پر نشان ثبت کرنے سے انکار کر دیا۔

آخر نوجوان مسلم کرکٹر کی دینی حمیت و استقامت کے سامنے جنوبی افریقن بورڈ ہی کو جھکنا پڑا۔ اس نے ہاشم کو مطلع کیا کہ نشان چسپاں نہ کرانے پر از روئے قانون انھیں 500 ڈالر (50 ہزار روپے) فی میچ جرمانہ دینا ہوگا۔ ہاشم نے بھاری بھرکم جرمانہ دینا قبول کر لیا، لیکن اپنے ایمان کو متزلزل کرنے والا کوئی سمجھوتا قبول نہیں کیا۔

یہ واقعہ ہاشم آملہ کی دینی حمیت اور کردار کی طاقت واضح کرتا ہے۔ آج مغربی معاشروں میں رہنے والے کئی مسلمان بیئر یا شراب پینے کو برا نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے، بھارت میں مسلمان اداکار شراب کے اشتہاروں میں کام کرتے اور کروڑوں روپے معاوضہ پاتے ہیں۔ پاکستانی کرکٹر وسیم اکرم نے بھی چند سال قبل ایک الکوحل بنانے والی کمپنی میں کام کیا تھا۔ اُس پر اُسے سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا تھا' مگر بے سُود۔ خیر سے ہمارے صدرِ مملکت آصف علی زرداری چینیوں کی خوشنودی کے لیے ام الخبائث پیتے پائے گئے۔

شراب پینے کی وجوہ کچھ بھی ہوں، یہ بات مسلّم ہے کہ دینِ اسلام میں اس کا پینا ممنوع ہے اور آزاد روی کے اس دور میں ایک مغربی ملک میں مقیم مسلمان بھی خمر سے دور رہنا چاہے، تو اپنی ایمانی طاقت کے بل پر رہ سکتا ہے۔ ہاشم آملہ اس بات کا زندہ ثبوت ہیں۔

ہاشم کی ایمانی قوت کا ایک اور ثبوت دیکھیے۔ کرکٹ سخت جان نوجوانوں کا کھیل ہے۔ سارا دن تیز دھوپ یا سخت سردی میں کھڑے رہنا جاں جوکھم کا کام ہے۔ گرمی ہو یا سردی، مشقت کے بعد پیاس ضرور لگتی ہے۔ لیکن ہاشم اپنے ملک میں ہوں یا بیرون ملک اور ماہ رمضان آ جائے تو ہر میچ کھیلتے ہوئے روزہ ضرور رکھتے ہیں کیونکہ یہ فرض ارکان اسلام میں شامل ہے۔

☆

جنوبی افریقا میں اسلام کا علم بلند کرنے والے ہاشم محمد آملہ 31 مارچ 1983ء کو ڈربن میں پیدا ہوئے۔ والدین ڈاکٹر ہیں۔ جبکہ اجداد بیسویں صدی کے اوائل میں بھارتی ریاست گجرات کے شہر سورت سے ہجرت کر کے جنوبی افریقا آئے تھے۔

ہاشم کے گھرانے میں ڈاکٹر اور انجینئر ہی جنم لیتے تھے۔ کیونکہ تب کرکٹ، ہاکی اور دیگر کھیلوں پر سفید فام اقلیت کی اجارہ داری تھی۔ ہاشم کی خوش قسمتی کہ جب انھوں نے شعور سنبھالا، تو عظیم راہنما، نیلسن منڈیلا ملک میں انقلاب لے آئے۔ سیاہ فام اکثریت اب جنوبی افریقا کی حاکم بن گئی اور اس پر عائد تمام پابندیاں جاتی رہیں۔

جب ہاشم دورِ لڑکپن میں داخل ہوئے، تو کئی سال کی پابندی کے بعد جنوبی افریقن کرکٹ ٹیم پھر عالمی مقابلوں میں حصہ لینے لگی۔ ہاشم کے والدین بھی میچ شوق سے دیکھتے۔ ماں باپ کی دیکھا دیکھی ہاشم بھی اس کھیل میں دلچسپی لینے لگے۔

1989ء میں ہاشم ڈربن ہائی اسکول میں تعلیم پانے لگے۔ اس اسکول میں بھی کرکٹ کا خاصا چرچا تھا۔ جنوبی افریقا کے معروف کرکٹ کھلاڑیوں، بیری رچرڈز اور لانس کلوزنر نے اسی اسکول میں تعلیم پائی۔ ہاشم اسکول ہی میں تھے کہ فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے لگے اور جلد ہی صوبہ نٹال کے نمایاں بلے باز بن گئے۔

1999ء میں ہاشم صوبہ نٹال کی صوبائی کرکٹ ٹیم

(کاوازولونال ڈولفنز) کا حصہ بن گئے۔ مسلسل اچھی کارکردگی دکھائی، لہٰذا ہاشم کو جنوبی افریقا کی انڈر 19 ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا۔ 2002ء میں انڈر 19 ورلڈ کپ کھیلا گیا۔ اس میں ہاشم اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے ذریعے ٹیم کو فائنل تک لے گئے۔

ہاشم کا عمدہ کھیل دیکھ کر آخر جنوبی افریقن کرکٹ بورڈ نے انھیں 2004ء میں بھارت جانے والی قومی ٹیم میں شامل کر لیا۔ یوں انھیں جنوبی افریقن ٹیم کا حصہ بننے والے پہلے مسلمان کھلاڑی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

عالمی کرکٹ میں ہاشم کا آغاز عمدہ نہ رہا۔ انھوں نے 24 نومبر 2004ء کو کلکتہ میں بھارت کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلا۔ میچ کی دونوں اننگز میں وہ صرف 26 رن بنا پائے۔ اگلا میچ 26 دسمبر کو ڈربن میں برطانیہ کے خلاف کھیلا۔ ہاشم نے دونوں اننگز میں صرف ایک رن بنایا۔

اس مایوس کن کارکردگی کے بعد ہاشم کو قومی ٹیم سے نکال دیا گیا۔ ہاشم پر بنیادی تنقید یہ ہوئی کہ ان کی بلے بازی کا اسٹائل درست نہیں۔ انھوں نے تنقید خندہ پیشانی سے سہی اور واپس مقامی کرکٹ میں پہنچ کر اپنا کھیلنے کا انداز درست کرنے لگے۔

دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی کھلاڑی اولین ٹیسٹوں میں بہتر کارکردگی نہ دکھا سکے، تو عموماً ٹیم سے نکل کر گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو جاتا ہے۔ مگر ہاشم نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمت نہ ہاری اور اپنے کھیل کو مسلسل ترقی دیتے رہے۔ چناں چہ بارہ ماہ کے دوران انھوں نے مقامی کرکٹ میں چار سنچریاں دے ماریں اور سب سے زیادہ رنز بنائے۔

غزل

ہم جفاکشوں کا پیام ڈھونڈتے رہے
صفِ دشمناں سے سلام ڈھونڈتے رہے
اگرچہ مضطرب رہے ہر پل مگر!
بیزاری میں بھی آرام ڈھونڈتے رہے
نالہ ہو یا شہنائی، کہیں نوحہ کناں ہو کوئی
ہم شوقِ تماشا میں نظارۂ عام ڈھونڈتے رہے
ہیں تو آوارہ مزاج، بے دھیانی میں مگر
پناہ گزیں ہو جہاں درد وہ در و بام ڈھونڈتے رہے
رخِ ماہتاب پہ جب اتر آئے شفق
پسِ آفتاب وہ شام ڈھونڈتے رہے
پھینک کر پتھر سطحِ آب پر ہم
بھنور میں پھر کوئی نام ڈھونڈتے رہے
دیوانگی ہمیں راس آئی ہی نہیں سحر
مدہوشی میں بھی رہے دھیان، وہ جام ڈھونڈتے رہے
(شاعر: سحر جالب)

مقامی کرکٹ میں عمدہ کارکردگی نے جنوبی افریقن بورڈ کو پھر مجبور کر دیا کہ وہ دوبارہ 14 ماہ بعد ہاشم کو قومی ٹیم کا حصہ بنائے۔ یوں ہاشم نے 27 اپریل 2005ء کو اپنا پانچواں ٹیسٹ جوہانس برگ میں نیوزی لینڈ کے خلاف کھیلا۔ اس بار ہاشم اپنے جوبن پر نظر آئے اور انھوں نے پہلی اننگ میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے 149 رنز بنائے۔

پھر ہاشم نے اپنی کارکردگی میں تسلسل رکھا اور اگلے نو ٹیسٹ میچوں میں 1599 رنز بنا ڈالے۔ انھوں نے 19 جون 2007ء کو پورٹ ایلزبتھ میں پاکستان کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلا اور اس کی دونوں اننگز میں بالترتیب 71 اور 64 رنز بنائے۔ یوں قومی ٹیم میں تیسری

پوزیشن پہ جگہ مستحکم کر لی۔

2012ء کا سال ہاشم کے لیے دو خوش خبریاں لایا۔ سب سے پہلے جولائی 2012ء میں انھوں نے اوول (لندن) میں انگریز بالروں کی خوب دھنائی کی اور 311 رنز بنائے۔ یہ کسی جنوبی افریقن بلے باز کی پہلی ٹرپل سنچری تھی۔

اگست میں ہاشم کو ایک روزہ عالمی کرکٹ میں کم سے کم اننگز میں تین ہزار رنز بنانے کا منفرد اعزاز حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنے 59ویں ایک روزہ میچ میں صرف 57 اننگز کھیل کر یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ یوں انھوں نے ویسٹ انڈیز کے ممتاز کھلاڑی ویوین رچرڈز کا 28 سالہ ریکارڈ توڑ ڈالا۔ رچرڈز نے 1989ء میں 74ویں میچ میں 69 اننگز کھیل کر تین ہزار رنز بنائے تھے۔ اس شعبے میں سب سے اوپر پاکستانی کھلاڑی انضمام الحق تھے، جنھوں نے 1995ء میں اپنے 90ویں میچ میں 87 اننگز کھیل کر تین ہزار رنز بنائے تھے۔

اسی طرح 2013ء بھی ہاشم کے لیے خوشیوں کے دو سندیسے لایا۔ ماہ فروری میں ٹیسٹ کرکٹ اور ایک روزہ کرکٹ میں انھیں نمبر ایک کھلاڑی بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس سے قبل یہ ریکارڈ 2007ء میں صرف آسٹریلوی کھلاڑی رکی پونٹنگ نے بنایا تھا۔

پھر 17 مارچ کو جوہانس برگ میں جنوبی افریقا نے پاکستانی ٹیم کے خلاف ایک روزہ میچ کھیلا۔ اس میں ہاشم اور ڈی ویلیرز نے تیسری وکٹ کی شراکت میں 238 رنز بنائے۔ یہ ایک روزہ کرکٹ میں تیسری وکٹ کی شراکت کا عالمی ریکارڈ ہے۔

ناخوشگوار واقعہ

ایک سچے مسلمان کے مانند ہاشم آملہ دوسروں کی غلطیاں کھلے دل سے معاف کر دیتے ہیں۔ 7 اگست 2006ء کو سری لنکا اور جنوبی افریقا کے مابین ٹیسٹ جاری تھا۔ مشہور ٹی وی چینل، ٹین سپورٹس سے سابق آسٹریلوی کھلاڑی ڈین جونز میچ پر رواں تبصرہ کر رہا تھا۔ اچانک ہاشم نے ایک سری لنکن کھلاڑی کا کیچ پکڑ کر اُسے آوٹ کر دیا۔

ڈین جونز یہ دیکھ کر بولا ''ٹیررسٹ (دہشت گرد) نے کیچ پکڑ لیا۔'' یہ جملہ ٹی وی پر جنوبی افریقا سمیت پوری دنیا میں سنا گیا۔ سبھی لوگوں نے اس کا برا منایا اور پوری جنوبی افریقن ٹیم نے ہاشم کا ساتھ دیا اور اِس جملے کی مذمت کی۔ بعدازاں جونز نے بہانہ بنایا کہ وہ سمجھا، مائک بند ہے۔ پھر اُس نے ہاشم سے معذرت بھی کی اور ہاشم نے اُسے معاف کر دیا۔

ہاشم آملہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کبھی بھارت کے آئی پی ایل ٹورنامنٹ میں شریک نہیں ہوئے۔ وجہ یہ ہے کہ اس ٹورنامنٹ میں فحاشی کا دور دورہ ہے۔ کھلے عام مخلوط پارٹیوں میں شراب پی جاتی ہے۔ وقت نے بھی ان کا فیصلہ درست ثابت کیا۔ کسی زمانے میں بھارت کا یہ مایہ ناز ٹورنامنٹ تھا، مگر اب پیسے کی ہوس میں لتھڑ چکا۔ آئی پی ایل نے کرکٹ کے کھیل کو کیا بہتر بنانا تھا، بلکہ لوگوں کو اس سے متنفر کر دیا۔

فی الوقت ہاشم 71 ٹیسٹ کھیل کر 5913 رنز بنا چکے ہیں۔ یوں ان کی اوسط 52.32 فیصد بنتی ہے۔ جبکہ 76 ایک روزہ عالمی مقابلے کھیل کر انھوں نے 3675 رنز بنائے ہیں۔ اسی شعبے میں ہاشم کی اوسط 51.98 فیصد ہے۔

○○○

یومِ قائداعظم

قائد کی دو نایاب تقاریر کی ریکارڈنگ

آل انڈیا ریڈیو نے دینے سے کیوں انکار کر دیا؟

لئیق احمد

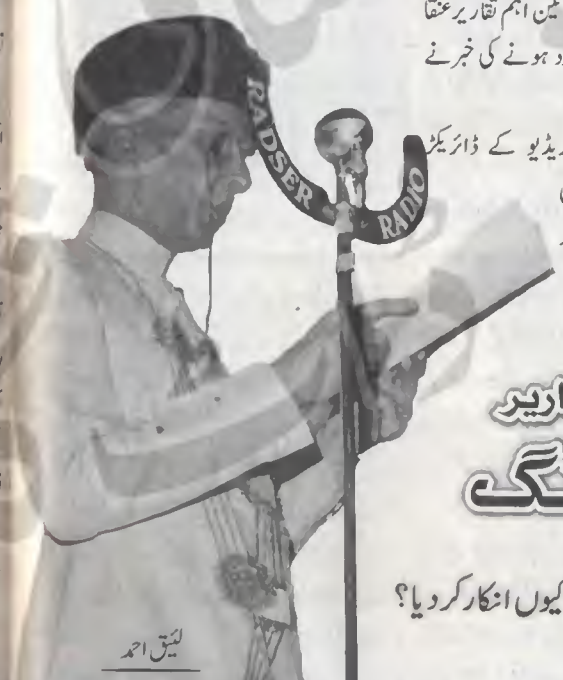

نومبر 2011ء کی بات ہے، پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے ڈائریکٹر جنرل، مرتضیٰ سولنگی نے بھارت کا دورہ کیا۔ وہ بھارتی دارالحکومت، نئی دہلی میں واقع آل انڈیا ریڈیو کے صدر دفتر بھی گئے۔ وہیں ان پر انکشاف ہوا کہ بانیٔ پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کی ایک مشہور تقریر کی ریکارڈنگ دفتر میں محفوظ ہے۔ 11 اگست 1947ء کو پہلی آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں قائد نے یہ تقریر فرمائی تھی۔

یاد رہے، قائداعظم کی تمام اہم تقاریر کی اصل اور نقل شدہ ریکارڈنگز ریڈیو پاکستان کے پاس محفوظ ہیں۔ مگر اس نایاب ذخیرے میں تین اہم تقاریر عنقا تھیں۔ اسی لیے ریکارڈنگ موجود ہونے کی خبر نے مرتضیٰ سولنگی کو چونکا دیا۔

پھر انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل، لیلادھر منڈولی سے زبانی درخواست کی کہ مذکورہ بالا تقریر ڈھونڈ کر ریڈیو پاکستان کو عنایت کی جائے۔ لیلادھر نے ہامی بھر لی۔ سولنگی صاحب پاکستان چلے آئے۔

لیکن چار ماہ گزر گئے، پڑوس سے کوئی جواب نہ آیا۔ اُدھر مرتضیٰ سولنگی تقریر کی ریکارڈنگ حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ کیونکہ 11 اگست والی تقریر میں قائد نے مستقبل کے پاکستان کا وژن پیش کیا تھا اور آج بھی اکثر اس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ چناں چہ 29 مارچ 2013ء کو انھوں نے ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کے نام سرکاری خط لکھ کر باقاعدہ طور پر تقریر کی ریکارڈنگ طلب کر لی۔

بھارت کی بیوروکریسی سست روی میں عالمی شہرت رکھتی ہے۔ لہٰذا معاملہ کچھوے کی چال سے آگے بڑھا۔ خدا خدا کر کے آل انڈیا ریڈیو سے جواب آیا کہ اس کے ذخیرہ ریکارڈنگ میں 11 اگست والی تقریر موجود نہیں، تاہم جناح صاحب کی دو دیگر تقاریر کی ''ماسٹر ریکارڈنگ'' مل گئی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ وہی بقیہ تقاریر تھیں جن کی ریڈیو پاکستان کے پاس ریکارڈنگ موجود نہیں۔

پہلی تقریر انتقال اقتدار کا منصوبہ جاری ہونے کے بعد 3 جون 1947ء کو کی گئی۔ اسی تقریر کے آخر میں قائداعظم نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگایا جو لکھے متن میں درج نہ تھا۔ یوں آل انڈیا ریڈیو سے پہلی بار کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن جانے والا نعرہ نشر ہوا۔

قائد نے دوسری تقریر 14 اگست کو آئین ساز اسمبلی کے اختتامی اجلاس میں کی۔ یہ بھی نئی مملکت کے خدوخال، عزائم اور راہ میں حائل دشواریاں واضح کرتی ہے۔

ریڈیو پاکستان کے پاس درج بالا دونوں اہم تقاریر کی نقل شدہ ریکارڈنگ موجود تھی۔ لہٰذا آل انڈیا ریڈیو کو پھر خط لکھ کر درخواست کی گئی کہ براہِ مہربانی ان تقاریر کی ماسٹر ریکارڈنگ ہی بھجوا دیجیے۔ لیکن یہ معاملہ بھی بھارتی بیوروکریسی و حکومت کے لیے پہاڑ میں مثل فرہاد نہر کھودنے کے مترادف بن گیا۔

پہلے تو سرکاری میڈیا کو کنٹرول کرنے والے خود مختار ادارے، پرسار بھارتی نے تقاریر پاکستان کو دینے سے انکار کر دیا۔ تب یہ معاملہ ''معلومات جاننے کے حق'' (Right to Information) سے متعلق مشہور

اختصاریے

☆ صرف آرام اور امن کی خواہش نادانی ہے..... آرام کو دوام کیسے حاصل ہو..... اور امن کو استحکام کیسے ملے۔ فکر و عمل کا اصل بنیاد یہ ہے۔

☆ وہ تعلیم جس کی بنیاد محض قیاس، گمان، وہم یا خواہش پر ہے قابلِ ذکر اور قابلِ عمل نہیں۔

☆ انصاف کرنا اور نصیحت و راہنمائی کرنا بزرگی کی علامت ہے۔

☆ اطاعت گزاری، یکسوئی اختیار کرنے والوں اور شکر کرنے والوں کو اللہ بڑے کاموں کے لیے منتخب کرتا ہے۔ (مراسلہ: عاصمہ غنی)

بھارتی راہنما، سبھاش چندر اگروال نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

انھوں نے سنٹرل انفارمیشن کمیشن میں یہ درخواست دائر کر دی: ''جو ہندوستانی راہنما پاکستان چلے گئے ہیں، ان کی تقاریر منظرِ عام پر لائی جائیں۔'' ان میں قائداعظم کی وہ سب تقاریر بھی شامل تھیں جو آل انڈیا ریڈیو نے ریکارڈ کی تھیں۔

اب پھر بھارتی بیوروکریسی میں دھینگا مُشتی شروع ہوگئی۔ یہ معاملہ دراصل دو سرکاری محکموں، وزارت اطلاعات اور وزارت خارجہ سے وابستہ تھا۔ وزارت خارجہ سے اس لیے کہ بھارت میں اب جناح صاحب ''غیر ملکی'' سمجھے جاتے ہیں۔ نیز پاک بھارت سے متعلق تمام معاملات کا آخری فیصلہ بھارتی وزارت خارجہ ہی میں ہوتا ہے۔

وزارت اطلاعات نے تو آخر ریکارڈنگ جاری

سبھاش چندر نے ہمت نہ ہاری۔ دراصل ایک خاص وجہ کے باعث وہ جناح صاحب کی تقاریر میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ بھارتی عوام وخواص کو دکھانا چاہتے تھے کہ قائداعظم ویسے نہیں تھے جیسا ان کی حکومت نے مشہور کر رکھا ہے..... وہ رواداری، تحمل اور محبت کرنے والے انسان تھے۔

آخر سبھاش چندر کی جدوجہد رنگ لائی اور ماہ جون 2013ء میں سنٹرل انفارمیشن کمیشن کے ایک بنچ نے فیصلہ دیا کہ چھیاسٹھ سالہ قدیم تقاریر کو خفیہ رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں لہٰذا انھیں منظر عام پہ لایا جائے۔ یوں سبھاش چندر اور ان کے ساتھیوں کا مؤقف درست ثابت ہوا۔ اس کے بعد ماہ اگست میں وزارت خارجہ نے 4 جون اور 14 اگست کی تقاریر جاری کرنے کا حکم دے دیا۔

کرنے کی ہدایات دے دیں، مگر معاملہ وزارت خارجہ میں اٹک گیا۔ دراصل 11 اور 14 اگست کی تقاریر قائد کو ایک روادار، امن پسند اور بے تعصب راہنما کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔ وہ دنیا والوں کو دکھاتی ہیں کہ بانیٔ پاکستان ذہنی وقلبی لحاظ سے بڑی وسعت کے مالک تھے۔

دوسری طرف ہر بھارتی حکومت کی شعوری کوشش ہوتی ہے کہ بانیٔ پاکستان کو تعصب پسند، ہندو دشمن اور انتہا پسند ثابت کیا جائے۔ چونکہ درج بالا دونوں تقاریر اس انداز فکر کی نفی کرتی ہیں، لہٰذا بھارتی وزارت خارجہ انھیں جاری کرنے سے احتراز برتتی رہی۔

واضح رہے، 1947ء میں موجودہ پاکستانی علاقے میں ایسا کوئی ریڈیو اسٹیشن موجود نہ تھا جو پوری باریکی و صفائی سے اہم ہندوستانی راہنماؤں کی تقاریر ریکارڈ کر سکتا۔ تب لاہور اور پشاور کے ریڈیو اسٹیشن "بی کلاس" میں آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم کی 11 اور 14 اگست کی تقاریر ریکارڈ کرنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو سے ٹیمیں بلائی گئی تھیں۔

11 اگست والی تقریر بی بی سی کی ایک ٹیم نے ریکارڈ کی۔ تاہم وہ اب اس کے ذخیرے میں دستیاب نہیں۔ ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر جنرل مرتضیٰ سولنگی کا خیال ہے کہ اس اہم تقریر کی ریکارڈنگ ہندو میموریل میوزیم و لائبریری، نئی دہلی میں محفوظ ہوگی۔ تاہم بھارتی حکومت بوجہ اُسے پاکستان کے حوالے نہیں کرنا چاہتی۔

یاد رہے، 11 اگست والی تقریر ہی نے 1945ء میں انتہا پسند ہندو جماعت، بھارتیہ جنتا پارٹی کے سربراہ، ایل کے ایڈوانی کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ انوکھا واقعہ قابل ذکر ہے۔

ہوا یہ کہ 2005ء میں ایل کے ایڈوانی نے پاکستان کا دورہ کیا۔ وہ بابائے قوم کو خراج عقیدت پیش کرنے مقبرہ قائداعظم بھی گئے۔ وہاں موصوف نے بانیٔ پاکستان کی کچھ یوں تحسین فرمائی:

''تاریخ میں کئی راہنما اَنمٹ نقوش ثبت کر چکے۔ لیکن چند ہی ہیں جن کے ہاتھوں تاریخ تخلیق ہوئی۔ انہی نایاب افراد میں قائداعظم محمد علی جناح بھی شامل ہیں۔ جب وہ نوجوان تھے، تو تحریک آزادی کی ممتاز راہنما، سروجنی نائیڈو نے انھیں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہہ کر پکارا تھا۔ انھوں نے 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے جو خطاب کیا، وہ کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ ایک سیکولر مملکت کی نوید سناتا ہے جہاں ہر شہری آزادی سے من پسند مذہب اختیار کر سکتا ہے۔ جہاں حکومت مذہب کی بنیاد پر شہریوں کے مابین تفریق نہیں کرتی۔ میں اس عظیم شخصیت کو پُرتعظیم نذرانہ عقیدت پیش کرتا ہوں.....''

یہ الفاظ لکھ کر موصوف بھارت واپس پہنچے، تو بھارتیہ جنتا پارٹی سمیت تمام انتہا پسند جماعتوں نے ایل کے ایڈوانی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ دراصل انتہا پسند ہندو تو قائداعظم ہی کو تقسیم ہند کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اعتدال پسند ہندوؤں کی حمایت کے باوجود ایڈوانی کو بی جے پی کی قیادت چھوڑنا پڑی۔

14 اگست کی تقریر

ذیل میں قائداعظم کی 14 اگست والی تقریر کا خلاصہ پیش خدمت ہے:

''میں شاہ برطانیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی اور میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

''ہماری سعی ہے کہ ہم پاکستان میں آباد تمام فرقوں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں۔ مجھے یقین ہے، ہر پاکستانی شہری ہمارے نظریۂ فلاحی خدمت سے تحریک حاصل کرے گا۔ وہ اتحاد و یگانگت کے ساتھ ایسی تمام سیاسی و شہری خصوصیات سے متصف ہوں گے جو ایک قوم کو عظیم بناتی ہے۔

''میں (انگریز) حکومت اور افواج میں شامل ان (غیر مسلم) مرد و زن کے جوش و جذبے کی قدر کرتا ہوں جنھوں نے بہ رضا و رغبت پاکستان کی رضاکارانہ خدمت کرنے کے لیے خود کو پیش کیا۔ ہم انھیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ان کے ساتھ تمام شہریوں کے مانند برابری کا سلوک کیا جائے گا۔''

''اکبر اعظم نے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور نیک نیتی کا جو سلوک کیا، وہ کوئی نئی بات نہیں۔ تیرہ صدیاں قبل جب نبی کریم ﷺ نے یہود و نصاریٰ کو مفتوح کیا، ان کے ساتھ زبانی نہیں عملی طور پر نہایت شاندار سلوک فرمایا۔''

''اس موقع پر آپ ﷺ نے کمال درجے کی رواداری کا مظاہرہ فرمایا اور ان کے ایمان و مذہب کی تعظیم فرمائی۔ مسلمانوں نے جہاں بھی حکمرانی کی، ان کا دور انہی انسان دوست اعمال اور عظیم اصولوں سے عبارت ہے۔ ہمیں بھی انہی اصولوں پر عمل کرنا اور ان کے مطابق چلنا ہوگا۔

''میں سبھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان اپنے پڑوسیوں اور دنیا کے سب ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔''

چیونگم کے "پانچ" خطرناک اجزا

سید عاصم محمود

بچے ہوں یا بڑے، سبھی میں چیونگم مقبول ہے۔ یہ ٹافی گولی کی ایسی عجیب قسم ہے جسے چبائے جاؤ مگر وہ ختم نہیں ہوتی اور پھر اس کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ مثلاً یہ بھوک مٹاتی، منہ کی بدبو ختم کرتی اور ٹینشن بھگاتی ہے۔

لیکن بعض غذاؤں کی طرح چیونگم کے فوائد کم ہیں، نقصان زیادہ۔ اور اب جدید علمی تحقیق نے یہ روح فرسا انکشاف کیا ہے کہ چیونگم میں شامل کم از کم پانچ اجزا (Ingredients) بچوں، بڑوں کو مختلف بیماریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ گویا کئی بار والدین اور معالج کو علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بیماری چیونگم کی پیدا کردہ ہے۔ اور وہ دیگر غذاؤں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔

تعلیم و شعور میں اضافے کے باعث دنیا بھر کے والدین اب بچوں کو گولیوں، ٹافیوں اور چیونگم سے دور رکھنے لگے ہیں۔ اس احتیاط کے پیچھے یہ خطرہ پوشیدہ ہے کہ ان اشیا کی مٹھاس بچوں کو نقصان پہنچائے گی۔ مگر اب انکشاف ہوا ہے کہ چیونگم شکر یا چینی ہی نہیں پانچ دیگر صحت دشمن اجزا کی بھی حامل ہے۔

چیونگم کے اجزا پر متفرق امریکی ڈاکٹر تحقیق کرتے رہے۔ جب تحقیق مکمل ہوئی، تو پچھلے دنوں اُسے ''دی ہیلتھ وائز رپورٹ'' (The Health-Wise Report) کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ یہ انکشافاتی رپورٹ چیونگم کی اصل حقیقت سامنے لائی۔

یاد رہے، چیونگم کے اجزا ہمارے خون میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے وہ بدن میں فساد برپا کرتے ہیں۔ آیندہ چیونگم کھانے سے قبل درج ذیل پانچ اجزا کے مضرِ صحت عمل پر ضرور نظر رکھیے گا۔

اسپارٹیم (Aspartame)

یہ مادہ اضافی (additive) ہے، یعنی تیا شدہ غذا کا ذائقہ بہ بنانے کی خاط اسے شا

کیا جاتا ہے۔ مگر ماہرین کے مطابق اسپارٹیم غذائی صفت (فوڈ انڈسٹری) میں استعمال ہونے والا سب سے خطرناک مادہ ہے۔

دراصل غذائی صنعت اِسے بطور چینی استعمال کرتی ہے۔ چیونگم کی تیاری میں اس کا بھرپور استعمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے، چیونگم کھانے سے جو طبی خرابیاں جنم لیں، ان میں سے بیشتر اسپارٹیم کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکا میں نظام غذا و دوا کی دیکھ بھال کے ادارے، ایف ڈی اے (فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈ منسٹریشن) نے 1980ء میں اسپارٹیم کے استعمال پر پابندی لگا دی تھی۔ بعد ازاں پابندی اُٹھالی گئی، مگر بہت سے ڈاکٹر عام غذاؤں میں اس کیمیکل کا استعمال ناپسند کرتے ہیں۔

اسپارٹیم کے مخالف ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ مادہ خلیوں میں ہیجان پیدا کرنے کی وجہ سے زہریلی خاصیت رکھتا ہے۔ جب یہ بذریعہ خون دماغ تک پہنچے، تو وہاں دماغی خلیوں (نیورونز) کو بہت زیادہ متحرک کر دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ قبل از وقت مرنے لگتے ہیں۔ یہ خرابی پھر انسان کو نہ صرف ذہنی طور پر کمزور کرتی بلکہ اُسے مختلف اعصابی بیماریوں کا نشانہ بھی بنا دیتی ہے۔

یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ اسپارٹیم ایک زہریلے مادے، اسیسیول فیم (Acesulfame) پوٹاشیم سے ملتی جلتی خاصیتیں رکھتا ہے۔ جانوروں پر کیے گئے تجربات سے پتا چلا ہے کہ اسیسیول فیم پوٹاشیم ''کینسر پیدا کرنے والا مادہ'' (Carcinogen) ہے۔ جسم میں اس کی موجودگی مختلف اقسام کے کینسر پیدا کر ڈالتی ہے۔ تاہم بعض غذاؤں میں یہ مادہ بطور اضافی مستعمل ہے۔

انگریزوں کے کردار کی حقیقت

مغربی ممالک اور انگلستان سے آنے والے لوگ انگریز قوم کے مہذب ہونے کی بڑی تعریفیں کرتے ہیں۔ کسی انگلش آدمی کی کہنی غلطی سے آپ کو جا لگی یا اُس کا پاؤں آپ کے پاؤں پر آپڑا تو وہ آپ کو ''سوری'' ضرور کہے گا۔ آپ اس کا کوئی چھوٹا سا کام بھی کر دیں تو بڑی دیر تک آپ کا احسان مند رہے گا۔ ہمارے جو دوست مڈل ایسٹ سے ہو کر آتے ہیں وہ عربوں کے جذباتی ہو جانے اور غلط رویے پر اظہارِ تشویش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ عرب لوگ بہت جلد برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ انفرادی حیثیت سے تو یہ بات بالکل بجا ہے مگر آپ تھوڑا سا بھی غور کریں تو خیال آئے گا انگلش لوگوں کا انفرادی اخلاق تو بہت اچھا ہے مگر من حیث القوم ان کا کردار کیا ہے؟ اُنھوں نے ہر ملک پر چڑھائی کی، اردگرد بسنے والی ہر قوم کا استحصال کیا، ساری قوموں کو محکوم بنایا مگر اس کے مقابلے میں عربوں کے کردار کو ایک قوم کی حیثیت سے دیکھیں تو اس کی مثال ہی نہیں ملتی۔ اُنھوں نے اگر دوسری قوموں سے جنگ کی تو اسی صورت میں جب اُن کے آفاقی دین کے آگے وہ لوگ رکاوٹ بنے ورنہ اُنھوں نے ہر قوم کو بھائیوں جیسا پیار دیا حتیٰ کہ مفتوح قوموں کے پورے حقوق دیے۔

(ڈاکٹر سلیمان عبداللہ کی کتاب ''قطرہ قطرہ دریا'' سے اقتباس)

بی ایچ ٹی

یہ کیمیائی مادہ ''تحفظی'' (Preservative) ہے، یعنی اِسے غذا میں یوں شامل کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے ذائقے، رنگ اور خوشبو کو طویل عرصہ برقرار رکھے۔

چناں چہ بی ایچ ٹی (Butylated hydroxytoiuene) چیونگم سمیت کئی تیار شدہ

غذاؤں میں استعمال ہوتا ہے۔ ان میں اناج (سیریل) بھی شامل ہیں۔

تاہم جدید طبی تحقیق کی رو سے جسم میں بی ایچ ٹی کی زیادتی اہم جسمانی اعضا گردوں اور جگر میں زہریلے اثرات پیدا کرتی ہے۔ نیز یہ کیمیائی مادہ بچوں میں ہیجان (ہائپر ایکٹویٹی) کو بھی جنم دیتا ہے۔ اسی لیے پچھلے چند ماہ میں بعض یورپی ممالک اسے خطرناک قرار دے کر بی ایچ ٹی پر پابندی لگا چکے۔ تاہم امریکی ایف ڈی اے کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور امریکا میں یہ زہریلا مادہ چیونگم کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔

کیلشیم سیسین پیٹون کیلشیم فاسفیٹ

خاصے لمبے نام والا یہ مادہ چیونگم کو سفید بنانے کی خاطر مستعمل ہے۔ اس مادے میں شامل سیسین دودھ سے حاصل کردہ پروٹین ہے۔ یورپ میں کئی لوگ یہ پروٹین بطور غذائی مددگار (سپلیمنٹ) کھاتے ہیں۔ مگر اب ڈاکٹر خبردار کررہے ہیں کہ یہ پروٹین کئی خراب ضمنی اثرات رکھتا ہے۔ ان میں سینے کی جلن، بدہضمی اور الرجی شامل ہیں۔

اسی باعث یورپی ڈاکٹر اپنی حکومتوں سے مطالبہ کررہے ہیں کہ چیونگم اور دیگر تیارشدہ کھانوں میں درج بالا کیمیائی مادے کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔

گم بیس

چیونگم بنانے والے کئی اجزا عوام سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اجزا ''تجارتی راز'' (ٹریڈ سیکرٹ) ہیں۔ وہ ان اجزا کے لیے ''گم بیس'' (Gum base) کی اصلاح استعمال کرتے ہیں۔

دی ہیلتھ وائز رپورٹ کے محققین نے کتب، رسائل اور ویب سائٹس چھان ماریں تاکہ گم بیس کے اجزا معلوم ہوسکیں۔ بڑی مغز ماری اور تحقیق سے انکشاف ہوا کہ چیونگم بنانے والے گم بیس کے اجزا کو پانچ گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کا تعارف درج ذیل ہے:

☆الاسٹومیرز (Elastomers)..... یہ بنیادی اجزا چیونگم کو لچک فراہم کرتے ہیں۔

☆رال (Resins)..... یہ مادے اجزا کو باہم جوڑتے اور نرم کرتے ہیں۔

☆پلاسٹی سائزرز (Plasticizers)..... یہ مادے اجزا کو زیادہ سے زیادہ لچک دار بناتے ہیں تاکہ بہترین گم بیس جنم لے۔

☆فلرز (Fillers)..... یہ اجزا چیونگم کی مصنوعہ کو مجموعی طور پر بہتر بناتے ہیں۔

☆ضدِ تکسیدی (Antioxidants)..... یہ مادے گم بیس اور ذائقے کو خراب نہیں ہونے دیتے۔

تاہم محقق سر توڑ کوشش کے باوجود یہ نہ جان سکے کہ ان پانچ گروہوں کے حقیقی اجزا کون سے ہیں۔ چناں چہ عوام وخواص، سبھی ان اجزا سے بے خبر چیونگم کی جگالی کررہے ہیں۔

ٹائیٹینم ڈاؤ آکسائڈ

یہ مادہ چیونگم کی کوٹنگ کرنے میں کام آتا ہے۔ گولی ٹافی کی تیاری میں بھی مستعمل ہے۔ اب جدید طبی تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ یہ مادہ بچوں بڑوں میں دمہ اور کروہنز مرض (Crohn's disease) نامی بیماری پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹروں کا پرزور مطالبہ ہے کہ چیونگم وغیرہ کی تیاری میں ٹائیٹینم ڈاؤ آکسائڈ کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔ ○○○

لیٹنے کی ہیئت سے اپنی شخصیت جانیے

جنید اکرم

پروفیسر کرس ازوسکی برطانیہ کے مشہور معالج ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے ''ایک ہزار'' رضاکاروں پر دلچسپ تحقیق کی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ دورانِ نیند لیٹنے کا انداز نہ صرف صحت بلکہ انسان کی شخصیت پر کس قسم کے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس ضمن میں لیٹنے کے درج ذیل چھ معروف مروجہ انداز کا تجزیہ کیا گیا۔

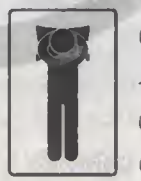

(1) پیٹ کے بل

اس ہیئت میں انسان پیٹ کے بل لیٹتا ہے۔ ہاتھ عموماً بالائی جانب اٹھے ہوتے ہیں۔ سر پہلو میں ہوتا ہے۔

شخصیت: اس انداز میں سونے والے عموماً منفی ذہنیت رکھنے والے اور درشت مزاج ہوتے ہیں۔ ضدی اور بظاہر دلیر لگتے ہیں، مگر ہر قسم کی تنقید کو ذاتی سطح پر لیتے ہیں۔

صحت کو فائدہ: اس انداز میں سونا نظام انہضام کے لیے مفید ہے۔

(2) بچہ ہیئت

اس ہیئت میں انسان ٹانگیں سکیڑ کر پہلو کے بل سوتا ہے۔ ماہرین کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ لوگ اسی پوزیشن میں سوتے ہیں۔

شخصیت: نفسیات دانوں کی رو سے اس ہیئت میں سونے والے بظاہر مضبوط اور سخت مزاج

لیکن باطن میں شرمیلے اور حساس ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے گھلنے ملنے میں دیر لگاتے لیکن پھر پرسکون ہوجاتے ہیں۔

صحت کو فائدہ: اگر انسان اس انداز میں بائیں پہلو پر سوئے، تو اہم اعضا (جگر، نظام ہضم، پھیپھڑوں) پر دباؤ پڑتا ہے۔ لہٰذا بچہ ہیئت میں سونے والوں کے لیے مناسب ہے کہ وہ دائیں پہلو پر سوئیں۔

3۔ لٹھے کے مانند

اس ہیئت میں انسان پہلو کے بل کچھ یوں سوتا ہے کہ ہاتھ نچلی جانب ہوتے ہیں۔

شخصیت: ایسے سونے والے معاشرت پسند اور جلد گھل مل جانے والے ہوتے ہیں۔ ان کی خامی یہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کرکے اجنبیوں پر بھی اعتماد کرلیتے ہیں۔ چناں چہ انھیں الو بنانا بہت آسان ہے۔

صحت کو فائدہ: اس انداز میں لیٹنے سے ریڑھ کی ہڈی سیدھی رہتی ہے۔ لہٰذا کمر درد کا شکار یوں لیٹنے سے فائدہ پاتے ہیں۔

(4) پھیلے ہاتھ

اس انداز نیند میں انسان دونوں ہاتھ سامنے پھیلا کر پہلو کے بل لیٹتا ہے۔

شخصیت: اس ہیئت میں لیٹنے والے نئی باتیں قبول کرتے ہیں۔ تاہم شکی مزاج اور سنکی ہوتے ہیں۔ فیصلے کرنے میں طویل عرصہ لگاتے اور خوبیوں و خامیوں پر بھرپور نظر ڈالتے ہیں۔ مگر جب فیصلہ کرلیں، تو اُسے تبدیل نہیں کرتے اور نہ ہی پچھتاتے ہیں۔

صحت کو فائدہ: اس انداز میں سونے سے انسان اکثر تیزابیت اور کمی نیند سے نجات پاتا ہے۔ تاہم یہ عوارض طویل عرصہ چمٹے رہیں، تو معالج سے رجوع کیجیے۔

(5) فوجی

اس پوزیشن میں انسان کمر کے بل سیدھا لیٹتا ہے۔ ہاتھ بھی سیدھے ہوتے ہیں۔

شخصیت: ایسے لوگ عموماً خاموش اور لیے دیے رہنے والے ہوتے ہیں۔ وہ معاملاتِ زندگی کو رائی کا پہاڑ نہیں بناتے اور اپنے علاوہ دوسروں کے لیے بھی بلند معیار قائم کرتے ہیں۔

صحت کو فائدہ: جدید تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ کمر کے بل لیٹنے سے انسان خراٹے لینے لگتا، سانس لینے میں دقت محسوس کرتا اور مجموعی طور پر بُری رات گزارتا ہے۔ جبکہ جس انسان نے یہ ہیئت تبدیل کی، اُسے درج بالا علتوں سے نجات مل گئی۔

(6) ستارہ مچھلی

اس پوزیشن میں انسان کمر کے بل لیٹتا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے رکھتا ہے۔

شخصیت: اس ہیئت میں نیند لینے والے گفتگو ذوق و شوق سے سنتے ہیں لہٰذا اچھے دوست ثابت ہوتے ہیں۔ مصیبت پر ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے اور عموماً نمایاں ہونا پسند نہیں کرتے۔

اگر 7 گھنٹے کی نیند نہ ملے تو

نئی تحقیق، انسانی صحت کی تباہی کی نئی وجوہات کا پتا دیتی ہے

زین العابدین

تجربہ

یہ ثابت کرچکا کہ اگر انسان رات کو سات آٹھ گھنٹے کی نیند نہ لے، تو مختلف عوارض کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اب جدید سائنس ان عوارض کی تفصیل سامنے لا رہی ہے۔ نئی تحقیق یہ چشم کشا انکشاف کرتی ہے کہ مناسب نیند نہ لینے سے انسان کی صحت تباہ ہوجاتی ہے۔ ذیل میں تحقیق کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

(1) ردی غذا سے رغبت

ایک تجربے سے انکشاف ہوا کہ جو مرد و زن صرف دو دن مناسب نیند نہ لیں، ان میں بھوک پیدا کرنے اور روکنے والے ہارمونوں کا نظام گڑبڑا جاتا ہے۔ نیند کی کمی سے بھوک جنم دینے والا ہارمون، گھرلین (Ghrelin) زیادہ بنتا جبکہ روکنے والا لیپٹن کم بنتا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ تب انسان کو چٹ پٹے اور کاربوہائیڈریٹ والے کھانوں کی بھوک زیادہ لگتی ہے۔ یوں انسانی جسم کو ضرورت سے زیادہ حرارے ملنے لگتے ہیں۔ یہ حالت طویل عرصہ برقرار رہے، تو ردی غذا انسان کو فربہ بنا ڈالتی ہے۔

(2) جرثوموں کا مرکز نگاہ

کمی نیند انسان کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے والا مامون (Immune) نظام بھی کمزور کرتی ہے۔ خصوصاً جو مرد و زن روزانہ سات گھنٹے سے کم نیند لیں، وہ دوسروں کی نسبت نزلہ، زکام، بخار وغیرہ میں زیادہ جلد مبتلا ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں ٹیکوں کا اثر بھی کم ہوجاتا ہے۔

(3) شکر ہوئی بے فائدہ

ہمارے بدن میں ہر خلیے کو اپنا کام انجام دینے کی خاطر شکر درکار ہوتی ہے۔ شکاگو یونیورسٹی میں کیے گئے تجربے سے انکشاف ہوا کہ جو خواتین و حضرات محض ایک ہفتہ مناسب نیند نہ لیں، ان میں انسولین مزاحمت جنم لیتی ہے۔ واضح رہے، انسولین ہارمون خون میں موجود شکر خلیوں تک پہنچاتا ہے۔

انسولین مزاحمت کے باعث جسمانی خلیے صحیح طرح یہ ہارمون استعمال نہیں کر پاتے۔ چناں چہ یہ خلل آخرکار انسان کو ذیابیطس قسم 2 جیسے ناقابلِ علاج مرض میں مبتلا کر دیتا ہے۔

(4) دباؤ تھمتا ہی نہیں

شکاگو یونیورسٹی ہی میں کی گئی اہم تحقیق سے یہ بھی چشم کشا انکشاف ہوا کہ کم سونے سے انسان مسلسل جسمانی (Stress) دباؤ میں رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سہ پہر اور شام کو ان کے بدن میں جسمانی دباؤ پیدا کرنے والا ہارمون، کورٹیسول کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہارمون خاصا خطرناک ہے، کیونکہ اس کی ازحد افزائش سے انسان میں دل کی دھڑکن، خون کے دباؤ اور شکر خون کی سطح میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی اضافے پھر انسان کو ہائپر ٹینشن، امراض قلب اور ذیابیطس قسم 2 میں مبتلا کرتے ہیں۔ مزید برآں کورٹیسول میں اضافہ بڑے غلط وقت پر ہوتا ہے کیونکہ سہ پہر و شام کو انسان عموماً آرام کے موڈ میں ہوتا ہے۔

(5) دماغ چاق چوبند نہیں رہتا

رات کو مناسب نیند نہ لینے کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ انسان بروقت ردِعمل ظاہر نہیں کرتا۔ چناں چہ ڈرائیونگ سمیت کئی روزمرہ سرگرمیاں انجام دینا خطرناک عمل بن جاتا ہے۔ شدید تھکن کا شکار مرد و زن ناخوش بھی رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دماغ کے ایک ہی کیمیائی مادے نیند اور مزاج (موڈ)، دونوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔

(6) بڑھاپے کی آمد

کمی نیند کا شکار لوگ زرد جلد اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کی وجہ سے فوراً پہچانے جاتے ہیں۔ اب ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ ایسے لوگوں میں کورٹیسول کی زیادہ افزائش کولاجن بھی نہیں بننے دیتی جس سے جلد بنتی ہے۔ اسی لیے کولاجن کی کمی کے باعث ان کی جلد میں جھریاں بننے لگتی ہیں۔

دوسری طرف اچھی نیند جلد پر خوشگوار اثرات ڈالتی ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ دن کی نسبت رات کو خلیے آٹھ گنا زیادہ سرگرم ہوتے ہیں۔ چناں چہ وہ جلد کی جھریاں مٹا ڈالتے ہیں۔

(7) جسمانی درد میں اضافہ

نیند نہ لینے سے جسمانی تکالیف کی شدت بھی بڑھ جاتی ہے۔ امریکی جان ہوپکنز یونیورسٹی کے ماہرین نے دوران تجربہ کمر درد کے شکار دس مرد و زن کو دانستہ ایک گھنٹا کم سلایا۔ تین دن بعد سبھی لوگ کمر میں زیادہ درد محسوس کرنے لگے۔

(8) سرطان چمٹنے کا خطرہ

ورزش انسان کو کینسر سے بچاتی ہے۔ مگر محققین کا کہنا ہے کہ کمی نیند ورزش کے فوائد ضائع کر ڈالتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کم سونے سے سرطان پیدا کرنے والی ہارمونی و استحالی (Metabolic) تبدیلیاں جنم لیتی رہیں۔

(9) حرفِ آخر

درج بالا تمام خرابیوں سے بچنے کے لیے پوری نیند لینا ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ رات کو نیند کا ماحول بنائیے۔ مثلاً سونے سے 15 منٹ قبل روشنی مدھم کر دیں۔ دانت صاف کریں، منہ دھوئیں، کتاب کا مطالعہ کریں یا اچھی موسیقی سنیں۔ یوں بدن کو وقت پر سونے کا عادی بنائیں۔ تحقیق سے انکشاف ہوا کہ رات کو پُرسکون رہنے والے 30 منٹ پہلے سوتے اور مزید ایک گھنٹے کی نیند لیتے ہیں۔

صحت مند بننے کے لیے کیجیے 13 ننھی منی تبدیلیاں

عبداللہ رمضان

انسان (1) اگر چربی، پروٹین اور دیگر شحمی مواد سے بھرپور غذا کھائے، تو اس کی آنکھوں کے آنسوؤں میں کولیسٹرول آنے لگتا ہے۔ اگر آپ کنٹیکٹ لینز پہنتے ہیں، تو یہ کولیسٹرول ان پر دھندلا غبار جما دیتا ہے۔ ذرا سوچیے، زائد کولیسٹرول کنٹیکٹ لینز برباد کر ڈالتا ہے، تو آپ کی شریانوں میں تو تباہی مچاتا ہوگا۔

(2) خشک برش سے دانت صاف کریں

اس طریق پر عمل کرنے سے دانتوں پر جما 60 فیصد میل کچیل (Tartar) صاف ہو جاتا ہے، نیز مسوڑھوں سے خون بہنے کا خطرہ بھی کم ہوتا ہے۔ دانتوں کا اندرونی و بیرونی حصہ نرم بالوں والے سوکھے برش سے صاف کیجیے۔ پھر کلی کیجیے، تھوکیے اور برش دھو کر کچھ دیر ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کریں۔

(3) ناشتا کبھی نہ چھوڑیے

آسٹریلوی سڈنی یونیورسٹی کے محققوں نے ایسے پانچ سو مرد و زن پر نظر رکھی جنھوں نے اپنا 15 سے 25 کلو وزن کم کیا اور پھر پانچ برس تک خود کو اسمارٹ رکھا۔ اس تحقیق سے انکشاف ہوا کہ ان لوگوں میں 80 فیصد ہفتے کے تمام دن ناشتا کرتے تھے۔

(4) ہفتے میں ایک بار مچھلی کھائیے

وجہ یہ ہے کہ یہ عمل انسان کو دل کے دورے سے بچاتا ہے۔ دراصل مچھلی میں وافر موجود اومیگا 3 فیٹی ایسڈ قلب کو تقویت پہنچاتا ہے۔ یہ غذائی تیزاب یا ایسڈ چکنی مچھلیوں میں زیادہ ملتے ہیں۔

(5) روزانہ وٹامن ای اور اسپرین لیجیے

ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ ضدِ تکسید (Antioxidant) اور خون پتلا کرنے والی دوا کا یہ مرکب انسانی شریانوں میں جما مواد 80 فیصد تک گھلا دیتا ہے۔ یہ دونوں ساتھ لینے کا فائدہ اتنا زبردست ہے کہ اگر مرد و زن اپنا کولیسٹرول کم نہ بھی کر سکیں، تو یہ طریق علاج ان کی شریانوں میں چربی جمنے نہیں دیتا۔

(6) دُکھی انسانیت کی مدد کیجیے

جو لوگ ہفتے میں کم از کم ایک دن رضاکارانہ سرگرمی انجام دیں، وہ دل کا سکون پاتے ہیں۔ یہی نہیں، دوسروں کی نسبت ان میں موت کا خطرہ 50 فیصد تک کم ہوجاتا ہے۔

(7) پیٹ کی ورزش کریں

ڈاکٹروں نے تجربات سے جانا ہے کہ اگر انسان اپنے پیٹ کے عضلات مضبوط کرلے، تو درد کمر اسے تنگ نہیں کرپاتا اور عضلات قوی کرنے کا بہترین طریقہ پیٹ کی ورزشیں ہیں۔ ماہرین نے اس ضمن میں کرنچ (Crunch) کو مؤثر ورزش قرار دیا۔ کرنچ انجام دینے کا طریقہ یہ ہے کہ کمر کے بل لیٹیے۔ گھٹنے اوپر کیجیے۔ پھر دونوں بازو گھما کر گردن پکڑیے۔ اس کے بعد بالائی دھڑ جتنا اوپر اٹھا سکتے ہیں، اٹھائیے۔ اس دوران نچلے حصے میں جنبش نہیں ہونی چاہیے۔ روزانہ یہ ورزش بارہ تیرہ بار کیجیے۔

(8) کافی بس ایک پیالی

کافی کے شوقین یہ مشروب پینے پر آئیں، تو کئی پیالیاں چڑھا جاتے ہیں۔ حالانکہ کافی کی فی پیالی دل کی 16 دھڑکنیں فی منٹ بڑھا دیتی ہے۔ لہٰذا پرہیز نہ کرسکیں، تو ایک پیالی کافی ہی نوش کریں۔

(9) شادی کا بندھن محفوظ رکھیے

میاں بیوی میں محبت اور گھر میں افہام وتفہیم کا ماحول سبھی کو صحت مند رکھتا ہے۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ گھر میں ناراضی ولڑائی جھگڑا رہے، تو بیمار ہونے کا خطرہ 35 فیصد تک بڑھ جاتا ہے جبکہ عمر بھی اوسطاً چار برس کم ہوجاتی ہے۔

(10) ڈپریشن کو ورزش سے گھٹائیے

آج کی تیز رفتار زندگی میں انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ذہنی وجسمانی دباؤ کا نشانہ بن جاتا ہے۔ کئی مرد وزن پھر ادویہ کھا کر ڈپریشن ختم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ تاہم ورزش اس خلل کا بہترین قدرتی علاج ہے۔ ماہرین مشورہ دیتے ہیں کہ روزانہ 40 منٹ ورزش کیجیے تو ڈپریشن آپ کے نزدیک نہیں پھٹکے گا۔ درحقیقت باقاعدگی سے ورزش کا اثر پروزیک (اینٹی ڈپریسنٹ) دوا لینے جیسا ہے۔

(11) تکیے پر کتاب رکھیے

جی ہاں، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا آپ کا تکیہ صحیح طرح سر اور گردن کو سہارا دیتا ہے۔ طریق کار یہ ہے کہ تکیہ دہرا کر کے اس کے اوپر کتاب رکھیے۔ اگر تکیہ واپس سیدھا ہوجائے، تو وہ ٹھیک ہے نہ ہو، تو تکیہ بدل دیجیے۔

(12) ''کر'' سے ٹھکن اتاریے

کئی مرد وزن رات کے ایک دو بجے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ پھر انھیں نیند نہیں آتی اور وہ کروٹیں بدلتے ساری رات گزار دیتے ہیں۔ یہ خلل ''کر'' (Kur) طریق سے دور کیجیے جو یورپی ڈاکٹر اکثر تجویز کرتے ہیں۔

طریق عمل یہ ہے کہ اگر آپ جلد اٹھ بیٹھیں، تو ایک تولیہ پانی میں بھگوئیے، پھر بازو، ٹانگوں اور بالائی جسم پر ہولے ہولے تولیہ پھیریے۔ بعد ازاں بستر پر لیٹ جائیے۔ انسان جب نیند سے جاگے تو اس کا جسم بڑا گرم ہوتا ہے۔ بستر میں دوبارہ لیٹنے سے وہ مزید گرم ہوجاتا ہے۔ چناں چہ تب گہری اور میٹھی نیند آتی ہے۔

(13) لیٹ کر اللہ کے ناموں کا ورد کیجیے

جلد ہی جلد کو آرام اور آنکھوں کو سکون محسوس ہوگا۔ عام تجربہ یہ ہے کہ نیند نہ بھی آرہی ہو تو شیطان اللہ کے ناموں سے گھبرا کر انسان کو لوری دے کر سلا دیتا ہے۔ آپ بھی لوری کا مزہ لے کر دیکھیے ○○○

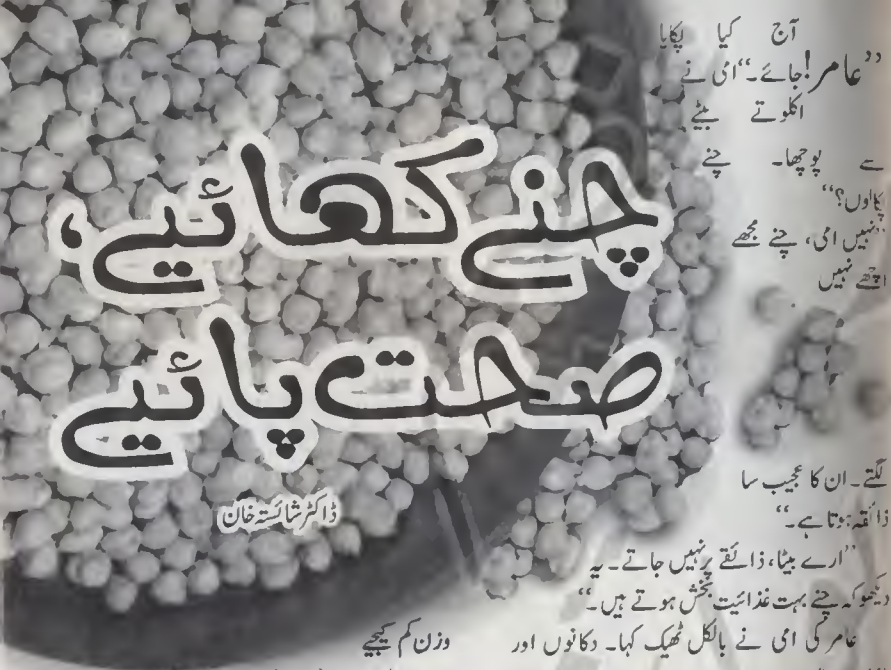

چنے کھائیے، صحت پائیے

ڈاکٹر شائستہ خان

''عامر! جائے۔'' امی نے اکلوتے بیٹے سے پوچھا۔ ''چنے پکاؤں؟''

''نہیں امی، چنے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان کا عجیب سا ذائقہ ہوتا ہے۔''

''ارے بیٹا، ذائقے پر نہیں جاتے۔ یہ دیکھو کہ چنے بہت غذائیت بخش ہوتے ہیں۔''

عامر کی امی نے بالکل ٹھیک کہا۔ دکانوں اور بازاروں میں عام دستیاب چنے بڑی مفید غذا ہے۔ اسی لیے بحیرہ روم میں ساڑھے سات ہزار سال قبل اسے بطور اناج بویا گیا۔ یہ دنیا کے قدیم ترین اناجوں میں شامل ہے۔

چنا دالوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی دو بنیادی اقسام ہیں: کالا چنا اور سفید چنا۔ دونوں وٹامن اور معدنیات سے بھرپور غذا ہیں۔ بھارت، پاکستان، ترکی، آسٹریلیا اور ایران میں چنا کثیر تعداد میں پیدا ہوتا ہے۔

چنا ایک دو نہیں کئی طبی فوائد رکھتا ہے۔ اس میں فولاد، وٹامن بی 6، میگنیشم، پوٹاشیم اور کیلشیم کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ جبکہ فاسفورس، تانبے اور میگنیز کی بھی خاصی مقدار ملتی ہے۔ چنے کے طبی فوائد درج ذیل ہیں۔

وزن کم کیجیے

چنے میں ریشہ (فائبر) اور پروٹین شیر مقدار میں ملتے ہیں۔ پھر اس کا گلائسیمک انڈکس بھی کم ہے۔ اسی بنا پر چنا وزن کم کرنے کے سلسلے میں بہترین غذا ہے۔ کیونکہ عموماً ایک پلیٹ چنے کھا کر آدمی سیر ہوجاتا ہے اور پھر اُسے بھوک نہیں لگتی۔

دراصل چنے کا ریشہ دیر تک آنتوں میں رہتا ہے۔ لہٰذا انسان کو بھوک نہیں لگتی۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جو مرد وزن دو ماہ تک چنے کو اپنی بنیادی غذا رکھیں، وہ اپنا آٹھ پونڈ وزن کم کرلیتے ہیں۔ یاد رہے، ایک پیالی چنے عموماً پیٹ بھر دیتے ہیں۔

نظام ہضم کا معاون

چنے میں ریشے کی کثیر مقدار اُسے نظام ہضم کے لیے بھی مفید بناتی ہے۔ یہ ریشہ آنتوں کے جراثیم (بیکٹریا)

کو مختلف مفید تیزاب مہیا کر کے انھیں قوی بناتا ہے۔ نتیجتاً وہ آنتوں کو کمزور نہیں ہونے دیتے اور انسان قبض و دیگر تکلیف دہ بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

ضد تکسیدی مادوں کی فراہمی

انسانی جسم میں آزاد اصلیے (مضر صحت آکسیجن سالمے) مختلف اعضا کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ضد تکسیدی مادے (Antioxidants) انہی سالمات کا توڑ ہیں جو مختلف صحت بخش غذاؤں میں ملتے ہیں۔ ان غذاؤں میں چنا بھی شامل ہے۔ چنوں میں مختلف ضد تکسیدی مادے مثلاً مائریسٹین (Myricetin)، کیمفوریل، کیفک ایسڈ، وینلک ایسڈ اور کلوروجینک ایسڈ وغیرہ ملتے ہیں۔ ان کے باعث چنا مجموعی انسانی صحت کے لیے بہت عمدہ غذا ہے۔

کولیسٹرول میں کمی

جسم میں کولیسٹرول بڑھ جائے، تو امراض قلب میں مبتلا ہونے اور فالج گرنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ چنے اپنے مفید غذائی اجزا کی بدولت فطری انداز میں کولیسٹرول کی سطح کم کرتے ہیں۔ ایک تجربے میں ماہرین نے ان مرد و زن کو ایک ماہ تک آدھی پیالی چنے کھلائے جن کے بدن میں کولیسٹرول زیادہ تھا۔ ایک ماہ بعد ان کے کولیسٹرول میں نمایاں کمی دیکھی گئی۔

دراصل چنے میں فولیٹ اور میگنیشیم کی خاصی مقدار ملتی ہے۔ یہ وٹامن و معدن خون کی نالیوں کو طاقتور بناتے اور انھیں نقصان پہنچانے والے تیزاب ختم کرتے ہیں۔ نیز حملہ قلب (ہارٹ اٹیک) امکان بھی کم ہو جاتا ہے۔

گوشت کا بہترین نعم البدل

چنے میں خاطر خواہ پروٹین ملتا ہے۔ اگر اسے کسی اناج مثلاً ثابت گندم کی روٹی کے ساتھ کھایا جائے، تو انسان کو گوشت یا ڈیری مصنوعات جتنی پروٹین حاصل ہوتی ہے اور بڑا فائدہ یہ ملتا ہے کہ نباتی پروٹین زیادہ حرارے یا سچوریٹیڈ فیٹس نہیں رکھتی۔

ذیابیطس کی روک تھام

چنے اور دیگر دالیں کھانے والے ذیابیطس قسم 2 کا شکار نہیں ہوتے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ غذائیں زیادہ ریشہ اور کم گلائسیمک انڈکس رکھتی ہیں۔ اسی باعث ان میں موجود کاربوہائیڈریٹ آہستہ آہستہ ہضم ہوتے ہیں۔ اسی عمل کے باعث ہمارے خون میں شکر یک دم اوپر نیچے نہیں ہوتی اور متوازن رہتی ہے۔

یاد رہے، انسان جب کم ریشے والی کاربوہائیڈریٹ سے بھرپور غذا کھائے، تو اُس کے خون میں شکر بہت تیزی سے اوپر نیچے ہوتی ہے۔ جب یہ عمل معمول بن جائے، تو انسولین نظام گڑبڑا جاتا ہے۔ یوں ذیابیطس قسم 2 جنم لیتا ہے۔

توانائی میں اضافہ

چنے میں شامل فولاد، مینگنیز اور دیگر معدن حیاتین انسانی قوت بڑھاتے ہیں۔ اسی لیے چنا حاملہ خواتین اور بڑھتے ہوئے بچوں کے لیے بڑی مفید غذا ہے۔ یہ انھیں بیشتر مطلوبہ غذائیت فراہم کرتا ہے۔

مزید برآں چنا ساپونینز (Saponins) نامی فائٹو کیمیکل رکھتا ہے۔ یہ کیمیائی مادے ضد تکسید کا کام دیتے ہوئے خواتین کو سینے کے سرطان سے بچاتے۔ یہ ہڈیوں کی بوسیدگی کے مرض سے بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

چنوں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اُسے کئی ماہ تک محفوظ رکھا جاسکتا ہے اور ان کی غذائیت کم نہیں ہوتی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ انھیں بھگونے کے بعد استعمال کیا جائے، تو بہتر ہے۔ یوں وہ جلد ہضم ہو جاتے ہیں۔ چنوں کو چار تا چھ گھنٹے بھگونا کافی ہے۔ بھگونے کے بعد چنے جتنی جلد استعمال کیے جائیں، بہتر ہے۔ چنے بھگوتے ہوئے اُن میں تھوڑا سا نمک اور میٹھا سوڈا ڈال لیا جائے، تو وہ جلد گل جاتے ہیں۔ ○○○

کیا ہم دماغ کا 10 فیصد حصہ استعمال کرتے ہیں؟

عالیہ احمد

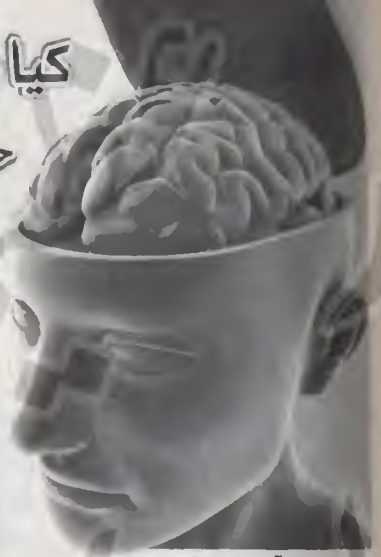

چند روز قبل ایک دوست سے انسانی ذہنی قوتوں پر بات ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگا ''بیشتر انسان اپنے دماغ کی صرف 10 فیصد قوت استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ دماغ کے غیر استعمال شدہ حصوں کو بھی کام میں لے آئیں تو اپنی ذہانت اور تخلیقی طاقت بڑھا کر غیر معمولی کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔''

اس کی بات سن کر مجھے خیال آیا، کیا واقعی انسان اپنے دماغ کا 10 فیصد حصہ استعمال کرتا ہے؟ یہ امر میں نے بعض کتب میں بھی پڑھا تھا۔ چنانچہ سوچا کہ سائنسی نقطہ نظر سے اس بات کو پرکھا جائے۔ جب تحقیق کی تو انکشاف ہوا کہ کئی مغربی سائنس دان اس سوال کے ضمن میں چھان بین کر چکے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

ان محققین کے سامنے پہلا سوال یہ آیا کہ دماغ کا کون سا 10 فیصد حصہ؟ سب سے پہلے انھوں نے اسے کل دماغ کا 10 فیصد حصہ لیا۔ چنانچہ ماہرین نے اس حصے کا پتا چلانے کی خاطر کئی مرد و زن کو فنکشنل میگنیٹک ریزونینس امیجنگ'' تکنیک استعمال کرنے والی مشین پر لٹایا۔

اس مشین کا دماغی سکینر ماہرین کو مطلع کرتا ہے کہ لیٹا انسان جب کچھ سوچے یا حرکت کرے تو دماغ کے کون سے حصے متحرک ہوتے ہیں۔ اس تجربے سے انکشاف ہوا کہ انسانی چاہے کیسی بھی ہلکی یا سخت حرکت کرے یا مسلسل سوچتا رہے، انسان دماغ کا تقریباً 10 فیصد حصہ ہی متحرک ہوتا ہے۔ واضح رہے، دوران نیند بھی ہمارا دماغ حرکت میں رہتا ہے۔ تب وہ مختلف عمل مثلاً نظام تنفس، دل کی دھڑکن وغیرہ کو کنٹرول کرتا ہے۔

بعض لوگ 10 فیصد کا تعلق دماغی خلیوں سے بتاتے ہیں۔ لیکن تحقیق و تجربے سے یہ بات بھی درست ثابت نہ ہوئی۔ ہمارے دماغ میں عصبی (Nerve) خلیے فالتو ہو جائیں تو وہ مر جاتے ہیں۔ دماغ ایک بھی عصبی خلیہ فارغ نہیں بیٹھنے دیتا۔ درحقیقت ہمارے بدن میں دماغ ہی سب سے زیادہ وسائل خرچ کرنے والا عضو ہے۔ مثلاً بذریعہ سانس جو آکسیجن ہمارے اندر داخل ہو، اس کا 20 فیصد حصہ دماغ میں کھپتا ہے۔

یہ درست ہے کہ قدرت بعض اوقات انوکھے ڈیزائن پیدا کرتی ہے، مگر اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ وہ انسان کا دماغ دس گنا بڑا بناتی ہے۔ اب بھی دماغ اتنا بڑا ہے کہ کبھی کبھی دوران زچگی زچہ بچہ کی

جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

ان حقائق کے باوجود کئی لوگوں کا اصرار ہوتا ہے کہ انسان 10 فیصد دماغ استعمال کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس فہرست میں تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل یونیورسٹی کالج لندن کی ماہر اعصاب (نیوروسائنٹسٹ) صوفیہ اسکاٹ ابتدائی طبی امداد کے ایک کورس میں شریک ہوئی۔ کورس کے ڈاکٹر نے شرکا کو بتایا کہ 10 فیصد ''سچائی'' کی وجہ سے ضروری نہیں کہ سر کی چوٹوں پر زیادہ دھیان دیں۔

ڈاکٹر نے نہ صرف 10 فیصد کے معاملے میں غلطی کی، بلکہ سر کی چوٹ کو معمولی بتا کر زیادہ کوتاہی کا مرتکب ہوا۔ واضح رہے، سر کے نازک حصے پر لگنے والی معمولی چوٹ بھی انسان کی صلاحیتوں پر مضر اثرات مرتب کرتی ہے۔ بہرحال پروفیسر صوفیہ اسکاٹ نے حقائق بتا کر اس ڈاکٹر کو ہکا بکا کر دیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ایک پروفیسر بھی اس کے درس میں شریک ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ ٹھوس سائنسی حقائق نہ رکھنے کے باوجود پوری دنیا میں کیونکر یہ مشہور ہو گیا کہ انسان محض 10 فیصد دماغ استعمال کرتا ہے؟ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ امریکی فلسفی اور ڈاکٹر، ولیم جیمز نے 1908ء میں اپنی کتاب ''انسان کی توانائیاں'' (The energies of Men) میں تحریر کیا ''ہم اپنی ذہنی و جسمانی توانائیوں کا بہت کم حصہ اپناتے ہیں۔'' تاہم ڈاکٹر ولیم نے کوئی ہندسہ یا فیصد نہیں لکھا۔

1936ء میں پہلی بار مشہور امریکی ماہر نفسیات ڈیل کارنیگی نے اپنی کتاب لوگوں کو کیسے دوست بنایا جائے؟'' کے دیباچے میں 10 فیصد کا ہندسہ تحریر کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ہندسہ آئن اسٹائن کی تخلیق ہے۔ مگر محققین نے اس کی ساری کتابیں، ڈائریاں، مسودے وغیرہ چھان مارے، کہیں 10 فیصد کا ذکر نہیں۔

لیکن ممکن ہے کہ ہمارے دو جسمانی عجائب کی بنا پر اس مغالطے نے جنم لیا۔ ہمارے دماغ میں پائے جانے والے 90 فیصد خلیے ''گلیل'' (Glaial) کہلاتے ہیں۔ انھیں سفید مادہ (White matter) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ امدادی خلیے ہیں، یعنی دوسری اقسام کے خلیوں ''نیورون'' کو غذائیت و عملی مدد فراہم کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ ممکن ہے کہ جب بعض ماہرین نے معلوم کیا کہ سارا کام تو 10 فیصد خلیے کرتے ہیں تو انھیں گمان ہوا کہ بقیہ 90 فیصد خلیوں کو بھی ان جیسا بنانا ممکن ہے۔ حالانکہ گلیل بالکل مختلف قسم کے خلیے ہیں اور ایسا کوئی طریق کار نہیں جو انھیں نیورون بنا ڈالے تاکہ ہمارے دماغ کو مزید قوت مل جائے۔

اگرچہ بعض مریضوں میں غیر معمولی حالت ضرور جنم لیتی ہے۔ مثلاً 1980ء میں برطانوی معالج ڈاکٹر جان لوربر نے مشہور سائنسی رسالے ''جرنل'' میں مضمون لکھ کر انکشاف کیا کہ استسقائے دماغ (بیماری) میں مبتلا ایسا مریض اس کے زیر علاج ہے جس کے تقریباً تمام نیرون خلیے مردہ ہو چکے۔ پھر بھی اس کا دماغ معمول کے مطابق کام کر رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے ایسی حالت غیر معمولی حالات ہی میں جنم لیتی ہے۔ عام زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔

مزید یہ بھی سچ ہے کہ اگر ہم نت نئی باتیں سیکھیں، اپنے ذہن کو ہر وقت متحرک رکھیں تو وہ تیز ہو جاتا ہے۔ نئی اُبھرتی سائنس، عصبی پلاسٹیسٹی (Neuroplasticity) کی تحقیق بھی یہی حقیقت واضح کرتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ ہمارے دماغ میں نیا علاقہ دریافت ہو... بلکہ نیورون خلیوں کے مابین نئے تعلق (کنکشن) جنم لیتے ہیں، جس سے ہماری ذہنی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ٥٥

سنسنی خیز انکشافات

کیا مظفر نگر

میں موت کی ہولی دوبارہ کھیلی جانے والی ہے؟

بھارتی شہر میں مسلمانوں پر ہونے والے ہوش رُبا ظلم و جبر کی دل دہلا دینے والی داستان

رخسانہ فضل

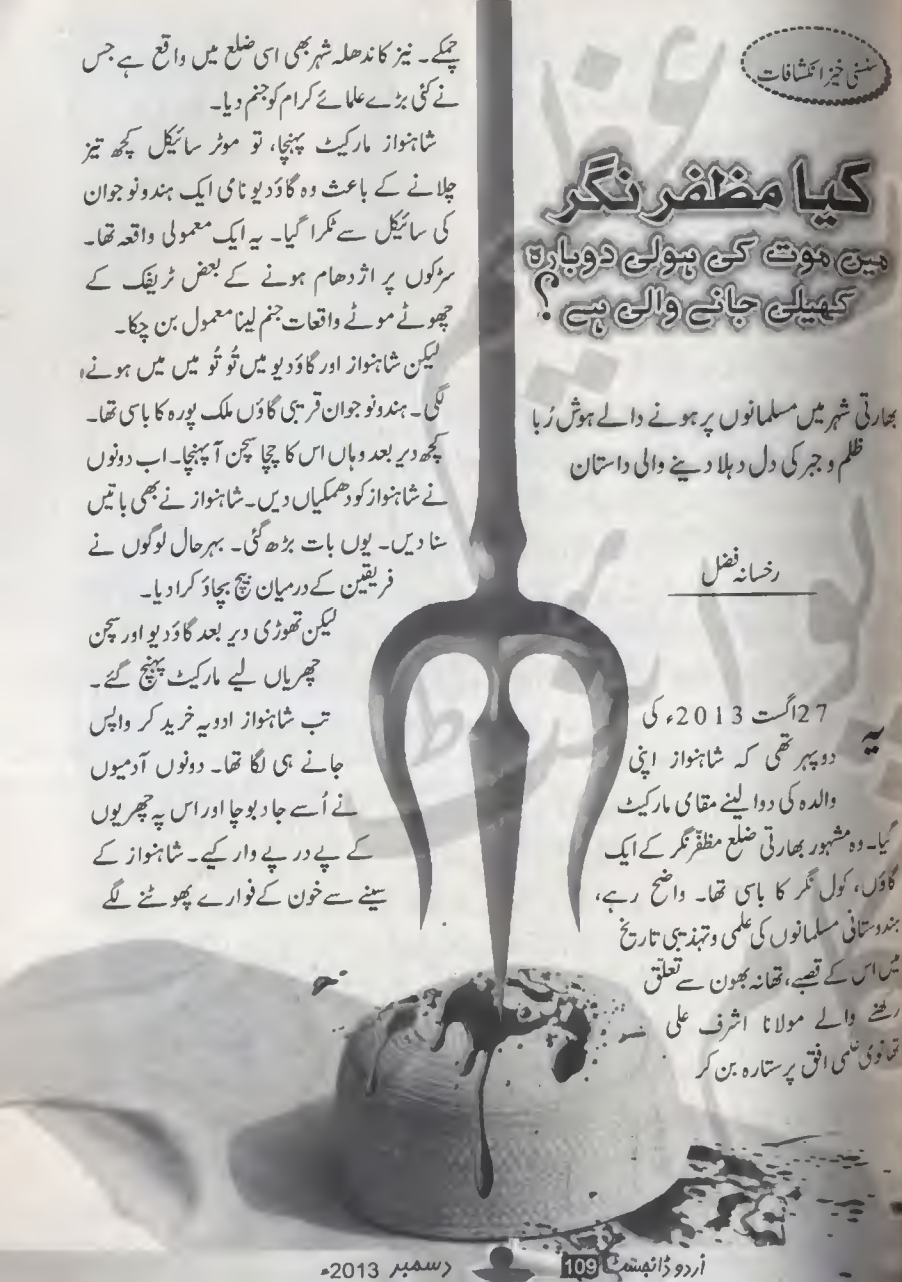

یہ 27 اگست 2013ء کی دوپہر تھی کہ شاہنواز اپنی والدہ کی دوا لینے مقامی مارکیٹ گیا۔ وہ مشہور بھارتی ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں، کول نگر کا باسی تھا۔ واضح رہے، ہندوستانی مسلمانوں کی علمی و تہذیبی تاریخ میں اس کے قصبے، تھانہ بھون سے تعلق رکھنے والے مولانا اشرف علی تھانوی علمی افق پر ستارہ بن کر چمکے۔ نیز کاندھلہ شہر بھی اسی ضلع میں واقع ہے جس نے کئی بڑے علمائے کرام کو جنم دیا۔

شاہنواز مارکیٹ پہنچا، تو موٹر سائیکل کچھ تیز چلانے کے باعث وہ گاؤدیو نامی ایک ہندو نوجوان کی سائیکل سے ٹکرا گیا۔ یہ ایک معمولی واقعہ تھا۔ سڑکوں پر اژدھام ہونے کے بعض ٹریفک کے چھوٹے موٹے واقعات جنم لینا معمول بن چکا۔

لیکن شاہنواز اور گاؤدیو میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ ہندو نوجوان قریبی گاؤں ملک پورہ کا باسی تھا۔ کچھ دیر بعد وہاں اس کا چچا سچن آ پہنچا۔ اب دونوں نے شاہنواز کو دھمکیاں دیں۔ شاہنواز نے بھی باتیں سنا دیں۔ یوں بات بڑھ گئی۔ بہرحال لوگوں نے فریقین کے درمیان بیچ بچاؤ کرا دیا۔

لیکن تھوڑی دیر بعد گاؤدیو اور سچن چھریاں لیے مارکیٹ پہنچ گئے۔ تب شاہنواز ادویہ خرید کر واپس جانے ہی لگا تھا۔ دونوں آدمیوں نے اُسے جا دبوچا اور اس پہ چھریوں کے پے در پے وار کیے۔ شاہنواز کے سینے سے خون کے فوارے پھوٹنے لگے

اور وہ چیخنے لگا۔

کول نگر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور اس وقت مارکیٹ میں شاہنواز کے دوست بھی موجود تھے۔ بلکہ انھوں نے معاملہ ٹھنڈا کرایا تھا۔ اب گاؤدیو اور سچن کا ظلم دیکھ کر جہانگیر، نسیم، بلو، نجیم وغیرہ مسلم نوجوانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انھوں نے جوش غضب میں چاقو مار کر دونوں کو وہیں مار ڈالا۔ اسی دوران میں شاہنواز بھی زخموں کی تاب نہ لاکر ہلاک ہو چکا تھا۔

یہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا جس نے معمولی حادثے سے جنم لیا۔ المیہ یہ ہے کہ علاقائی انتہا پسند ہندو راہنماؤں نے اس واقعے کو ہندو، مسلم فساد کا رنگ دے ڈالا۔ انھوں نے پھر ضلع میں ہندوؤں کے جذبات مشتعل کرنے کی خاطر کئی عیارانہ اقدامات کیے۔

انھوں نے سب سے پہلے گاؤدیو کے والدین کو یہ پٹی پڑھائی کہ یہ مشہور کر دو: ''شاہنواز ان کی بیٹیوں کو چھیڑتا تھا۔ جب گاؤدیو اور سچن نے اُسے للکارا، تو بات قتال تک پہنچ گئی۔''

بھارتی میڈیا نے خبروں میں واقعے کا یہی جھوٹا پہلو شد و مد سے ابھارا اور مشہور ہو گیا کہ ایک مسلمان نوجوان ہندو لڑکیوں کو چھیڑتے ہوئے ان کے بھائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس خبر نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ضلع مظفر نگر ہی نہیں مشتعل اضلاع میں بھی ہندو مسلم فساد کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔

انتہا پسند بھارتی جماعت، بی جے پی کے مقامی راہنماؤں نے اپنی اشتعال انگیز تقاریر کے ذریعے اس آگ کو خوب بھڑکایا حتیٰ کہ بی جے پی کے ایک ریاستی رکن اسمبلی، سنگیت سوم نے جعلی وڈیو فیس بک پر اَپ لوڈ کر دی۔ اس میں مسلمان لڑکے ایک ایسے لڑکے کو ... رہے تھے جو ہندو لگتا تھا۔ اس وڈیو نے بھی ہندو ... میں اشتعال پھیلایا۔ بعد ازاں انکشاف ہوا کہ یہ وڈیو ... کراچی پاکستان میں بنائی گئی تھی۔

گھر کے بھیدی کی شہادت

ڈیلی بھاسکر (Daily Bhaskar) کا ... بھارت کے بڑے اخبارات میں ہوتا ہے۔ 27 ستمبر ... اخبار کے دو صحافی حقائق جاننے کی خاطر کول نگر پہنچے ... حُسن اتفاق کہ صحافیوں کی ملاقات ان دو لڑکیوں سے ... ہو گئی جنھیں شاہنواز نے چھیڑا تھا۔ ان لڑکیوں نے ... حقیقی داستان کچھ یوں سنائی: ''27 اگست کی دوپہر ... اسکول سے واپس آ رہی تھیں۔ ہمارا بھائی، گاؤدیو ... سائیکل پہ ہمارے ساتھ تھا۔ راستے میں شاہنواز کی مو... سائیکل ہماری سائیکل سے ٹکرا گئی۔ اس کے بعد بھا... اور شاہنواز میں گرما گرم بحث ہونے لگی۔ اسی دوران ... ہمارے چچا، سچن وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے ہمیں گھ... جانے کو کہا اور ہم وہاں سے چلے آئے۔''

ڈیلی بھاسکر کے صحافی نے لڑکیوں سے دریافت کیا: ''کیا شاہنواز نے آپ کو کبھی تنگ کیا تھا؟''

لڑکیوں نے جواب دیا: ''ہم نے تو اس دوپہر کے ... بار شاہنواز کو دیکھا۔''

یہ شہادت عیاں کرتی ہے کہ علاقائی انتہا پ... ہندوؤں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ ... مشہور کیا کہ ایک مسلم نوجوان ہندو لڑکیوں کو چھیڑ ... تھا۔ چناں چہ لڑکیوں کے ''باغیرت'' بھائیوں نے ا... عزت کی خاطر جان قربان کر دی۔

دونوں ہندوؤں کو قتل کرنے والے مسلمان نوج...

فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ چناں چہ ہندو یہ واویلا بھی کرنے لگے کہ مقامی انتظامیہ مسلمانوں سے ملی ہوئی ہے۔ انھوں نے پھر ملزمان کی گرفتاری کے لیے بڑے جلسے منعقد کیے جن میں انتہا پسند ہندو راہنماؤں نے مسلمانوں کے خلاف خوب زہر اُگلا۔ یوں انھوں نے عام ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا دیا۔

ستمبر کو مظفر نگر شہر میں ایک پُراسرار واقعہ رونما ہوا۔ وہاں ہندوؤں کا اکٹھ (ہندھ) ہوتا تھا۔ اکٹھ میں جانے والے ہندوؤں پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کر دی۔ اس کے بعد علاقے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ مظفر نگر میں ہندوؤں پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ حالانکہ گولیاں چلانے والے نامعلوم افراد تھے جو آن کی آن میں غائب ہو گئے۔

اس واقعے کے بعد بی جے پی، آر ایس ایس اور دیگر انتہا پسند ہندو جماعتوں کے غنڈے و کارکن دیہات و قصبات میں آباد مسلمانوں پر حملے کرنے لگے۔ اس دوران ایک بار پھر انسان، حیوان بن بیٹھا اور دہشت و درندگی کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر دیکھنے کو ملے۔ مظفر نگر ڈسٹرکٹ ہسپتال کے ڈاکٹروں کا کہنا ہے: ''ہم نے ایسے وحشیانہ انداز میں کٹی پھٹی لاشیں دیکھیں کہ دو دن تک ہم سے کھانا نہیں کھایا گیا اور راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ (بحوالہ وی ٹائم آف انڈیا)۔

مسلمانوں کے اس قتل عام میں سیکڑوں مرد، عورتیں اور بچے شہید ہوئے۔ گو سرکاری اعلان کے مطابق 49 افراد قتل کیے گئے۔ پچاس ہزار سے زائد مسلمانوں کو بے گھر کر دیا گیا۔ نیز کئی عورتوں کو عصمت دری کا نشانہ بننا پڑا۔ حملہ آوروں نے ایسی وحشت ناک درندگی کا مظاہرہ کیا کہ بے گھر مسلمان واپس جانے کو تیار نہیں۔ خوف و دہشت نے انھیں زندگیوں ہی سے مایوس کر دیا۔

فساد کی اصل وجہ

غیر جانب دار بھارتی صحافیوں اور دانشوروں کی تحقیق یہ چشم کشا انکشاف کرتی ہے کہ انتہا پسند ہندو راہنماؤں نے ریاست اتر پردیش میں اپنی طاقت بڑھانے کی خاطر ہندو مسلم فساد کا گھناؤنا کھیل کھیلا۔

دراصل الیکشن 2009ء میں مظفر نگر اور دیگر قریبی

اختصاریے

☆ مقاصد اور نصب العین سے متاثر ہو کر ساتھ دینے والے ہمیشہ نظام کی بہتری کا حصہ بنتے ہیں۔ رپوٹ اور سرگرمیوں سے مرعوب ہو کر ساتھ دینے والے ہنگامی ساتھ نبھاتے ہیں۔

☆ صاحب علم جاننے کے بعد بے نیازی برتتا ہے۔ جاہل جانے بغیر حالات سے بے پروائی اختیار کرتا ہے۔ اچھے یا بُرے نتائج ہی میں بات فرق کرتی ہے۔

☆ غیر ذمہ دار، لایعنی فضول اور بے کار گفتگو انجام سے غفلت اور بے خبری کی واضح علامت ہے۔

☆ ہر مکر، ترکیب، فریب، فن اور ہنر جو کسی اخلاقی اور فکری ضابطے کے بغیر ہوتا ہے، ماحول میں فتنہ و فساد پیدا کرتا ہے۔

☆ سچ صرف کہہ دینے کا نام نہیں اس کے ساتھ نیت و ارادے کی پختگی اور حسن عمل بھی درکار ہے۔

☆ ایک سچ کہہ کر ہم اجتماعیت میں فتنہ و انتشار پیدا کر دیتے ہیں اور یہ فتنہ انگیزی قتل سے بڑھ کر جرم ہے۔

(عاصمہ غنی)

اضلاع میں آباد جاٹ ہندوؤں اور مسلمانوں نے انتخابی اتحاد کر کے راشٹریہ لوک دل کو ووٹ دیا تھا۔ اسی بنا پر جماعت 11 ریاستی نشستیں جیتنے میں کامیاب رہی۔

راشٹریہ لوک دل پہلے بھارتیہ جنتا پارٹی کی ساتھی تھی۔ لیکن 2011ء میں اس نے کانگریس سے اتحاد کرلیا۔ دوسری طرف ریاست اتر پردیش میں موجودہ حکمران جماعت، سماج وادی پارٹی اور بھارتیہ جنتا پارٹی قریب آگئیں۔ چناں چہ وسطی اتر پردیش: مظفرنگر، تاملی، باغپت وغیرہ میں ہندو جاٹ اور مسلم اتحاد توڑنے کی خاطر انتہا پسند ہندو راہنماؤں نے ایک معمولی حادثے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے مسلمانوں کے قتل عام میں بدل ڈالا۔

مقصد یہ تھا کہ اگلے سال کے الیکشن میں راشٹریہ لوک دل یہاں سے کامیاب نہ ہونے پائے۔ ان کا مکارانہ منصوبہ کامیاب رہا۔ اب وسطی اتر پردیش میں مسلمانوں اور جاٹ ہندوؤں کے مابین ایسی وسیع خلیج پیدا ہو چکی ہے جسے شاید وقت ہی ختم کر سکے گا۔

سیتا رام یچری کا انتباہ

چنائے سے تعلق رکھنے والے سیتا رام یچری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سینیئر لیڈر ہیں۔ انھوں نے مسلمان خاتون صحافی، سیما چشتی سے شادی کر رکھی ہے۔ جب مظفرنگر میں انتہا پسند ہندو مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل چکے، تو سیتا رام نے کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار، پیپلز ڈیموکریسی میں ایک چشم کشا اداریہ لکھا۔ اس اداریے سے اقتباس درج ذیل ہیں:

''مظفرنگر کا ہندو مسلم فساد دراصل خطرے کی گھنٹی ہے۔ اس وقت بی جے پی کی باگ ڈور آر ایس ایس کے راہنما سنبھال چکے اور وہ ہندو مسلم اختلافات کو زیادہ سے زیادہ ہوا دے کر ہی ہندوؤں کے ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

''اگر حکومت وقت نے انتہا پسند ہندوؤں کو روکنے کی خاطر اقدامات نہ کیے تو وہ آگے چل کر بھارت بھر میں ہندو مسلم فسادات کرا سکتے ہیں۔ اتر پردیش میں ہزارہا مسلمانوں کے قاتل، نریندر مودی کا دست راست، امیت شاہ بہت سرگرم ہے۔ وہ کچھ عرصہ قبل اجودھیا میں ''رام مندر'' تعمیر کرنے کی شپت (قسم) لے چکا تھا۔ لہٰذا اس کی بھرپور کوشش ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات زیادہ سے زیادہ ابھارے جائیں تاکہ رام مندر کی تعمیر میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔''

سیتا رام کا درج بالا اداریہ افشا کرتا ہے کہ اگلے سال انتخابات کے موقع پر خصوصاً اتر پردیش کے مسلمانوں پر انتہا پسند ہندو اپنی مکارانہ چالوں سے قیامت و آفت ڈھا سکتے ہیں۔ لہٰذا انھیں بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔ ورنہ ہندو اکثریت دوبارہ ان گنت مسلم بچوں، خواتین اور مردوں کو موت کی نیند سلا دے گی۔

اس وقت مسلمانانِ بھارت معاشرتی اور معاشی طور پر جس زوال و ابتری کے دور سے گزر رہے ہیں، اُسے دیکھ کر قائد اعظم اور دیگر بانیانِ پاکستان کی فراست و دور بینی کا احساس ہوتا ہے۔ موجودہ پاکستانی علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہوتے لیکن ایک ارب ہندوؤں نے کبھی نہ کبھی ان پر بھی حملہ آور ہو جانا تھا اور کیا خبر کہ ان علاقوں کے مسلمان بھارتی مسلمانوں کی طرح پس ماندہ و ناخواندہ ہوتے اور الگ تھلگ بستیوں میں رہنے پر مجبور کر دیے جاتے۔ ○○○

آپ کا بچہ

تربیت کے بنیادی اصول

بچے کی دماغی، جذباتی اور معاشرتی ترقی کا راز بہت کم لوگ جانتے ہیں

بائل نقوی

آج کے بچے، کل کی قوم بنیں گے، لہٰذا ایک ایسی قوم کی تعمیر کے لیے جس کے افراد کے جسم توانا اور دماغ صحت مند ہوں، بنیادی اینٹ ہی سے توجہ کی ضرورت ہے۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ بچے کی تربیت اس وقت سے ہونی چاہیے جب وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق ہو جائے، چناں چہ مہذب ملکوں میں یہ زمانہ ساڑھے تین برس کی عمر سے شمار کیا گیا ہے۔ لیکن جدید تحقیقات نے اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ اصل میں بچے کی تربیت کا زمانہ پیدائش کے وقت ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ گردوپیش کے حالات اس وقت ہی سے بچے کے ذہن پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔ اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ولادت کے فوراً بعد بچے کے ایک کان میں تکبیر، دوسرے میں اقامت کہی جائے۔ ہمارے ہاں اولاد کی تربیت کے معاملے میں بڑی بے پروائی برتی جاتی ہے۔ چونچلوں کا عنصر زیادہ اور تربیت کا بہت کم ہوتا ہے۔ بچے کی حرکات وسکنات کو توجہ کے قابل سمجھا جاتا ہے نہ اس کے کھانے پینے اور سونے کا کوئی نظام ہوتا ہے۔ نہ کسی اصول کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ نتیجتاً بہت سے ہونہار بچے برباد ہو جاتے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ کی اس اشاعت سے ایک سلسلۂ مضامین کی ابتدا کی جاتی ہے جس سے بچے کی تربیت کے تمام پہلو سامنے آجائیں گے اور جو والدین اور اولاد دونوں کے حق میں یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

بچہ خلا میں نہیں، خاندان میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس دنیا میں آتے ہی خاندان کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ یہی مختصر سا ماحول اس کی دنیا ہوتی ہے اور اسی کے مطابق نامعلوم طور پر وہ اپنی زندگی ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی خوشی و ناخوشی، اس کے

رجحانات و مرغوبات اور اس کی آیندہ زندگی کی کامیابی و ناکامی کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے۔

والدین اپنے نومولود کے بارے میں جو ابھی جھولے میں پڑا ہوتا ہے اپنے دلوں میں بڑی خوش آیند امیدیں رکھتے ہیں۔ معاشرے میں وہ کیا کردار ادا کرے گا، اس کا علم نہ ہونے کے باوجود ننھی سی جان کی بابت جو توقعات قائم کی جاتی ہیں، بعض اوقات بچہ ان سے زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی نہ سہی، تاہم اس کے دل و دماغ اعلیٰ اوصاف سے آراستہ ہو سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان سے کام لینے کا اُسے موقع نہ ملے اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ تازندگی وہ ان سے آگاہ ہی نہ ہو پائے۔ والدین کا فرض ہے کہ بچے کی خداداد صلاحیتوں کو پہچانیں اور انھیں بروئے کار لانے کے لیے اس کو مواقع بہم پہنچائیں۔

بچے کے ساتھ والدین کی بے لوث اور شدید محبت تو فطری بات ہے، لیکن اس احساس سے اور اضافہ ہوجاتا ہے کہ اس کمزور اور معصوم ہستی کے مستقبل کا انحصار ہماری عقل و فہم اور بچے کی صلاحیتوں کے اظہار پر ہے۔

بچے کی اعلیٰ اور ہمہ پہلو نشوونما سے متعلق بہت سی باتیں ابھی تک سائنس کو معلوم نہیں ہو سکی ہیں۔ مادی نشوونما کے علاوہ ہم اس کی دماغی، جذباتی اور معاشرتی ترقیوں کا راز بہت کم جانتے ہیں۔ بہرحال پہلے کی نسبت معلومات میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلۂ مضامین میں بچے کے روزِ پیدائش سے سنِ بلوغت تک، اس کی روزانہ زندگی میں پیش آنے والے حالات اور واقعات پر طبی اور فلسفیانہ بحث سے ہٹ کر سادہ طریقے سے روشنی ڈالی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ کن ذرائع سے کام لے کر والدین بچے کی تربیت میں اس کے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں کہ وہ ایک تندرست اور بالغ نظر فرد کی حیثیت سے سوسائٹی میں اپنی جگہ بنانے کے قابل ہو جائے۔ وہ والدین جو اپنی اولاد کی تربیت کے کسی درجے میں کسی مشکل مسئلے سے پریشان ہیں، انھیں ان مضامین میں کہیں نہ کہیں اس کا مناسب حل ضرور مل جائے گا۔

بچے کی تربیت کا آغاز ہم اس کے یومِ پیدائش سے قرار دیتے ہیں۔ اسی دن سے ہر نیا واقعہ اسے کچھ نہ کچھ ضرور سکھاتا ہے اور اپنا کوئی ایسا اثر چھوڑ جاتا ہے جو بچے کو کسی بات کی ترغیب دینے یا روک دینے کا کام کرتا ہے لیکن یہ اثرات اچھے ہوں یا بُرے مستقل نہیں ہوتے، کوشش سے زائل کیے جاسکتے ہیں۔

پرورش اور تربیت کے دوران ماں باپ کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اولاد کی تمام صلاحیتیں امکانی حد تک نشوونما پائیں، لیکن اگر جلد بازی سے کام لیا گیا اور بچے کی بساط کو نگاہ میں نہ رکھا گیا، تو ان کی آرزو کبھی پروان نہ چڑھ سکے گی۔ اگر ان دو باتوں کو ذہن میں رکھ لیا جائے، تو بچہ اور والدین دونوں کے حق میں مفید ہوں گی۔ اوّل یہ کہ غلطیوں سے کوئی بشر خالی نہیں۔ دوسرا یہ کہ بچہ انھیں معصوم فرشتہ نہیں سمجھتا، نہ ان کے فرشتہ بن جانے کی توقع رکھتا ہے۔ اس کے بعد والدین کو بچے کی اصلاح اور ترقی کے لیے اور خود بچے کو ابھرنے کے لیے بہت سے امکانات میسر آجائیں گے۔

والدین کا مقصد یہی نہیں ہوتا کہ ان کی اولاد صرف اسکول کی حد تک کامیاب اور اچھے کردار کی مالک بن جائے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ عملی زندگی میں حصہ لینے کے وقت معاشرے کا ایک معزز فرد اور شریف شہری ثابت ہو، زندگی کی حقیقتوں کو سمجھ کر ان سے نمٹنے پر قادر ہو۔ اپنی ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکے، الجھنوں اور

پریشانیوں سے گھبرا نہ جائے۔

اولاد کو اس معیار پر تیار کرنے کی غرض سے والدین کو مختلف تدابیر اختیار کرنا پڑیں گی۔ ایک طریقے کی ناکامی کے بعد دوسرے طریقے کو آزمانا ہوگا۔ انھیں بڑی دانش مندی، دوراندیشی، احتیاط اور تحمل سے کام لینا ہوگا، لیکن اگر انھیں اولاد سے صحیح معنوں میں محبت ہے، تو وہ نئی نئی اسکیموں کو چلانے اور نتیجے کا انتظار کرنے میں پریشان ہوں گے، نہ ہی اپنی غلطیوں سے بددل ہوں گے اور نہ تربیت پر اس کا کوئی منفی اثر مرتب ہوگا۔ بس اتنا خیال رہنا چاہیے کہ یہ ساری کوشش اولاد کی فلاح و بہبود کی خاطر ہو رہی ہے۔

بچے کی تربیت کو حکمت کا کوئی باریک نکتہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کے بنیادی اصول بڑے سیدھے سادے ہیں۔ کسی خاص زحمت کے بغیر یہ کام خوشی اور سکون کے ساتھ انجام دیا جاسکتا ہے۔ تربیت کی رفتار مدھم ہوتی ہے اور صرف ایک ہی رات میں خاطرخواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ اور آسان طریقوں سے بچے کو تربیت قبول کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے۔ شیرخوارگی سے لے کر لڑکپن تک بچے کو ایک وقت میں صرف ایک بات سکھانی چاہیے۔

شروع شروع میں بچہ صرف چند باتوں کا اظہار کر سکتا ہے۔ بھوک لگنے پر روتا ہے، تکلیف سے چلّانے لگتا ہے۔ ان دنوں میں وہ دو خطروں کا احساس کرتا ہے۔ شور سے چونک پڑتا ہے اور گر جانے سے ڈرتا ہے۔ یہ امر کہ بچہ اس کیفیت کے اظہار پر قادر ہے جو اس پر واقع ہوتی ہے، تربیت کو آسان بنا دیتا ہے۔ جتنا زیادہ وہ بیرونی اثرات کو قبول کرنے کے قابل ہوگا، اتنی ہی بہتری سے اس کی جسمانی، دماغی، جذباتی اور معاشرتی اعتبار سے بہتر نشوونما ہوگی۔

(1) قدرت کا ایک سادہ قانون جس پر بچے کی تربیت کا سنگِ بنیاد رکھنا چاہیے، یہ ہے کہ وہ اس کام کو بار بار کرے گا جس سے اس کو خوشی اور فرحت حاصل ہوگی اور اس چیز کو دور کرنے کی کوشش کرے گا یا خوف زدہ رہے گا جو اس کی تکلیف یا پریشانی کا سبب بنے گی۔ فرض کیجیے کہ ایک بچے کو وقت سے پہلے بھوک لگ جاتی ہے اور ماں اُسے دودھ نہیں دیتی تو وہ رونا شروع کر دیتا ہے اور یہ بات اس کی تکلیف کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ اس طرح ہوتے ہوتے کچھ روز میں وہ سیکھ جائے گا کہ وقت سے پہلے رونے سے کچھ نہیں ہوتا، اس کی تکلیف ہی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس سے وہ دو باتیں سیکھے گا: ایک یہ کہ عارضی تکلیف کا اثر قبول کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ اثر قبول کرنے سے تکلیف میں اضافہ ہوجاتا ہے؛ البتہ اگر اسے مقدار سے کم خوراک دی گئی ہے، تو وقت سے پہلے اس کا رونا ایک فطری تقاضا ہوگا۔

تربیت کا کام اس کے بغیر ممکن نہیں کہ بچے کو کسی نہ کسی ناکامی کا تجربہ کرایا جائے۔ بچہ قدرتی طور پر اس بات کے لیے روتا ہے یا اس چیز کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے جس کی اُسے خواہش ہوتی ہے۔ اس کے حاصل نہ کر سکنے یا روک دیے جانے پر وہ کبھی غصے سے بھر جائے گا۔ کبھی خوف زدہ ہو جائے گا۔ غصہ اور خوف، آدمی کو پریشان کر دینے والی چیزیں ہیں۔ انھیں وہ اس وقت ختم کر سکتا ہے جب سمجھ لے کہ کسی نامرغوب بات کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں یا اس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ موجود ہے۔ ناکامی انسان کو ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی عادت ڈالتی ہے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہوجائے گی۔

(2)ایک بچہ کسی اونچی الماری پر ایک سیب دیکھتا ہے۔ اس کے دل میں سیب لینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ بار بار اُچھلتا ہے، سیب کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، مگر وہاں تک پہنچ نہیں سکتا۔ آخر رنج اور غصے میں بھر کر کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ اب اسی سیب کو اس کی عمر کا ایک دوسرا بچہ دیکھتا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کمرے کی ایک کرسی گھسیٹ کر الماری کے ساتھ لگا دیتا ہے اور کرسی پر کھڑے ہو کر ہاتھ سیب تک پہنچاتا ہے اور اُسے اٹھا لیتا ہے۔ وہی قوت جسے پہلا بچہ بے کار کوشش اور غصے میں ضائع کر دیتا ہے دوسرا اپنی اُسی قوت کو سوچ بچار اور صحیح عمل میں لگاتا ہے اور بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ یعنی جس قدر جلد بچہ اپنی مشکل کو پریشانی اور تکلیف کا موجب بنانے کے بجائے اس کا حل ڈھونڈنا سیکھ لے گا اسی قدر اس کے حق میں بہتر ہوگا۔

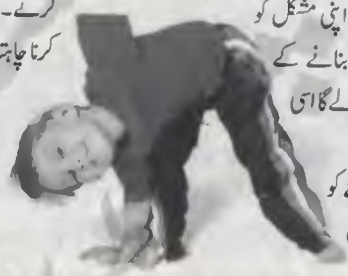

کسی بگڑے ہوئے بچے کو اپنی کسی دشواری کا علاج سوچنے کے ناقابل دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے جس طرح ایک شیر خوار بچہ یہ جان کر کہ بے وقت دودھ کے لیے رونے سے کچھ حاصل نہیں، رفتہ رفتہ رونا چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح ایک بڑی عمر کا بچہ اپنی خواہش ترک کر سکتا ہے۔ اگر اُسے احساس ہو جائے کہ مجھ سے اس کی توقع کی جا رہی ہے۔ یہ آمادگی اور بھی بڑھ جائے گی اگر اس کو یقین ہو جائے کہ اس خواہش کے بجائے آیندہ میرے لیے اس سے بہتر صورت پیدا کر دی جائے گی۔ مگر یہ بات بچہ جلد نہیں سیکھ سکتا، کیونکہ ضروری نہیں کہ کسی محرومی کا ازالہ فوراً ہی ہو جائے۔

(3)مثال کے طور پر ایک بچہ اپنے جیب خرچ کی کچھ رقم سائیکل خریدنے کے لیے بچاتا رہتا ہے۔ عرصے تک اُسے اپنی دوسری خواہشات کو دبانا پڑتا ہے لیکن اُن محرومیوں کا صلہ آخر کار اُسے اپنے ایک بڑے مقصد میں کامیابی، یعنی سائیکل خریدنے کی صورت میں مل جائے گا۔

اگر بچہ اپنے گردوپیش کی مختصر سی دنیا کو محبت و شفقت سے بھرا ہوا پائے گا تو اس کے دل میں وسیع دنیا کے لیے ہمدردی کے جذبات جنم لیں گے۔ وہ عام انسانیت کے ساتھ رشتۂ یگانگت قائم کر لے گا۔ کسی سے خوف زدہ نہیں ہوگا۔ مختلف حالات پیش آنے پر اُس کی قوتِ فیصلہ اس کی راہنمائی کرتی جائے گی۔ وہ جلد ہی یہ محسوس کر لے گا کہ حالات ہمیشہ کسی کی منشا کے مطابق امید افزا نہیں ہوا کرتے۔ اگر وہ دیکھے گا کہ جس علم یا ہنر میں ترقی کرنا چاہتا ہے، حالات اس کے لیے سازگار نہیں ہیں تو وہ کوئی دوسرا مناسب میدانِ عمل انتخاب کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پائے گا۔ آہستہ آہستہ اس کی شخصیت مکمل ہوتی جائے گی اور وہ سوسائٹی کا ایک نمایاں اور کامیاب فرد بن جائے گا۔

بچے کی تعلیم کا پروگرام بناتے وقت اس کے فطری رجحانات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ لازم نہیں کہ بچے کی سبھی عادتیں پسندیدہ ہوں۔ عادتوں کی اصلاح اس دانائی کے ساتھ کی جائے کہ وہ پسندیدہ اطوار میں تبدیل ہو جائیں۔ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ رجحانات کا رخ ایسی کارآمد باتوں کی طرف موڑ دیا جائے جو بچے اور سوسائٹی کے لیے نفع بخش ہوں۔

ماں باپ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد کو عارضی کے بجائے دائمی راحت نصیب ہو۔ ان کی محبت یہ تقاضا بھی

کرتی ہے کہ حتی الامکان اولاد کی ہر خواہش پوری کی جائے اور وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بچہ صرف ان خواہشوں کے پورا نہ ہونے پر بے چین ہو جاتا ہے جو اس کے لیے نہایت ضروری ہوتی ہیں، لہٰذا ان باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر انھیں اس کی خواہشیں پوری کرنے کا انتظام کرنا چاہیے۔

تربیت کا فرض اگر والدین صحیح اصولوں اور کامل اعتماد کے ساتھ ادا کر رہے ہیں، تو کوئی ایسی دشواری پیش نہیں آ سکتی جس پر قابو نہ پایا جا سکتا ہو، خاص کر اس صورت میں جبکہ بچے کے حالات کا گہرا مشاہدہ بھی کیا جاتا ہو اور پہلے کے بنائے ہوئے پروگرام پر ضد اور اصرار بھی نہ ہو۔ بہتر ہے کہ والدین اپنے آپ سے یہ سوال کرتے رہیں کہ ہم اپنی اولاد کی بابت ہر وقت کیوں سوچتے رہتے ہیں اور اس کا جواب زمانے کی کورانہ تقلید اور عام رسم و رواج سے ہٹ کر تلاش کریں۔ انھیں بہت سی مفید باتیں معلوم ہوں گی۔

(4)تعلیم ایک تدریجی اور سُست عمل ہے، لہٰذا بچے پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، نہ ہر غلطی پر ڈانٹ ڈپٹ کی جائے، بچہ خود بخود سمجھنے لگے گا کہ مجھے غلطیوں کی روک تھام کی کوشش کرنا چاہیے اور اس طرح اپنی ناکامیوں کے ردِعمل کے لیے اس میں ایک جذبہ پیدا ہوگا، مثلاً: بچہ جب پہلے پہل چلنا شروع کرتا ہے اور پہلا قدم ہی اٹھانے پر گر پڑتا ہے، تو وہ اسے ایک حادثہ سمجھے گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوگا اور پھر قدم اٹھائے گا، پھر گرے گا۔ مسلسل وہ یہی کرتا رہے گا۔ اس امید کے ساتھ کہ اب کی مرتبہ ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس موقع پر سہارا دینے کے بجائے اگر اُس کی حوصلہ افزائی کی گئی تو وہ چلنے کا سوال خود حل کر لے گا۔

یہ سمجھ لینے پر کہ تعلیم جلدی نہیں دھیرے دھیرے حاصل ہوتی ہے اور اس میں کامیابی کے ساتھ ناکامیاں بھی ہیں، اسے قدرتاً لمبی عمر کی آرزو ہوگی۔ وہ اپنی آیندہ زندگی کے مشاغل کو سامنے رکھ کر تعلیم حاصل کرے گا اور اس میں اعلیٰ مہارت حاصل کرنے کی اس لیے کوشش کرے گا کہ یہ چیز اُسے سوسائٹی میں احترام اور قدردانی کا مستحق بنا دے گی۔

اپنے ماحول کے مطابق زندگی ڈھالنے کا عمل ہر بچے کے لیے فطری ہے، خواہ اس نے کسی مہذب شہر میں آنکھیں کھولی ہوں یا ریگستان کے کسی وحشی قبیلے میں۔ جب وہ اس منزل سے گزر رہا ہو تو والدین کو اُسے بالکل لکیر کا فقیر نہیں بنانا چاہیے۔ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس کی اپنی ذاتی شخصیت بھی ہے۔ اُسے اپنی انفرادی خصوصیات کے اظہار کا موقع دینا چاہیے۔ وہ ایک مکمل انسان اُسی وقت بن سکتا ہے جب سوسائٹی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھ سکتا ہو۔

(5)سوسائٹی اور فردِ واحد کے ذاتی تقاضے بہت کم یکساں ہوتے ہیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچہ اپنی ذاتی حیثیت سے کیا ہے، وہ خود کیا کرنا چاہتا ہے اور اس کے والدین اور سوسائٹی اس سے کیا توقعات رکھتی ہے۔ اسی تصادم سے بچے کی شخصیت نمایاں اور اجاگر ہوتی ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر ہم بچے سے اس کی عمر اور فطری قابلیت سے زیادہ کی توقع کریں گے، تو ایک طرف یہ توقع پوری نہ ہو سکے گی، دوسری طرف بچے کی ہمت ٹوٹ جائے گی اور جو کوشش وہ کر رہا ہوگا، بددل ہو کر اُس سے بھی ہاتھ اٹھا لے گا، نیز اگر ہم اس بات پر زور دیں گے کہ بچہ ہر قدم ہماری امید کے مطابق اٹھائے، تو وہ پریشان اور غمگین ہو جائے گا جس کا انجام ناکامی و بغاوت کی صورت میں سامنے آئے گا۔

اس کے برخلاف اگر ہم اس کے سن و سال اور سمجھ

کے مطابق قدم اٹھانے دیں، اس احتیاط کے ساتھ کہ یہ ہماری توقع کے خلاف بھی نہ ہو اور اُسے یہ اجازت بھی دیں کہ ایک طرف سے توجہ ہٹا کر کسی دوسری مناسب طرف پھیر سکتا ہے، تو اس کے سامنے اصلاح و ترقی کی راہیں کھل جائیں گی۔ اُسے بہت خوشی ہوگی کہ میں آگے بڑھ رہا ہوں اور اس میں میری اپنی مرضی کو بھی دخل ہے۔ بچے کی تعلیم و تربیت کا یہ پہلو والدین سے غور و فکر، تحمل اور استقلال چاہتا ہے۔ اس سے بچے کے جذبۂ ترقی اور قوتِ عمل کا اندازہ ہو جائے گا۔

(6) والدین کو اپنی اولاد سے اولاد ہونے کی وجہ سے محبت کرنا چاہیے نہ کہ اس لیے کہ وہ بڑی فرمانبردار ہے اور ان کی ہر ہدایت پر عمل کرتی ہے۔ بعض والدین بچے کے کام اور کامیابی پر اتنا زیادہ زور دیتے ہیں کہ وہ پیار کا سبب صرف یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں اسکول میں اچھے نمبر حاصل کرتا ہوں، گھر کے لیے کارآمد ہوں، ادب تمیز سے رہتا ہوں اور والدین کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اس لیے والدین مجھے اچھا سمجھتے ہیں۔ بچے کو یہ سوچنے کا موقع کبھی نہ دینا چاہیے، بلکہ اُسے یہ احساس چاہیے کہ ماں باپ مجھے اپنا لختِ جگر ہونے کی حیثیت سے محبت کرتے ہیں اور اس گھر میں میری بھی ایک انفرادی حیثیت ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا، بچے کی ذات کے متعلق تھا۔ خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بچہ جس خاندان میں پیدا ہوتا ہے وہاں کم از کم دو یا زیادہ افراد ہوتے ہیں۔ ان کے ایک دوسرے کے ساتھ رشتے ناتے ہوتے ہیں۔ ان کے مخصوص اخلاق ہوتے ہیں اور زندگی بسر کرنے کے کچھ اصول بھی ہوتے ہیں۔ خاندان میں نومولود کو کتنا ہی خوش آمدید کیوں نہ کہا گیا ہو، گھر کے نظم و ضبط کو قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ولادت کے بعد معاشرتی، جذباتی اور اقتصادی مسائل بھی پیش آجاتے ہیں۔ کبھی یہ ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں، کبھی سب بیک وقت۔ اگر والدین موقع کی نزاکت اور واقعے کی اصلی نوعیت کو ذہن میں رکھیں اور بچے کی پیدائش کو علیحدہ رکھ کر سوچیں، تو ان سے نمٹنا آسان ہو جائے گا۔

بچے کی ولادت پر والدین عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو یہ بالکل ننھا سا ہے۔ اس کی ضرورتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی آمد گھر کے کسی انتظام میں تبدیلی کا باعث نہیں ہو سکتی۔ ابتدائی چند مہینوں تک بس یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ بچہ صاف ستھرا رہے اور مقررہ وقت پر اُسے خوراک ملتی رہے۔ بعض خاندانوں میں بچے کو غیر معمولی اہمیت دے دی جاتی ہے۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ ہر شخص اُسے خوش و خرم رکھنے اور اپنے خیال کے مطابق آرام پہنچانے میں لگا رہتا ہے۔ باہر کی تفریح اور گھر کے سارے کام دھندے بچے کے آرام و آسائش کے ماتحت ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ، بھائی بہن یا گھر کا کوئی فرد اگر اپنی کسی بات کو بچے پر مقدم رکھے، تو اسے خود غرض کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ حد سے بڑھی ہوئی اہمیت اور بے کار کے چونچلے نہ بچے کے لیے مفید ہو سکتے ہیں نہ گھر والوں کے لیے۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ دوسروں کی طرح بچہ بھی گھر کا ایک فرد ہے۔ ہر ایک کی علیحدہ خواہشیں، ضرورتیں اور دلچسپیاں ہیں، اگر ان باتوں کا لحاظ رکھا گیا تو بچہ اپنا مقام سمجھ لے گا اور اس کے بگڑنے کا کوئی اندیشہ نہ رہے گا۔

بچے کی آسائش اور صحت کے لیے گھر میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور انھیں کس طرح عمل میں لایا جائے کہ کسی دوسرے کے سکون و راحت میں کوئی

خلل نہ پڑنے پائے۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ: (1) گھر میں کتنے آدمی اور کتنے کمرے ہیں۔ (2) ہر ایک کو اس کے ذوق کے مطابق کس سکون و آرام کی ضرورت ہے۔ (3) یہ کہ آپ کی آمدنی کیا ہے۔ (4) گھر کی صفائی، کھانے پینے اور دوسری ضروریات کے لیے اخراجات کی حد کیا ہے۔ (5) اس کے بعد مکان کی گنجائش، کمروں کی تعداد اور اخراجات کو اس طور تقسیم کیا جائے کہ بچے کی تمام ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور دوسرے چھوٹے بڑے ہر ایک کو امکان بھر اس کا حق بھی پہنچ جائے۔

(6) غیر ضروری ایثار و قربانی نہ ہی بچے کی مستقل راحت کا سبب بن سکتی ہے نہ ہی خاندان کے دوسرے افراد کو آرام پہنچا سکتی ہے۔ (7) گھر کا انتظام اس طرح رکھا جائے کہ ہر ایک کو دوسرے کے معاملے میں دخل دیے بغیر آرام ملتا رہے اور ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ (8) اگر باپ چھ بجے کھانا کھانے کا عادی ہے تو بچے کی خوراک کا وقت 4 بجے رکھا جائے۔ (9) اگر کسی وجہ سے باپ کا وقت بدل جاتا ہے تو بچے کے وقت میں بھی تبدیلی کر دینی چاہیے، لیکن یہ خیال ضرور رہے کہ بچے کے لیے جو وقت مقرر ہوا ہے، اس میں فرق نہ آنے پائے۔ وقت کی اس تبدیلی سے بچہ سمجھ لے گا کہ گھر کی دنیا کا مرکز ایک میری ذات ہی نہیں ہے، دوسرے لوگ بھی ہیں جن کی خاطر نظام خانہ داری میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ (10) بچہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے محبت اور مبادیاتِ معاشرت کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ یہ تعلیم اس قسم کی نہ ہو جس سے وہ خاندان میں اپنا کوئی ایسا مقام سمجھنے لگے جو حقیقی نہ ہو اور آیندہ قائم نہ کر سکتا ہو۔

جن ماں باپ کے ہاں بڑے ارمانوں کے بعد اولاد ہوتی ہے وہ اکثر و بیشتر، حد سے زیادہ لاڈ پیار کر کے اسے خراب کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ طریقۂ تربیت سے واقف نہیں، بلکہ غلبۂ محبت انھیں اجازت نہیں دیتا کہ بچے کو کسی بات سے روک سکیں۔ بچے کے بگڑ جانے پر وہ ماہرینِ نفسیات سے رجوع کرتے ہیں، کتابوں کی ورق گردانی اور دوستوں سے مشورے طلب کرتے ہیں، کبھی متضاد مشوروں سے پریشان ہو کر وہ کسی ایک پر کاربند ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے اور کبھی اس بات کو نظر انداز کر کے کہ ہمارے خانگی حالات کہاں تک اجازت دیتے ہیں اور بچے پر اسے استعمال بھی کیا جا سکتا ہے، وہ کسی ایک مشورے پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ سوائے کوفت اور دردسری کے کچھ نہیں نکلتا۔ اگر وہ بچے کا ذہن سمجھنے کی کوشش کرتے اور اس کے ساتھ اپنے اور دوسرے افرادِ خانہ کے تعلق کا صحیح جائزہ لے لیتے، تو انھیں یہ زحمت کبھی نہ برداشت کرنا پڑتی اور نتیجہ سب کے آرام و نفع کی صورت میں برآمد ہوتا۔

> کوئی بھی بچہ ہُو بہُو ماں باپ کے مقرر کیے ہوئے اصول اور معیار کے مطابق آگے نہیں بڑھتا ہے، اس لیے ان کے لیے ضروری ہے کہ بچے کے حالات میں تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیتے رہیں۔

کوئی بھی بچہ ہُو بہُو ماں باپ کے مقرر کیے ہوئے اصول اور معیار کے مطابق آگے نہیں بڑھتا ہے، اس لیے ان کے لیے ضروری ہے کہ بچے کے حالات میں تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیتے رہیں۔ یہ بات کہ ان کے کسی دوست نے اپنی اولاد کی تربیت کا کوئی پروگرام بنایا ہے یا کوئی

خاص طریقۂ تربیت کہیں کارآمد ثابت ہو چکا ہے، ضروری نہیں کہ وہ اسے اپنے بچے پر بھی آزمائیں اور خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہو۔ انھیں اپنے بچے کو ایک علیحدہ شخصیت قرار دے کر اس کے رہنے سہنے، کھانے پینے، تعلیم اور تفریح کا ایسا پروگرام مرتب کرنا چاہیے جو اس کے خصوصی حالات اور خانگی امور سے مطابقت رکھتا ہو۔

زندگی ایک متحرک شے ہے اور اس میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، لہٰذا اولاد کا تعلق بھی والدین کے ساتھ ایک نوعیت کا نہیں رہ سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے مواقع پر کسی کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ تبدیلی کوئی بڑی اہم قسم کی ہے۔ زندگی اور نشوونما کی ہر منزل اپنے مخصوص شوق، رجحانات اور مشاغل رکھتی ہے۔ بعض والدین خیال کرتے ہیں کہ ان کا بچہ اسی وقت تک بھلا تھا جب وہ چھوٹا سا تھا اور بعض اولاد کی جوانی تک اسے ناسمجھ بچہ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ ایسی مائیں دیکھی گئی ہیں جو اپنے 14 رسالہ لڑکے سے ایسا برتاؤ کرتی تھیں جیسے کہ وہ ابھی 4 ربرس کا ہو۔ ایسی اولاد ایک خاص حد کے اندر محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ بچہ ایک بڑھنے والی چیز ہے۔ وہ شیر خوارگی، لڑکپن، عنفوانِ شباب اور شباب کی منزلوں سے گزرے گا۔ والدین کو ہر منزل کے سفر میں اس کی راہنمائی کرنا چاہیے نیز ایک کے بعد دوسرے آنے والے مقام کی کیفیات سے بھی باخبر رہنا چاہیے۔

بچہ خاندان کے مختلف مسائل اور حالات کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ والدین کو باہمی دلی مسرت کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ناگہانی حادثات یا گھریلو تنازعات کے باعث اگر ماں باپ میں سے کسی ایک کو یا کسی دوسرے رشتے دار کو بچے کی پرورش کرنا پڑ جائے، تو تربیت کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ایک ہی فرد کو ماں یا باپ یا دونوں کے فرائض انجام دینا ہوتے ہیں۔ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ بچہ ہر طرح سے خوش رہے اور اپنے لیے کسی ذات کی کمی محسوس نہ کرنے پائے۔ اس صورت میں تربیت کے کئی پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں۔

بچے کی تربیت میں توارث کا سوال بھی آتا ہے لیکن یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ بس اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ جو چیزیں اس کے اخلاق و عادات اور ذہن پر اثر ڈالتی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے۔ بچے پر زیادہ تر ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ گھر، اسکول، رسم و رواج اور خاندانی روایات کے علاوہ معاشرے کا بھی اس میں بڑا دخل ہے۔

بچے کے بڑھنے اور ترقی کرنے کے دوران میں اسے اس احساس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ میری شخصیت محفوظ ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے سگے یا سوتیلے ماں باپ یا وہ شخص جس کے ذمے اس کی پرورش ہو، اس کے ساتھ دل سے محبت کریں اور یہ محبت وقتی طور پر نہیں بلکہ مستقل ہو۔ اس احساس کے بعد بچے میں ترقی کے لیے حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوگا۔ وہ نئے نئے واقعات اور تجربات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرے گا۔

والدین یہ بھی دیکھیں گے کہ بچہ ترقی کی راہ میں بہت سی غلطیاں کرتا ہے، لیکن اگر وہ برداشت سے کام لیں گے اور اس کو یہ احساس دلائیں گے کہ غلطی پر ٹوکنے سے ان کا مطلب راستہ روکنا نہیں بلکہ مشکل مقام آجانے پر ہاتھ پکڑ کر اسے آگے بڑھانا ہے تو وہ خوشی اور ایک دوستانہ فضا کو محسوس کرے گا اور رفتہ رفتہ ان اوصاف سے آراستہ ہو جائے گا جن کی امید والدین کے دل میں پرورش پا رہی ہوگی۔ ○○○

کیا ہم مسقط سے کچھ سیکھ سکتے ہیں؟

ایک ہمسائے ملک سے انوکھی اور دلچسپ معلومات

کبھی وہ اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں زخم زخم تھا

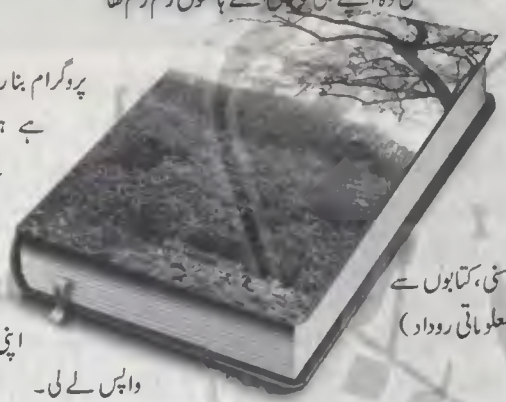

نوید اسلام صدیقی

(آنکھوں دیکھی، کانوں سنی، کتابوں سے پڑھی ایک دلچسپ اور معلوماتی روداد)

'مسقط' جس کا باقاعدہ نام 'سلطنت آف عمان' ہے، پاکستان کا ایک قریبی دوست ملک ہے، پاکستان کے مسقط سے کئی قسم کے رشتے ہیں۔ سب سے خاص بات یہ ہے کہ ہمارے صوبے بلوچستان کا ایک اہم حصہ جس میں گوادر کی بندرگاہ بھی شامل تھی ایک طویل عرصے تک سلطنت آف عمان کے قبضے میں رہا۔ ہندو گوادر میں اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے، تجارت پر اُن کا مکمل کنٹرول تھا، پاکستان بننے کے بعد بھی وہ یہاں رہے، ہندوستان سے بلا روک ٹوک کشتیاں بھر بھر کے افراد اور سامان یہاں آتا رہتا تھا۔ پاکستان کو ایسی اطلاعات مل رہی تھیں کہ اس اہم بندرگاہ کو انڈیا لینے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے ہمارے اس وقت کے کارپردازوں نے وقت پر فیصلہ کیا، اور دس لاکھ پاؤنڈ دے کر اپنی زمین مسقط سے واپس لے لی۔

گوادر کے پاکستان میں شامل ہونے کے بعد بھی بلوچی عمانی فوج میں بھرتی ہوتے رہے۔ بلوچیوں کے لیے روزگار کا مسئلہ تھا اور مسقط کو لڑنے والے افراد کی کمی کا سامنا تھا۔ وقتاً فوقتاً فوجی بھرتی کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ اس طرح وہاں بلوچیوں کی کافی تعداد فوج میں پائی جاتی تھی۔ بلوچی خاندان جن کو وہاں کی نیشنلٹی مل چکی ہے اُن کو البلوشی کہا جاتا ہے۔

☆.....☆

ہماری قسمت میں مسقط کا دانہ پانی لکھا تھا، ہم نے دسمبر 1974ء میں مسقط آرمی کی اکاؤنٹس برانچ میں شمولیت کے لیے درخواست دے ڈالی، جو فوراً ہی منظور ہوگئی، منظوری کی وجہ مسقط جا کر معلوم ہوئی۔

پاسپورٹ ویزہ کے چکر میں پڑے رہے، آخر 9 مئی 1975ء کی رات ہم مسقط ایئر پورٹ پر جا اترے۔ (مسقط ایک شہر کا نام بھی ہے، جو ملک کا دارالحکومت ہے) فوج کا ہیڈ کوارٹر، ایک پرانی چھوٹی سی تاریخی عمارت بیت الفلج میں تھا (بہت خوبصورت اور بڑا نیا ہیڈ کوارٹر 'الرسیل' کے مقام پر زیرِ تعمیر تھا۔ 1980ء میں میری ٹرانسفر وہاں ہوگئی تھی اور میں چھ سال اس ہیڈ کوارٹر میں رہا)۔

اگلے دن ہم نے بیت الفلج میں اپنے پہنچنے کی اطلاع دی۔ ہیڈ کوارٹر میں کچھ پاکستانی (زیادہ تر پنجابی) اور انگریز نظر آئے۔ مجھے بتایا گیا کہ میری تقرری صلالہ میں مقیم 'کے جے' (KJ) یونٹ میں ہوئی ہے۔

ہم نے جب سب کاغذات حاصل کرلیے، تو اس وقت تک وہاں دفتر بند ہونے کا وقت ہوگیا تھا۔ ایک پاکستانی نے میس میں کھانے کی دعوت دی جو ہم نے قبول کرلی، کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد ہمارے میزبانوں سے جو باتیں معلوم ہوئیں وہ بہت دلچسپ تھیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کو ظفار (Dhofar) کے میدان جنگ (war zone) میں بھیجا جارہا ہے، آپ کو اس لیے بلایا گیا ہے کہ آپ جس کی سیٹ پر جارہے ہیں وہ ایک چیک پوسٹ پر فوجیوں میں تنخواہیں تقسیم کرنے گیا تھا، وہاں دشمن نے حملہ کردیا، اس کو ہارٹ اٹیک ہوا اور بعد میں اُس کی موت واقع ہوگئی۔ دوسرے صاحب بولے اگر ظفار (مسقط کے جنوبی صوبے کا نام ہے۔ ظفار کو عربی میں بولتے ہیں دفار اور دفار کے رہنے والے دفاری کہلاتے ہیں) میں آپ نے دو ہفتے گزار لیے، تو آپ ظفار میڈل کے مستحق ہوجائیں گے۔ ایک اور صاحب نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ ضروری نہیں ہے کہ دو ہفتے پورے ہوں، اگر آپ خدانخواستہ دشمن کی کسی کارروائی کے نتیجے میں دو ہفتے مکمل ہونے سے قبل ہلاک ہوجاتے ہیں تب بھی میڈل آپ کا حق ہے، وہ آپ کے ورثا کو پہنچا دیا جائے گا۔

ایک اور صاحب نے خوشخبری سنائی کہ آپ کو وار زون میں رہنے کی وجہ سے ایک خصوصی الاؤنس ملے گا۔ ایک صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس یونٹ میں مجھے بھیجا رہا ہے یہ ایک بلوچ رجمنٹ ہے۔ وہاں آپ کو سب پاکستانی بلوچ نظر آئیں گے۔ صرف چند بڑے آفیسر انگریز ہیں۔ صلالہ میں موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے، جبکہ مسقط کی گرمی سے تو کہتے ہیں شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ مسقط کی گرمی کے حوالے سے ایک صاحب نے دلچسپ لطیفہ سنایا: لطیفہ کچھ یوں تھا کہ جہنم میں کچھ لوگ کمبل اوڑھے ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ کے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے، کسی نے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں، انھوں نے کہا ہم مسقط سے آرہے ہیں۔ پوچھنے والوں نے کہا' مسقط کا نام سن کر سمجھ آگیا ہے کہ آپ نے کمبل کیوں اوڑھے ہوئے ہیں۔

اب وہ سب میری طرف دیکھ رہے تھے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کی باتیں سن کر میں بے حد خوش اور مطمئن ہوں، اور وہ اس لیے کہ وہاں اپنے پاکستانی ساتھیوں کے ساتھ رہنا ہے، موسم بھی وہاں خوشگوار ہے، وہاں جانے سے فوجی میڈل ملے گا، وار زون کا الاؤنس دیا جائے گا۔ ایک صاحب نے مجھے یاد دلایا کہ وہاں جنگ جاری ہے اور اس میں

مرنے کا بہت زیادہ خطرہ ہے۔ میں نے کہا ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے موت کے بارے میں سوچنا ہمارا دردِ سر ہی نہیں، یہ فرشتہ موت کا مسئلہ ہے، کب مرنا ہے، کہاں مرنا ہے، کیسے مرنا ہے۔ جس کا کام وہی جانے ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

اگلے دن مسقط ایئر پورٹ پر صلالہ کی فلائٹ پر روانہ کرنے کے لیے آئے ہوئے فوجی سارجنٹ نے میری ملاقات دو آدمیوں سے کروائی اور بتایا کہ یہ دونوں بھی آپ کی یونٹ KJ (الکتیبہ الجنوبیہ) میں جارہے ہیں۔ وہ دونوں وہاں فوجی کیمپ کے میس میں ویٹر تھے۔ اُن میں سے ایک بہت شریر تھا، اُس کا نام دین محمد تھا، لیکن حقیقت میں ویسا ہی تھا۔ دین محمد بھی مجھ کو ڈراؤنے قصے سناتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ کچھ عرصہ قبل دشمن کے گولے ہمارے کیمپ کے قریب آکر گرے تھے۔ ہر وقت کوئی ڈرا سہما رہتا ہے۔ ہم صلالہ کے ایئر پورٹ پر اُترے، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ دین محمد نے میری توجہ دو جنگی طیاروں کی طرف مبذول کرائی اور بتایا کہ دشمن ایک منٹ ان کو ...م سے نکلنے نہیں دیتا۔ یہ جہاز دشمن کی سرکوبی کے

مسقط میں آباد عمانی عربی

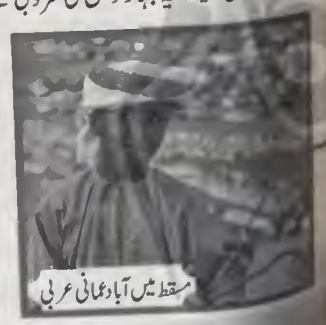

عمان کا ایک قلعہ

لیے روانہ ہوئے ہیں۔ یہ سامنے جو پہاڑ (جبل) نظر آرہے ہیں، ان میں' جبالی ' رہتے ہیں، یہ ایک بڑی ٹیڑھی نسل ہے، یہ سلطان سے بھی مفادات حاصل کررہے ہیں اور دشمن سے بھی دوستی نباہ رہے ہیں۔ ان پہاڑوں میں دشمن بھرا پڑا ہے، ان پہاڑوں میں سیکڑوں غار ہیں، جن میں دشمن نے اسلحہ کے ڈپو اور پناہ گاہیں بنائی ہوئی ہیں۔ برسات میں کئی کئی فٹ اونچی خود رو گھاس پیدا ہوجاتی ہے جس میں دو قدم پر موجود فرد نظر نہیں آتا۔ خدا خیر ہی رکھے، ہم تو بس ہر وقت اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں۔

یونٹ کی ایک گاڑی ہم لوگوں کو یونٹ لے جانے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ گاڑی میں ایک فوجی کلرک محمد صالح بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ میں بلوچی ہوں اور کے جے میں ہی کام کرتا ہوں۔ راستے میں اس نے بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ اُس نے کہا کہ جس کیمپ میں ہم جارہے ہیں، وہ' کے جے' کا کیمپ بننے سے قبل دفار فورس (Dhofar Force) کا ہیڈ کوارٹر ہوتا تھا، اُس میں صرف دفاریوں کو بھرتی کیا جاتا تھا، اُس کا کمانڈنگ آفیسر ایک پاکستانی تھا، اُس کے ساتھ اور بھی کچھ پاکستانی افسر یہاں ہوتے تھے۔ آپ کی جس عمارت میں رہائش ہوگی یہ قبل ازیں

پاکستانی لفٹیننٹ اور کیپٹن لیول کے افسران کی رہائش ہوتی تھی، اب تو نیا آفیسر میس بن چکا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اب دفار فورس کا نیا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟ وہ ہنسا اور اس نے بتایا، میں کیمپ میں داخل ہوتے ہی آپ کو وہ جگہ دکھاؤں گا جہاں 1966ء میں موجودہ سلطان قابوس کے والد جو اس وقت سربراہ مملکت تھے اور جن کا نام سلطان سعید بن تیمور تھا، اُن پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ سلطان کیمپ میں داخل ہوا وہ پاکستانی کمانڈنگ آفیسر کے ساتھ دس پندرہ سپاہیوں کی طرف سے گارڈ آف آنر کا معاینہ کر رہا تھا کہ ایک دفاری نے سلطان پر فائر کرنے کے لیے بندوق سیدھی کر لی، وقت بہت کم تھا، پاکستانی کمانڈنگ آفیسر نے سلطان کو نیچے گرا دیا اور اس کے اوپر لیٹ گیا، سلطان بالکل بچ گیا، کمانڈنگ آفیسر کو گولیاں لگیں، لیکن چونکہ گولی چلانے والا حواس باختہ ہو چکا تھا، اس نے وہاں سے بھاگنے میں ہی خیر جانی، مزید گیارہ بارہ ساتھی بھی بھاگ گئے۔ اس کے بعد 'دفار فورس' کو ختم کر دیا گیا۔ دفاریوں کو راضی اور خوش کرنے کے لیے سلطان نے بہت جتن کیے، یہاں تک کے اُس نے شادی بھی ایک 'دفارن' سے کر لی تھی، سلطان سعید گورا تھا، دفارن کالی تھی، موجودہ سلطان اپنی والدہ کی طرح کالا ہے، اس سے دفاری بہت خوش ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑی بات ہے کہ دفار پر ایک دفاری حکومت کر رہا ہے۔

میں نے پوچھا کیا دفاری اور جبالی علیحدہ علیحدہ نسلیں ہیں یا ایک ہی نسل کے دو نام ہیں۔ محمد صالح نے بتایا کہ میدانی علاقے میں رہنے والے دفاری کہلاتے ہیں ان کے نقوش افریقیوں سے ملتے ہیں، جبالی تو عرب ہیں اور صدیوں سے یہیں رہنے والے ہیں۔

اسی اثنا میں ہم ام المعارف پہنچ چکے تھے، ہماری گاڑی اس فوجی کیمپ کے اندر چلی گئی۔ محمد صالح نے کہا کہ ایک آدمی نے یہاں سے کے جے جانا ہے، یہ پتا اسے ابھی بلا کر لے آتا ہے ہم ادھر ہی گپ شپ کرتے ہیں۔

محمد صالح نے بتایا ام المعارف بڑی منحوس جگہ ہے ابھی بھی اس کیمپ میں جائیں تو وحشت ہوتی ہے جب پچھلے سلطان کا دور تھا یہاں بدنام زمانہ تفتیشی سینٹر (Investigation Centre) ہوتا تھا۔ سلطان کے فوجی پہاڑوں پر جاتے تھے وہاں جو نوجوان نظر آتا تھا اسے پکڑ کر یہاں لے آیا جاتا تھا، اُس سے دفار کے بارے میں دریافت کیا جاتا تھا، اُس کے بیان میں ذرا سا بھی جھول ہوتا تو پھر سنٹر والے تشدد سے بھی نہیں آتے تھے۔ کئی لوگ کئی کئی سال یہاں جیلوں عقوبت خانوں میں بند پڑے رہتے تھے۔ اس سنٹر حکومت کو فائدہ کم پہنچایا اور حکومت کے خلاف نفرت میں زیادہ اضافہ کیا۔ گم شدہ افراد کے لواحقین کی جرأت بھی نہ ہوتی تھی کہ وہ کسی سے پوچھ سکیں ہمارے نوجوان کدھر قید ہیں، زندہ ہیں یا مر گئے ہیں

میں نے پوچھا کہ سلطان قابوس تخت پر کب تھا۔ اُس نے ہنستے ہوئے بتایا جب انگریزوں نے کیا کہ سلطان سعید کو ہٹا دیا جائے کیونکہ وہ خیالات کا مالک تھا، 23 جولائی 1970ء کو انگ کی سرکردگی میں سلطان سعید کے خلاف ایک بغاوت کی گئی، ایک دو گولیاں مار کر زخمی کیا گیا بے چارگی، زخمی ہونے کے بعد بیچارا مدد انگریزوں کو پکارنے پر مجبور تھا، وہ فوراً پہنچ گئے

کہ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے بیٹے قابوس کے حق میں دست بردار ہو جائیں۔ وہ فوراً دست بردار ہو گیا۔ پھر انھوں نے سلطان کو ہوائی جہاز میں بٹھایا اور انگلینڈ لے گئے، وہاں سے وہ 1972ء میں خاموشی سے اگلے جہان کوچ کر گیا۔''

وہ نوجوان جس نے ہمارے ساتھ کے جے جانا تھا گاڑی میں بیٹھ گیا اور بات کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے دوبارہ جڑ گیا۔

''سلطان قابوس انگلینڈ کے مشہور فوجی ادارے سینڈھرسٹ میں پڑھتا رہا ہے۔ وہ واقعی جدید خیالات کا مالک ہے، اُس کے آتے ہی راتوں رات ایک سماجی انقلاب آ گیا۔ اُس نے فوری طور پر پہاڑوں سے تمام فوج واپس بلالی، تمام لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا۔

دوسری طرف اس نے فوج کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ شہنشاہ ایران سے معاہدہ کیا کہ یمن سے سلحے سے بھرے اونٹوں کے جو قافلے چلے آ رہے ہیں اُن کو روکنے میں مدد دے۔ اقوام متحدہ سے مدد حاصل کی، بلوچی بڑی تعداد میں بھرتی کیے، باقاعدہ بلوچ رجمنٹیں بنائیں، جن میں سے ایک میں آپ جا رہے ہیں۔''

آخر ہم 'کے جے' کے کیمپ میں داخل ہوئے، محمد صالح نے مجھے بتایا کہ دائیں طرف جو یہ چبوترہ ہے اس جگہ پہلے سلطان پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ چار پانچ منٹ بعد ہم سارجنٹ میس پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے سارجنٹ میس کے احاطے میں مجھے اتار دیا۔ میس کے پنجابی اسٹاف نے خوش آمدید کہا، کچھ دیر بعد یونٹ کے سارجنٹ میجر غلام محمد صاحب تشریف لے آئے۔ وہ چکوال کے رہنے والے تھے، بہت محبت سے پیش آئے۔

میرے بغیر پوچھے ہی انھوں نے فرمایا کہ آپ بالکل صحیح وقت پر تشریف لائے ہیں۔ آپ سے قبل جو صاحب یہاں اکاؤنٹس سے متعلقہ تھے، اُن کے ساتھ جوڈیشل ہوئی اس کے بعد فیصلہ ہوا ہے کہ آئندہ ہر یونٹ کا فوجی آفیسر خود تنخواہ تقسیم کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

میں نے پوچھا کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ دشمن کے

اختصاریے

☆ خاموشی سے انتظام کرنا منتظم کی اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے۔

☆ محبت کسی واقعہ اور صورت حال پر تبصرہ و تجزیہ کرنا نہیں بلکہ مدد، ہمدردی، اصلاح، بہتری اور بھلائی کرنا سکھاتی ہے۔

☆ تعلیم محض جان لینے، باخبر رہنے اور معلوم کر لینے کا نام ہے۔ علم جاننے، سمجھنے اور اس کے مطابق عمل اور رویہ بنانے کا نام ہے۔

☆ گانا بجانا بھوکی شہرت کی تسلی کرنے کی سب سے سستی صورت کا نام ہے۔

☆ جھوٹے کا شر اور شرارت بچے کو اپنی سچائی، یقین اور قوت میں پختگی استقامت بخشتی ہے۔

☆ خواہش نفس کی شدت اور کثرت نفس انسانی کو جانور کی طرح بے خبر چراہ گاہ کی طرف نہیں بوچڑ خانے کی طرف لے جاتی ہے جہاں تباہی اور بربادی اس کی منتظر ہوتی ہے۔

☆ فقیہہ ہی وقت ماحول، حالات، دین، قوم اور ملت کی اصل ضرورت کو پہچانتا ہے۔

☆ مشکلات و مسائل دراصل انسان میں قوت مدافعت پیدا کرتے ہیں۔

☆ اسلام روز ازل سے جہالت کا سب سے پہلا اور بڑا دشمن ہے۔

(عاصمہ غنی)

ہم اس کیمپ کے باہر تک آکر گرتے رہے ہیں۔انھوں نے کہا یہ بات ہے تو درست لیکن ہے دو تین سال قبل کی۔ اس وقت یہ پوزیشن ہے کہ وادی صلالہ میں حکومت کا مکمل کنٹرول ہے، صلالہ کے ساتھ جو یہ پہاڑ آپ دیکھ رہے ہیں اس پر بھی حالات کافی حد تک درست ہوچکے ہیں، اس وقت بھی دشمن کے اکا دُکا ایجنٹ تخریبی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔کہیں مائین(mine) دبا جائیں گے،کبھی فوجیوں کو اکیلا دُکیلا دیکھ کر مار ڈالیں گے۔آج کل زیادہ لڑائی یمن کے قریب قریب جو علاقہ ہے وہاں تک محدود ہے۔

میں نے غلام محمد صاحب کو بتایا کہ مجھے تو یہ بات پہلے معلوم نہیں تھی کہ یہاں کی فوج کسی لڑائی میں الجھی ہوئی ہے۔یہ بھی مسقط آکر معلوم ہوا کہ میں نے وار زون میں جانا ہے۔کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ یہ کس قسم کی لڑائی ہے،کون کون لڑ رہا ہے اور کتنے عرصے سے یہ جنگ جاری ہے۔کسی نے مسقط میں مجھ سے یہ بھی کہا کہ یہ بنگالیوں کی طرح کی لڑائی ہے، جس طرح وہ مشرقی پاکستان کی آزادی کے لیے لڑتے رہے۔

انھوں نے بتایا کہ مسقط کے پڑوسی ملک یمن میں آج سے کئی سال قبل روس نے کمیونسٹوں کے ذریعے حکومت کے خلاف بغاوت کا چکر چلایا۔یمن کی حکومت کی حمایت سعودی عرب کر رہا تھا جبکہ کمیونسٹوں کو مصر کے ذریعے اسلحہ اور مالی امداد مل رہی تھی۔ یورش کافی بڑھی، آخر ملک دو ٹکڑے ہوگیا۔ ایک شمالی یمن اور دوسرا جنوبی یمن کہلایا۔جنوبی یمن نے دعویٰ کیا کہ ظفار کے علاقے پر مسقط نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے، ہمارا یہ علاقہ ہم کو واپس دے دیا جائے ورنہ ہم بزور طاقت اس پر قبضہ کرلیں گے۔

اُس زمانے میں مسقط کے معاشی حالات بہت خراب تھے، پٹرول دریافت ہوگیا تھا لیکن ابھی زمین سے نکالنے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ غربت بہت زیادہ تھی۔ حالات ایسے تھے کہ کیمونسٹوں کو آسانی سے مقامی لوگوں کا تعاون مل جاتا تھا۔اس کے علاوہ جنوبی یمن اور یہاں ظفار کے لوگوں کا ماضی میں کاروبار کے لیے ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بنا رہا، دونوں طرف کی زبان، رسوم، لباس، حتیٰ کہ ان کے قبائل بھی ایک ہی تھے۔

☆.....☆

کیمونسٹوں کے ساتھ یہ جنگ برطانوی فوجیوں کی سرکردگی میں لڑی جارہی تھی۔ ہماری یونٹ کا کمانڈنگ آفیسر اور دیگر تمام اہم افسران انگریز ہی تھے، سپاہیوں سے رابطہ کے لیے بلوچ رجمنٹوں میں کچھ بلوچ افسر اور عرب یونٹوں میں عربی افسر بھی ہوتے تھے۔

ہمارے کئی اکاؤنٹس آفیسر انگریز رہے، بعد میں ایک بلوچی افسر نے یہ کام سنبھال لیا تھا۔ ایک انگریز افسر جس کا نام جم ہاکنز تھا وہ کتابیں اور رسالے پڑھنے کا بہت شوقین تھا۔ میں کبھی کبھار اس سے کتابوں کے مصنفوں کے حوالے سے بات کرتا رہتا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مجھے اپنی کئی کتابیں پڑھنے کے لیے دے دیتا تھا۔ اُس کی دی ہوئی کئی کتابیں ابھی تک میرے پاس موجود ہیں۔

غالباً1977ء کے آغاز میں وہ چھٹی پر انگلینڈ گیا۔ جب چھٹی گزار کر واپس دفتر میں آیا تو اس کے لفافے میں بند کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ کتاب جب انگلینڈ میں بک اسٹال میں دیکھی تو ایک کاپی خرید لی، دکان سے باہر نکل آیا اور

کار میں بیٹھ گیا تو نجانے ایک دم کیوں تمہارا خیال آیا، میں دوبارہ دکان میں گیا اور ایک کتاب تمہارے لیے بھی خرید لی، جم ہاکنز کی وہ نشانی آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔

Ranulph Fiennes ایک انگریز تھا، جو مسقط آرمی میں بطور آفیسر کام کرتا رہا، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے مسقط کی کیمونسٹوں کے ساتھ اس جنگ کا احوال تفصیل سے اپنی معرکتہ الآرا کتاب 'جہاں فوجی قدم رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں' (Where Soldiers Fear To Tread) میں تحریر کیا ہے۔ کتاب میں تفصیل سے جنگ کے پورے حالات درج ہیں اور بتایا گیا ہے کہ دشمن کے پیچھے روس، پوری کیمونسٹ دنیا، مصر اور یمن کھڑے تھے۔1962ء سے 1967ء تک دفار لبریشن فرنٹ ہلکی پھلکی کارروائیاں کرتا رہا۔ 1965ء میں پہلی دفعہ سلطان کی باقاعدہ فوج فرنٹ والوں کو قابو کرنے کے لیے حرکت میں آئی۔ 1967ء کے بعد کیمونسٹوں نے ڈی ایل ایف(DLF) پر قبضہ کرلیا۔ دنیا بھر کے کیمونسٹ متحد ہوکر میدان میں آگئے۔ دفار کے پہاڑوں میں کیمونسٹ ملکوں کے فوجی باقاعدہ وردی پہن کر لڑتے رہے۔ پروگرام کے مطابق یمن میں بیٹھے کیمونسٹوں نے پہلا نشانہ دفار اور دوسرا مسقط بننا تھا اُس کے بعد متحدہ عرب امارات، بحرین اور پھر کویت ٹارگٹ تھا۔ لیکن اللہ کو ایسا منظور نہ تھا یہ بیچارے دفار ہی میں پھنس کر رہ گئے۔ کتاب میں دہشت گردوں کے مظالم کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔ لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے راستوں میں پھینک دینا، لاشوں کو جلانا، لوگوں کو سگریٹوں سے داغنا، معمولی شک پڑنے پر گولی مار کر زخمی کر دینا، جس کو چاہنا غائب کر دینا۔

مصنف نے ایک فقرے میں عمان کی موجودہ صورت حال بیان کردی ہے:Oman is poor yet rich, old yet new(عمان غریب ہونے کے باوجود امیر ہے، پرانا ہونے کے باجود جدید ہے)

☆.....☆

عمان میں کئی سال تخریب کاری کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور اس کے ساتھ ملک کے بعض علاقوں میں باقاعدہ فوجی لڑائیاں لڑی گئیں۔کئی قبیلوں کو انھوں نے آزادی کے خواب دکھائے۔ دوسری یہ بات ہے کہ وہاں جو میدان جنگ تھا وہ ہمارے بلوچستان یا افغانستان کے ساتھ ملنے والے سرحدی علاقے جیسا تھا۔

آیئے دیکھتے ہیں انھوں نے حالات کی اصلاح کرنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے دشمن سے اَن کا نعرہ لے لیا، حکومت عمان نے اعلان کیا کہ ہر شہری کو روٹی، کپڑا، مکان دینا حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ جانوروں کے لیے پانی اور چارے کا بندوبست کرنا بھی حکومت کا فرض ہے۔ ہر شہری کا مفت علاج، ہر بچے کے لیے مفت تعلیم، ہر شہری کے گھر تک پکی یا پکی سڑک۔حکومت نے یہ سہولتیں عوام کو مہیا کیں، لیکن ان سہولتوں نے عوام کو سرکاری اداروں سے باندھ دیا۔ مثلاً شعبہ طب ہے، اُس نے تمام عمانیوں کا ڈیٹا تیار کر لیا۔ ہر آدمی کا نام پتا، کام ہر چیز اُس کے ریکارڈ میں آگئی۔ بچوں کی تعلیم کے ذریعے سرکاری عملہ ہر علاقے

میں پہنچ گیا۔ ہر آدمی اپنے نزدیکی تھانے میں رجسٹرڈ ہے۔ اُس کو کسی قسم کی مدد چاہیے، اُس نے نزدیکی تھانے میں رپورٹ کرنا ہے۔

تمام ملک میں سڑکوں کا جال پھیلا دیا گیا۔ بینک کھولے گئے، انھیں کہا گیا کہ آپ لوگوں کو کاروبار کرنے کے لیے، کار خریدنے کے لیے قرضے دیں، مقصد یہ کہ وہ لوگ ایک منظم زندگی کے عادی ہوں۔ ہر گھر تک سڑک پہنچانے کا مقصد بظاہر تو عوام کو آنے جانے کی سہولت دینا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ کوئی گھر ایسا نہیں ہونا چاہیے جو حکومت کی نظر میں نہ ہو۔ جوانوں کے لیے تمام ملک میں جم کلب بنائے گئے، ہر قسم کے کھیلوں، خاص طور پر فٹ بال کے کھیل کے لیے ہر آبادی کی ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ تمام بوڑھوں، معذوروں، ناداروں کا ڈیٹا جمع کیا گیا اُن کو ماہوار وظیفہ دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

ایک اور بہت اہم پوائنٹ یہ تھا کہ حکومت نے ملک کے کم آباد علاقوں میں جگہ جگہ مکان بنا کر لوگوں میں تقسیم کرنے شروع کر دیے۔ نظریہ یہ تھا کہ جب ایک آدمی کو مکان مل جاتا ہے تو وہ مکان کے ساتھ بندھ جاتا ہے، وہ پھر کسی قسم کی شرارت یا تخریب کاری میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ سنا تھا کہ مکان اس شرط پر دیا جاتا تھا کہ آپ کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ آپ کے علاقے میں کوئی بھی شخص قدم رکھے تو آپ نے نزدیکی تھانے کو مطلع کرنا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس طرح فاصلے فاصلے پر مکان بنا کر لوگوں کو دے دیے گئے، اس فیصلے نے کسی غیر آدمی کا علاقے میں گھسنا کافی حد تک مشکل کر دیا۔

ملک میں زراعت کو ترقی دی گئی۔ زراعت کے لیے پانی چاہیے، ملک میں پانی کی کمی کا مسئلہ ہے جس کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈیم بنائے گئے۔ دو دو تین تین فٹ چوڑی پانی کی پختہ نالیاں بنائی گئیں۔ زمین میں پانی کا لیول بلند کرنے کے لیے، کبھی کبھار ہونے والی بارش کا پانی سمندر میں جانے سے روکنے کا بندوبست کیا گیا۔ مسقط میں جہاں جہاں جو چیز پیدا ہو سکتی ہے اُس کی پیداوار بڑھانے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی گئی۔ خاص طور پر ملک میں جہاں کھجور پیدا ہو سکتی ہے وہاں کھجور کے باغات بڑھانے کے لیے مدد کی گئی۔ صلالہ اور کچھ علاقوں میں ناریل پیدا ہوتا ہے، اُس کے نئے نئے باغات لگائے گئے ہیں۔ مسقط کا بہت بڑا ساحل ہے، لوگوں کو مچھلی پکڑنے، اُس کو منڈی تک پہنچانے، قیمتیں مناسب رکھنے غرض ہر طرح مچھیروں کی مدد کی گئی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے لیے روزگار پیدا کر دیا جائے تو وہ پر امن ہو جاتے ہیں۔

☆......☆

پاکستان کے بلوچستان اور قبائلی علاقوں کے حالات بہت حد تک وہاں کے حالات سے ملتے ہیں، ہم اُن سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، ہم کو ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

یہاں ایک اہم بات یہ بھی یاد کرانے کی ضرورت ہے کہ مسقط میں جنگ ختم ہو چکی ہے، اب وہاں بلوچوں کی ضرورت کم ہی رہ گئی ہے، اُن کی بڑی تعداد وطن واپس آ چکی ہے، حکومت کا فرض ہے کہ خود اُن کو ملازمت فراہم کرے نہیں تو اُن کو ملازمتیں فراہم کرنے والے ہیں۔ جو بہر حال آپ کے خیر خواہ نہیں ہیں۔

تذکرہ جب وفا کا ہوتا ہے
میں تمھاری مثال دیتا ہوں

گوشہ ماہر

ماہر القادری

ایک بلند پایہ شاعر و بذلہ سنج ایڈیٹر کا تذکرہ
ان کے اشعار اور انداز بیاں دونوں انھیں بھولنے نہیں دیتے

محمود احمد لئیق

دنیائے ادب میں بحیثیت شاعر، ادیب، محقق اور صحافی نصف صدی سے زائد عرصہ گزارنے والے ماہر القادری سن 1324 ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام منظور حسین تھا۔ جائے پیدائش کسیر کلاں ضلع بلند شہر ہے۔ زندگی کا بڑا حصہ حیدر آباد دکن، دہلی، بمبئی میں گزرا اور پھر مستقل قیام کراچی میں رہا۔ چند ماہ ملتان میں بھی گزارے۔ اس کے علاوہ سیر و سیاحت کا بار ہا اتفاق ہوا۔

ہندوستان میں اتنے مشاعرے پڑھے کہ دوسروں کو کم ہی میسر آئے ہوں گے۔ خود لکھتے ہیں ''بعض اوقات ایک ایک ماہ کا سلسلۂ سفر رہا ہے۔ شام مدراس میں ہوئی چوتھی صبح سواد بنگال میں طلوع ہوئی'' (بحوالہ میری کہانی، میری زبانی۔ فاران ماہر القادری نمبر دسمبر 1978ء)۔ چوتھی صبح اس لیے کہ اس دور میں ہوائی سفر عام نہ تھا۔

1928ء میں حیدر آباد دکن گئے۔ مہاراجا کشن پرشاد کی قدر شناسی کی بنا پر کئی سال وہاں رہے۔ یہ عرصہ تقریباً پندرہ سال کا رہا۔ اس دوران دکن کے مختلف محکموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ قیام حیدر آباد کے دوران میں جب نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر کا طوطی بولتا تھا، نواب صاحب نے قائد اعظم سے ان کا تعارف یوں کرایا ''میری تقریروں

اور ان (ماہرالقادری) کی نظموں نے مسلمانانِ دکن میں بیداری پیدا کی ہے۔''

1943ء میں حیدرآباد سے بمبئی منتقل ہوگئے۔ وہاں فلمی دنیا میں کچھ عرصہ گزارا۔ کئی فلموں کے گانے لکھے جو بڑے مقبول ہوئے۔ مولانا ماہر کی فلمی زندگی پر مختلف اخبارات اور رسائل کے مدیر عبدالکریم عابد کا تبصرہ بھی دیکھتے چلیں۔ وہ لکھتے ہیں ''ماہر صاحب بمبئی کی فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے اور فلمی گیت بھی لکھے۔ اس زمانے میں وہ ایک جوان رعنا تھے اور بمبئی کی ایکٹریسوں میں ان کی حسین صورت اور حسن سیرت کا بڑا چرچا تھا اور محفلوں میں وہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ نرگس کی والدہ جدن بائی ان پر بڑی 'مہربان' تھیں۔ (بحوالہ ''سفر آدھی صدی کا۔'')

اپنے فلمی تعلق پر وہ کبھی نازاں نہ رہے۔ اس پر ان کا تبصرہ ان کے الفاظ میں سنیے ''چند دن فلمی دنیا سے بھی تعلق رہا۔ فلمی دنیا میں میرے لیے شہرت اور جلب منفعت کے بعض زرّیں مواقع حاصل تھے، مگر اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ میں اس دلدل سے بہت جلد نکل آیا۔ اس چند روزہ فلمی تعلق پر آج تک متاسف ہوں۔'' (میری کہانی ، میری زبانی۔ فاران ماہرالقادری نمبر، دسمبر1978ء)

مولانا ماہرالقادری نے کراچی آکر رسالہ فاران کا اجرا کیا جو ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا۔

لندن میں مقیم شاعر ساقی فاروقی اپنی سوانح ''آپ بیتی ر پاپ بیتی'' میں لکھتے ہیں:

مورا میکہ ہو یا سسرال
موہے دونوں طرف کا ہے خیال

یہ مولانا ماہرالقادری کے ایک گیت کے بول ہیں جو انھوں نے محبوب کی فلم 'تقدیر' کے لیے لکھے تھے۔ ساقی فاروقی نے اپنی کتاب میں کافی کچھ خرافات اور ہذیان لکھا ہے (جس کے باعث اسے 'وہی وہانوی' کا درجہ دیا جاسکتا ہے) لیکن یہ سب ہمارے موضوع سے الگ ہے۔ تاہم انھوں نے مولانا ماہرالقادری کے بارے میں جو مزید لکھا ہے وہ کچھ یوں ہے ''اس زمانے میں وہ جدن بائی کے ہاں رہتے تھے اور ان کی بیٹی نرگس پر لٹو تھے۔ پاکستان آنے کے بعد جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے۔ خوش خوراک تھے۔ جدہ جاکر جان، جان آفرین یعنی قورمے بریانی کے حوالے کردی۔''

ساقی فاروقی نے کسی بات کا حوالہ نہیں دیا کہ یہ معلومات انہیں کہاں سے حاصل ہوئیں، نہ ہی یہ بیان کیا ہے کہ ان کی ماہرالقادری سے کوئی ملاقات ہوئی بھی تھی یا انھوں نے سب اپنے گھٹیا تخیل سے گھڑ کر لکھ دی ہے۔ پوری کتاب میں ماہرالقادری کا تذکرہ ان تین سطروں میں کیا ہے اور وہ بھی سیاق وسباق سے الگ ہوکر۔ اس کے علاوہ ان کا تذکرہ اور کہیں نہیں ہے۔ ماہر صاحب جدن بائی کے یہاں بقول خود رہتے ضرور تھے اور صرف وہ ہی نہیں شاعروں اور ادیبوں کی فوج کی میزبانی وہ کرتی تھی لیکن نرگس پر لٹو ہونا کسی نے نہیں لکھا۔ جدن بائی کی شاعری کے شوق و انہماک پر احسان دانش نے اپنی سوانح 'جہانِ دانش' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کے علاوہ اپنی کتاب ''گنجے فرشتے'' میں منٹو نے نرگس کے خاکے میں جدن بائی کا ذکر کیا ہے کہ اسے شاعری سے بہت لگاؤ تھا اور بمبئی میں اکثر شعرا اسے اپنا کلام سنانے جاتے تھے۔ وہ منٹو کے افسانوں کی بھی مداح تھی۔

مولانا کی اپنی تحریر کے مطابق وہ رشتۂ ازدواج میں 1925ء میں بندھ گئے۔ اس وقت تک نرگس پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں البتہ اس کی ماں یعنی جدن بائی سے ان کی رفاقت کی داستان زبان زد عام تھی، اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ اس تحریک کی ابتدا اس خاتون کی طرف سے ہوئی تھی، گویا ''عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود۔'' اس خاکسار کو ان سے کئی مرتبہ نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ 1971ء سے 1977ء تک کے دورانیہ میں معروف شاعر اعجاز رحمانی کی معرفت یہ ملاقاتیں رہیں۔ اس دوران جدن بائی کا تذکرہ بار بار آیا۔ مولانا سے ہم نے ایک سوال بھی کیا ''سنا ہے کہ جدن بائی آپ پر فدا تھی۔'' مولانا نے اپنی شگفتہ مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس گستاخی کو نظر انداز کیا اور ایک قہقہے میں بات اُڑادی۔

اب ہم ساقی فاروقی کی تحریر کے دوسرے نکتے کی طرف آتے ہیں۔ ''پاکستان آکر جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے'' ماہر صاحب کبھی بھی جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہوئے، ہاں ان کی ہمدردی اور تائید جماعت کو حاصل تھی۔ مولانا مودودیؒ سے ان کے دوستانہ تعلقات مرتے دم تک رہے۔ اس تعلق کی وضاحت انھوں نے خود کی ہے ''میں جماعت اسلامی کا صرف ہمدرد ہوں، اس تنظیم سے میرا کارکن کی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ (ماہنامہ فاران۔ اگست 1962ء)

تیسرا نکتہ ہے وہ خوش خوراک تھے، نہ معلوم ان کی خوراک کی مقدار سے ساقی فاروقی کو اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوئی کہ تضحیک آمیز الفاظ میں اس کا ذکر ضروری سمجھا گیا۔ مولانا اگر خوش خوراک تھے تو بھی انھوں نے دوسروں کے مانگے تانگے پر گزر نہیں کی۔ ساقی فاروقی کی طرح کبھی مبین الحق صدیقی کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ جعل سازی نہیں کی۔ فاروقی صاحب نے خود اپنی کتاب میں اس جعل سازی کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہ کالج کی فیس کے نام پر صدیقی صاحب کے دیے ہوئے دو سو روپوں کو شراب خانے میں شرابی دوستوں کے ساتھ مزے اڑانے پر صرف کیا۔ برسبیلِ تذکرہ، ماہر صاحب سے برسوں کے دوستانہ مراسم رکھنے والے عبدالکریم عابد کی مذکورہ کتاب کا ایک حوالہ درج کرتے ہیں ''کھانے پینے کے معاملے میں ماہر صاحب پیٹو تو نہیں تھے لیکن چٹورے مزاج کے ضرور تھے، راستے پر چلتے ہوئے بھی کہیں کباب یا کھیر وغیرہ کی دکان دیکھ لیتے، تو جی للچا جاتا تھا۔'' ماہر صاحب خوش خوراک نہیں خوش ذائقہ رکھنے والے فرد تھے اور میزبان کے حسن ترتیب اور کھانے کی لذت کا ذکر کرتے۔ ایک واقعے کے ہم شاہد ہیں۔ غالباً 1975ء کی بات ہے ایک مختصر سی نشست ترتیب دی گئی جس میں اعجاز رحمانی، امید فاضلی اور ماہر صاحب شریک تھے، مہمانوں کی ضیافت کی گئی۔ نشست کے اختتام پر کھانے کی تعریف کی، اس کے بعد جب بھی سامنا ہوتا، اس شب کے کھانے کی تعریف کرنا نہ بھولتے۔ ہمارے خیال میں اس میں ان کے حسنِ اخلاق کا زیادہ دخل تھا۔

ساقی فاروقی کا بیان کردہ آخری نکتہ بھی دیکھتے چلیں کہ جدہ جاکر جان جانِ آفریں یعنی قورمہ بریانی کے حوالے کردی۔

جدہ میں ایک مشاعرے کے دوران حفیظ جالندھری نے دو اشعار کے بعد تیسرا شعر بطور طنز ماہر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے پڑھا:

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذاب شدید
یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہمسائے

ماہر صاحب نے مائک کے پاس آکر کہا ''یہ غلط جگہ پہنچ گئے تھے'' پھر حفیظ سے کہا میں تو پیار کرتا ہوں اور پیار کا خواہاں ہوں۔ حفیظ نے یہ شعر پھر ان کی طرف دیکھ کر دہرایا مگر ایک ہی مصرعہ پڑھ پائے تھے کہ ماہر صاحب پر دل کا شدید دورہ پڑا، وہ بیٹھے بیٹھے اس طرح گرے کہ یوں سمجھا گویا تھک گئے تو کچھ لیٹنے کو جی چاہا ہوگا۔ کئی ڈاکٹر اسٹیج پر چڑھ گئے، حفیظ نے دوسرے شعر کے ساتھ ماہر کو جھک کر دیکھا، تو محسوس ہوا جیسے ماہر زبان خامشی میں کہہ رہے ہوں ''تم کو میری ہمسائیگی کا عذاب شدید ہے تو میں چلتا ہوں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ان کے ساتھی اعجاز رحمانی لکھتے ہیں ''ماہر صاحب سعودی عرب میں مقیم تھے۔ شاہ سعود کی جانب سے شاہی ضیافت کا دعوت نامہ ملا۔ دعوت رات کے ایسے وقت تھی جس میں شرکت سے عشا کی نماز حرم شریف میں نہیں ملتی، اس لیے دعوت میں شرکت نہیں کی۔ استفسار پر مولانا نے بتایا کہ میں اگر دعوت میں شریک ہوتا تو ایک لاکھ نمازوں کے ثواب سے محروم ہوجاتا..... اس تمہید کے ساتھ ساقی فاروقی کا تبصرہ ذہن میں دہرالیں تو اس کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ اعجاز رحمانی مزید لکھتے ہیں ''میں نے مولانا ماہر القادری کو تقریباً بارہ، تیرہ سال بہت قریب سے دیکھا، بیشتر محفلوں اور مشاعروں میں ساتھ ساتھ رہا۔ میں نے مولانا کی ذات کو ہر مقام پر منفرد پایا۔ موصوف اپنی دانست میں نہ کبھی غلط بات کہتے تھے نہ سننے کے عادی تھے۔ ان کی صاف گوئی ایک مثال تھی۔ بے جا رعایت ان کے مسلک میں جائز نہ تھی۔ جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے وہ میری بات کی تصدیق کریں گے۔'' (بحوالہ فاران ماہر القادری نمبر) مولانا کے انتقال کے چند ماہ بعد رسالہ فاران جس کے وہ بانی تھے، اس کے ماہر القادری نمبر میں یہ مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے بے شمار اہل قلم نے ان کی یاد میں تعزیتی مضامین لکھے ہیں۔

عبدالکریم عابد نے ماہر صاحب کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ''ماہر صاحب اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ہر ایک سے ہمدردی اور سب کے ساتھ محبت سے پیش آنا ان کا وتیرہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنے عقائد اور خیالات میں بہت متشدد تھے اور بڑے متشرع بھی تھے، لیکن زاہد خشک نہیں تھے، جس محفل میں ہوتے اسے باغ و بہار بنا دیتے۔ ان کی بذلہ سنجی اور ان کا مسکراتا چہرہ آج بھی ان کی یاد دلاتا ہے۔''

ماہر صاحب کی پرلطف باتوں کا تذکرہ پروفیسر خورشید احمد نے اپنی کتاب تذکرۂ زنداں میں کیا ہے ''ماہر صاحب ارادی طور پر ایسے پیارے ترجمے کرتے ہیں کہ طبیعت خوش ہوجائے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے کہ تم نے (Little sea) میں میری غزل سنی ہے! سب چکرا گئے۔ معلوم ہوا کہ ''چھوٹی بحر'' میں! جگر صاحب نے ایک بار ماہر صاحب سے کہا کہ تمہارے ترجموں کی بڑی دھوم ہے ذرا 'زندہ باد' کا ترجمہ تو کرو۔ کہنے لگے کیا دلواؤ گے۔ پانچ روپے معاملہ طے ہوا۔ تھوڑی دیر میں تشریف لائے کہ روپے نکالو۔ جب روپے نکلوا لیے تب سنایا 'Live wind'۔ جگر صاحب کی بھی باچھیں کھل گئیں۔ شوکت تھانوی مرحوم کسی کو نہ چھوڑتے تھے۔ ماہر صاحب سے ان کی نوک

جھونک خوب چلتی تھی، لیکن ماہر صاحب نے بھی ان کے نام پر وہ ہاتھ صاف کیا کہ رہ گئے وہ بھی ہاں کرتے کرتے' کہا تم تو Grandeur of police station ہو۔ پروفیسر خورشید مزید لکھتے ہیں' مولانا مودودیؒ کو میں نے جب یہ ترجمہ سنایا، تو ہنسے اور برجستہ فرمایا ''واہ واہ ماہر صاحب تو بالکل ہی (Expert of Al-Mighty)، (ماہر القادری) نکلے۔'' یہ 1964ء کی نظر بندی کا واقعہ ہے جب جماعت اسلامی کی پوری مجلس شوریٰ (تقریباً پچاس افراد) جیل میں تھی۔

ماہر صاحب نے روزنامہ ''مدینہ'' کی ادارت سے وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ ایک خبر تھی، جس کی سرخی انھوں نے قائم کی تھی۔ ''بنگال میں گورنر نے ریڈیو کا انتظام کردیا۔'' کاتب صاحب نے اس سرخی کو اس طرح لکھا ''بنگال میں گورنر نے رنڈیوں کا انتظام کردیا۔'' مزید لکھا ''وہ تو خیر ہوئی کہ کتابت کی اس غلطی پر میری نظر پڑگئی ورنہ اسی طرح خبر چھپ جاتی۔''

ان کی شگفتہ مزاجی کا ایک قصہ سنتے چلیں۔ جنرل اعظم ان دنوں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے (یہ غالباً 1958ء کے مارشل لا کا ذکر ہے)۔ گلستان ڈھاکہ کا مشہور سنیما ہے۔ اسی میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ جنرل موصوف نے بھی شرکت فرمائی۔ کسی شاعر کو اس کے شعر پر زیادہ داد ملتی تو وہ غالباً اپنی گوش گزاری کے سب اپنی بیگم صاحبہ سے کچھ پوچھتے۔ ارم لکھنوی نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا:

وہ یہ کہتے ہیں کہ جا اب رستگاری ہوگئی
اے جنوں! زنجیر یہ تو اور بھاری ہوگئی

تو ہال تحسین کے شور سے گونج اٹھا۔ اس پر جنرل صاحب نے اپنی بیگم صاحبہ سے سرگوشی کے انداز میں کچھ دریافت کیا۔ جب مشاعرے سے ہم قیام گاہ پر آئے، تو میں نے کہا ارم صاحب آپ نے غضب کردیا۔ مارشل لا کے دور میں ایسا سیاسی مطلع پڑھ دیا۔ وہ چونک کر بولے اس مطلع کو سیاست سے کیا واسطہ! اور یہ غزل تو میں نے تقسیم سے قبل انگریز کے دور حکومت میں لکھنو میں کہی تھی۔ اس مذاق میں اقبال صفی پوری کی شوخی اور ظرافت نے اور لطف پیدا کردیا اور ارم صاحب کو باور کرایا کہ یہ شعرا کے حلقوں میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ معاملہ بڑا سنگین نظر آتا ہے اور بھیّا ارم! ہم جانتے ہیں کہ تمہارا سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا، مگر ..... یہ زنجیر..... اور بھاری ہوگئی۔ اس کی توجیہہ تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ اس شعر کو یہ معنی پہنائے جارہے ہیں کہ پچھلے دوروں کے مقابلہ میں موجودہ دور سخت تر ہے۔ ارم بے چارے کے چہرے پر فکر و تشویش کی ہوائیاں سی چھوٹنے لگیں۔ کئی دن مذاق کا سلسلہ چلتا رہا اور جب اس مذاق کا راز ان پر کھل گیا، تو برا نہیں مانا۔ (فاران مارچ 1967ء)

ماہر صاحب کی ایک بڑی خوبی اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا بھی تھا۔ یہ عملی زندگی میں ہوں یا ادبی زندگی میں۔ اس معاملے میں وہ کسی بخل کا مظاہرہ نہ کرتے۔ ان کی یاد میں لکھے گئے مضمون میں لالۂ صحرائی ایک اجتماع میں ان سے ملاقات کا حال لکھتے ہیں ''انھوں نے بڑے تپاک کے ساتھ مجھ سے معانقہ فرمایا پھر بڑی محبت کے ساتھ مجھے اپنے بستر پر بٹھایا، اب ان کے چہرے پر ایک چھوٹی سی ڈاڑھی بھی اگ آئی تھی جو آنکھوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے ڈاڑھی کی مبارکباد پیش کی تو آہستہ سے بولے آپ کی مبارکباد کا شکریہ تاہم مجھے اس بات کی

ندامت ہے کہ زندگی کا ایک بڑا عرصہ تارک سنت بن کر گزرا۔'' (فاران۔ ماہرالقادری نمبر)

خود شاعر ہونے کے باوجود شاعروں کے متعلق ان کا مشاہدہ نوٹ کرتے چلیں ''شاعر کتنا ہی پارسا اور صاحب تقویٰ کیوں نہ ہو رنگین مزاج بھی ہوتا ہے۔'' اسے ہم ان کی حقیقت پسندی کہہ سکتے ہیں۔(ماہنامہ فاران، مارچ1967ء)

ماہر صاحب کو اپنے ساتھیوں کے کسی شعر میں نقص نظر آتا، تو نشاندہی کردیتے۔ اس کے ساتھ اگر کسی معمولی سی تبدیلی سے شعر کا حسن دوبالا ہوجاتا تو اس کے گوش گزار کردیتے۔ اسی طرح یہی معاملہ ان کے ساتھ پیش آتا، تو نیاز مندی سے قبول کرلیتے۔ ان کی غزل کا ایک شعر ہے۔

ساقی بھی دورِ جام بھی بادل گھرے ہوئے
اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کیے ہوئے

فیض جھنجھانوی نے اعتراض کیا کہ اس میں 'ایطا' کا عیب ہے۔ ماہر صاحب نے اس کی تردید کی اور تحقیق کی کہ ان کا اعتراض بے جا ہے۔ انھوں نے شمس زبیری کی رائے لی جو عروض میں خاصا درک رکھتے تھے، جوش ملسیانی کو بھی خط لکھا ہر جگہ سے ماہر صاحب کی موافقت میں جواب آیا۔ اس کے بعد انہوں نے بسمل سعیدی کو خط لکھا کہ اپنی رائے سے آگاہ کریں اور دلّی میں جو سب سے بڑا عروض داں ہو اس سے دریافت کریں۔ ان کا جواب ماہر صاحب کے حق میں تھا۔ لیکن انہوں نے مطلع تقطیع کے ساتھ اس طرح لکھ کر بھیجا۔

ساقی ہے، دور جام ہے، بادل گھرے ہوئے
اور میرا حال یہ کہ میں توبہ کیے ہوئے

ماہر صاحب نے ان کی اس تصحیح کو ان الفاظ کے ساتھ قبول کیا ''اس طرح میرے مطلع میں 'بھی' کی تکرار جو ناگوار تھی، دور ہوگئی اور اس کی جگہ 'ہے' آنے سے شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ میرے شعر کی کوتاہی کی طرف اپنے خط میں کوئی اشارہ نہیں کیا، بس شعر لکھ کر بھیج دیا۔ اپنے شعر پر بسمل سعیدی کی اس اصلاح کا اپنے احباب میں بارہا تذکرہ کرچکا ہوں۔'' (بحوالہ 'فاران'۔ نومبر1977ء)

1927ء میں بدایوں کے ایک مشاعرے میں ماہر صاحب نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر ہے۔

ہو چکی بیمارِ الفت کو تسلی ہو چکی
اک نگاہِ واپسیں وہ بھی غلط انداز ہے

حضرت احسن مارہروی مشاعرے کے بعد ماہر صاحب کے پاس آئے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خاص لکنت بھرے انداز میں بولے:

میاں وہ شعر تو پھر پڑھنا جس کا قافیہ ''غلط انداز ہے'' ماہر صاحب لکھتے ہیں ''ان کے اس طرح فرمانے پر میرا ماتھا ٹھنکا کہ میرے اس شعر میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے۔ پلک جھپکتے میں ذہن 'نگاہ واپسیں' پر پہنچا کہ نگاہ واپسیں تو مرنے والے کی آخری نگاہ کو کہتے ہیں، میں نے محبوب کی مڑتی ہوئی نگاہ کو 'نگاہ واپسیں' کہا ہے، یہ تو بڑی فاش غلطی ہے، میں نے قدرے تامل کے بعد شعر پڑھا:

ہو چکی بیمارِ الفت کو تسلی ہو چکی
ایک دزدیدہ نظر وہ بھی غلط انداز ہے

مولانا احسن پھر وہاں رُکے نہیں، عجیب حیرت زدہ انداز میں اپنے خیمے کی طرف بڑھ گئے۔

کراچی میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ میں نے ایک ادبی نشست میں اپنی غزل سنائی جس کا ایک

شعر یہ تھا۔

غنچوں کے دل سے پوچھیے لطف کشادگی
بادِ صبا پہ تہمتِ آوارگی سہی

اس پر ایک صاحب نے ''لطف کشادگی'' طنزیہ انداز میں دہرایا، میں نے برجستہ دوسری بار مصرعہ اولیٰ یوں پڑھا:

غنچوں کے دل سے پوچھیے لطف شگفتگی

ماہر صاحب نے توجہ دلانے پر کمال ہوشیاری سے تصحیح کرلی اور اس کا اعتراف بھی اپنے رسالے فاران میں کیا۔

انھوں نے اپنی تحریروں میں بے شمار ہم عصروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ان کی تصحیح و تجاویز قبول کرکے اپنے اشعار یا اپنی تحریر میں تبدیلی کرلی تاہم اس قبولیت و اپنا کارنامہ ظاہر کرنے کے بجائے ان شاعروں یا نثرنگاروں کی عالی ظرفی، خوردنوازی، بے نفسی، اخلاص اور حقیقت پسندی کی دلیل قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں ''پروفیسر محمد الیاس برنی نے ایک بار اپنی نظموں کا مجموعہ بھیجا، تو انھوں نے مرحوم کو لکھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے 'موزوں طبع' نہیں بنایا اس لیے 'نظموں' کی اشاعت ہمیشہ کے لیے روک دیجیے، یہ بات آپ کے منصب سے فروتر ہے۔ میری اس تنقید کا اور صاف گوئی کا انھوں نے برا نہیں مانا۔''

یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ انھوں نے پاکستان آکر کراچی سے ادبی رسالہ فاران کا آغاز کیا جو ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا۔ اس رسالہ میں انھوں نے تمام افراد جو ان کے سامنے دنیا سے کوچ کرگئے اور ان کے حلقۂ احباب میں تھے یا ان سے کبھی ان کی ملاقات رہی تھی، پر مضمون لکھے۔ ان میں ادیب، شاعر، سیاستدان اور سماجی کارکن شامل ہیں۔ وفات کے بعد سب کا ذکر بڑی محبت اور تعظیم کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن اس میں اکا دُکا استثنا بھی ہے، اردو کی آزاد شاعری کے خالق نذر محمد راشد کے انتقال پر ان کا تبصرہ ان کی ذات اور شاعری پر بڑا جارحانہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں ''ن۔م راشد نے اردو شاعری میں آزاد نظمیں (بلینک ورس) کہہ کر اردو شاعری کا حلیہ بگاڑ دیا۔ آج جیسی مضحکہ خیز اور پست و بے معنی نظمیں رسالوں میں آرہی ہیں اس کا کریڈٹ نہیں ڈیبٹ (Debit) ن۔م راشد کو ملنا چاہیے۔'' مرحوم سے ان کی برگشتگی کی دوسری وجہ ان کی وصیت تھی جس میں ن۔م۔راشد نے اپنے لواحقین کو ہدایت کی تھی کہ ان کی لاش کو دفن کرنے کے بجائے جلایا جائے۔ مرحوم کی بیوی اور بیٹے نے ان کی خواہش کا احترام کیا اور لندن میں اسے جلانے کی رسم ادا کی گئی۔ ماہر صاحب کو ان کا جلایا جانا بڑا ناگوار گزرا اور وہ فرماتے ہیں ''مرتے وقت تو بڑے بڑے منکروں اور آزاد خیالوں کو توبہ تلا کرتے اور اللہ کی طرف رجوع ہوتے دیکھا گیا ہے۔'' انھوں نے مرحوم شاعر کی آزاد نظم بھی شائع کی ہے اور اسے ''بے سرو پا نظمیں، شاعری، ادب، فکر و خیال اور اظہار و ادا بلکہ اردو زبان کے ساتھ دردناک مذاق قرار دیتے ہوئے لکھا ''ن، م راشد کی بے تکی نظموں نے اردو شاعری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ خدا کرے اس وبا سے اردو کے شعرا محفوظ رہیں۔'' (بحوالہ فاران دسمبر1975ء)

ماہر صاحب کی امتیازی صفت اردو کی حفاظت اور زبان و بیان کی درست ادائی تھی۔ شام ''النور'' کے ایک جلسے کے مخصوص مقرر شورش کاشمیری تھے۔ تقریر شروع

کرنے کے چند منٹ بعد بولے ''یہ ماہر صاحب لفظ و بیان اور روز مرہ کی غلطیاں پکڑتے رہتے ہیں۔ فلاں مصرع میں فلاں لفظ کا الف دب گیا ..... مضمون نگار نے مذکر لفظ کو مونث کر دیا ..... یہ محاورہ یوں نہیں یوں ہے.... اہل زبان اس طرح نہیں بولتے!'' (ماہنامہ فاران جنوری 1976ء)

شورش کاشمیری کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ماہر صاحب کی صلاحیت کے وہ بھی معترف تھے۔

زبان اور الفاظ کے معاملے میں ان کی مولانا مودودیؒ سے مراسلت بھی رہی۔

ماہر القادری کی ایک نمایاں خصوصیت بذلہ سنجی اور فی البدیہہ لطیفہ تخلیق کرنا بھی تھی۔ انہوں نے ایک واقعہ لکھا کہ پاکستان بننے کے بعد لاہور میں انارکلی کے فٹ پاتھ پر ان کی اور ظفر احمد انصاری کی شفیق کوٹی سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے گھر پر دعوت دی۔ ماہر صاحب نے کہا کہ جگر مرادآبادی ان دنوں لاہور میں ہیں، انھیں بھی دعوت میں بلائیے۔ شفیق کوٹی نے نفی میں جواب دیا اور وجہ یہ بیان کی کہ جب بھی ان سے ملتا ہوں وہ فرماتے ہیں ''تم ریلوے میں نوکر ہو۔'' انھوں نے بارہا تردید کی کہ وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں، ریلوے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پر ماہر صاحب نے ان سے پوچھا کہ ان کی ملاقات 1941ء سے ہے جب وہ بمبئی میں ایک مشاعرے میں آئے تھے۔ پھر کہا ''تو سنیے! میں بھی اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔'' اس پر شفیق صاحب بے ساختہ اچھل پڑے، ظفر احمد انصاری بھی ہنسنے لگے۔

ماہر صاحب کی شاعری کے کئی رنگ ہیں، ایک تو مرجبہ یعنی عاشقانہ رنگ اور دوسرا مذہبی رنگ جس میں نعت، حمد اور دیگر کلام شامل ہے۔ اپنی شاعری پر ان کا تبصرہ بھی خوب ہے

ع ہے مرا طرز ناصحانہ، کہیں مرا طرز عاشقانہ

اس عاشقانہ رنگ میں بھی ان کی انفرادیت محبوب کے شکوہ شکایت کے بجائے اس کی عنایت اور التفات کا اعتراف ہے۔ عبدالکریم عابد اپنی کتاب ''سفر آدھی صدی کا'' میں لکھتے ہیں ''ایک خاص بات یہ ہے کہ ماہر صاحب کے کلام میں محبوب کو عام شعرا کی طرح بے مہر اور ستم گر نہیں کہا گیا، بلکہ اس کے برعکس وہ کہتے ہیں۔

؎ میرے حال پر اور اتنی نوازش
وہ کیوں مہرباں ہیں خدا کو خبر ہے

نخشب جارچوی سے ماہر صاحب کے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ ان کے انتقال پر لکھے ہوئے خاکے میں وہ (ماہر القادری) لکھتے ہیں:

میں نے اپنی ایک تازہ غزل سنائی تو اس شعر۔

؎ تذکرہ جب وفا کا ہوتا ہے
میں تمہاری مثال دیتا ہوں

کے بارے میں ایک دن نخشب صاحب بولے، بھئی تین چار دن سے تمہارے اسی شعر میں گم ہوں۔ (ماہنامہ فاران۔ اکتوبر 1967ء)

ماہر صاحب کا محبوب کے بارے میں اس طرح کا اظہار خیال دیگر اشعار میں بھی کیا گیا ہے۔

؎ حسن والوں کے لطف و کرم دیکھ کر
سوچتا ہوں میں کیوں پارسا بن گیا
ہر کسی کا دل نزاکت آشنا ہوتا نہیں
حسن کا ہر جور، جورِ ناروا ہوتا نہیں

دیکھا مری طرف تو وہ شرما کے رہ گئے
گویا مرا سکوت بھی حاضر جواب ہے
نگاہ ناز! ترے حسن التفات کے بعد
مری طرف سے تغافل کی بھی اجازت ہے
ستم کے بعد ندامت پھر اس کے بعد کرم
حضور! اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے
میں دوسروں کی طرح بدگماں نہیں تجھ سے
ترے کہے کا مجھے اعتبار ہے ساقی
تم آ گئے زہے قسمت تمہاری عمر دراز
تمہارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے
ان کا چہرہ مرا نام سن کر
اور بھی کچھ حسین ہو گیا ہے
اب آرہے ہیں ان کی طرف سے پیام شوق
حیرت کا ہے مقام مسرت کی بات ہے
رگ جاں سے بھی وہ قریب تر ہیں
مگر یہ فاصلہ بھی کم نہیں ہے

دوسری طرف وہ محبوب کی جفاؤں اور بے نیازی کا تذکرہ ان اشعار میں کرتے ہیں:

دلدہی کے ہزار پہلو ہیں
تم کو لیکن مرا خیال کہاں
بھولے سے کبھی بزم میں مجھ کو نہ کیا یاد
یہ بھی بہت ہے آپ کو اتنا تو رہا یاد
وہ ہنس ہنس کے وعدے کیے جا رہے ہیں
فریب محبت دیے جا رہے ہیں
ان کے لطف و کرم ہیں اوروں پر
ہم تو ہیں تہمتیں اٹھانے کو
اس چشم التفات میں رنگِ عتاب ہے
میری گزارشوں کا یہ پہلا جواب ہے

ناصح کا ذکر تو شاعری میں بارہا آیا ہے، غالباً تمام شاعروں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ تین اشعار ماہر صاحب کے بھی دیکھتے ہیں۔

؎ خدا جانے کب تک ناصح کو میرے
خدا کی طرف سے ہدایت نہ ہو گی
اس قدر تلخ گفتگو ناصح!
تم نے سیکھی ہے بول چال کہاں
آ رہے ہیں وہ حضرت ناصح
اور کچھ الجھنیں بڑھانے کو

ان کے عاشقانہ کلام میں ''جمنا کا کنارہ'' انتہائی مقبول ہوئی۔ عمر کے آخری دور میں ان سے اس نظم کی فرمائش کی جاتی تو برہم ہوجاتے۔ وہ کہتے دوسرا کلام بھی ہے، وہ کیوں نہیں سننا چاہتے۔ ایک مرتبہ برہمی کے بعد سنانے پر راضی ہوگئے، تو برہمی کے سبب سے آگاہی ہوئی۔ یہ نظم انتہائی رومانی ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس میں ایک حسینہ کا جمنا کے کنارے آکر اٹھکیلیاں کرنا، پانی سے کھیلنا بیان کیا گیا ہے۔

؎ جامن کے درختوں سے کچھ آگے بڑھا میں
آئی نظر آتی ہوئی اک شوخ دل آرا
اللہ رے! اٹھلاتی ہوئی چال کی شوخی
رک جائے جسے دیکھ کے بہتا ہوا دھارا

آخری اشعار کچھ یوں ہیں۔

؎ اے بت کدۂ ہند کے بے ترشے ہوئے بت
بخشم بہ نگاہِ تو سمرقند و بخارا
یک بار بہ ایں نازبیا برلب جمنا
یک فرصتِ نظارہ بدہ باز خدارا

ان کی ایک نعتیہ نظم بڑی مشہور ہوئی، دراصل یہ ایک سلام ہے جس کے اشعار ہیں۔

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اس پر کہ اس جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں
رسول مجتبیٰ کہیے ، محمد مصطفیٰ کہیے
خدا کے بعد وہ ہیں پھر اس کے بعد کیا کہیے

جیلانی بی اے نے ماہر صاحب کے انتقال پر تعزیتی مضمون تحریر کیا جو ان کی کتاب ''بہار کے پہلے پھول'' میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''1937ء میں جب یہ (مراد یہ سلام ہے) کتابی شکل میں شائع ہوئی، تو مناظر احسن گیلانی نے دیباچہ میں لکھا تھا 'میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ یہ سلام کھٹمنڈو سے لے کر راس کماری تک مشہور ہوگا اور یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ ان کی ایک معرکتہ الآرا نظم ''قرآن کی فریاد'' بھی انتہائی مقبول ہوئی۔ اس نظم میں قرآن نے اپنی کہانی بیان کی ہے کہ مسلمانوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، ہدایت اور عمل کے بجائے اسے ذیلی کاموں کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔اس کا ایک ایک شعر توجہ سے سننے کے قابل ہے۔ پہلا شعر ہے۔

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں
آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں
دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں

اسی طرح کے مظلومانہ اظہار کے بعد آخری شعر میں قرآن کچھ یوں کہتا ہے۔

کس بزم میں میرا ذکر نہیں
کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں
مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

اُن کی شاعری سے متعلق بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن خود ان کا نکتۂ نظر سن لیں۔

شعر کہتا ہوں اس طرح ماہر
دل کے کانٹے نکال دیتا ہوں

یوں تو دنیا میں ہر شخص جانے کے لیے آیا ہے۔ اس کے باوجود بہت کم افراد نے اپنی زندگی کا مقصد سمجھا اور اس کے اصولوں کے مطابق زندگی گزاری۔ ماہر القادری بلاشبہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے امکان بھر رضائے الٰہی کا حصول آپنے سامنے رکھا۔ یقیناً ان سے غلطیاں بھی ہوئیں، کوتاہیاں بھی سرزد ہوئیں اور وہ اس پر نادم رہے۔ ان کی وفات اور پھر جنت المعلیٰ میں تدفین پر ان کے دیرینہ ساتھی تابش دہلوی کا کہنا ہے۔

ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

''1937ء میں جب یہ (مراد یہ سلام ہے) کتابی شکل میں شائع ہوئی، تو مناظر احسن گیلانی نے دیباچہ میں لکھا تھا 'میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ یہ سلام کھٹمنڈو سے لے کر راس کماری تک مشہور ہوگا اور یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

گلائسیمک انڈکس کو سمجھیے

رضوان احمد شاہ

یہ آپ کو شوگر اور امراض قلب سے محفوظ رکھے گی

میں اپنی کھانسی کا علاج کرانے ایک ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اتفاق سے وہ ماہر غذائیات بھی تھے۔ میں نے سنا، وہ کسی مریض کو مشورہ دے رہے تھے۔ ''آپ کم گلائسیمک انڈکس (Glycemic Index) والی غذا کھایا کریں۔ یوں آپ ذیابیطس، امراض قلب اور دیگر خطرناک بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔''

پہلے بھی میں گلائسیمک انڈکس کے متعلق سن چکا تھا، مگر میں اس کی اہمیت سے ناواقف تھا۔ چناں چہ میں نے کتب و رسائل کا مطالعہ کیا۔ نیز انٹرنیٹ سے بھی مدد لی۔ یوں میں اس طبی اشاریے کے متعلق بہت کچھ جان گیا۔ اب گلائسیمک انڈکس کے بارے میں آپ کو بھی بتا رہا ہوں تاکہ اس کی افادیت جان سکیں۔ یہ معلومات نہ صرف آپ کو صحت مند ہونے میں مدد دیں گی بلکہ غذاؤں کے متعلق اہم جان کاری بھی دیں گی۔

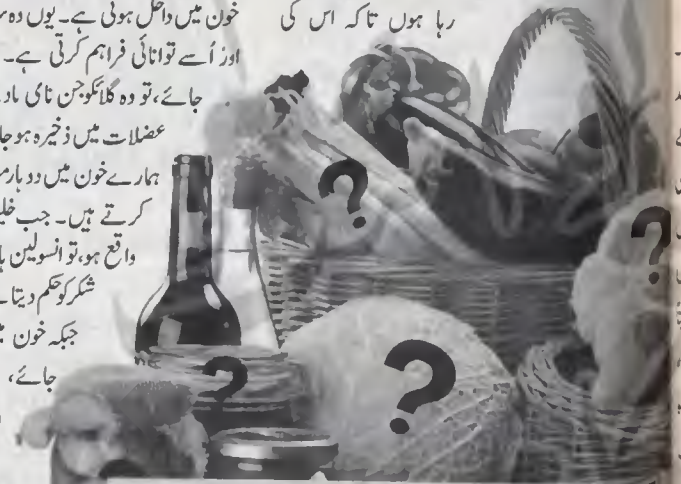

شکر خون کیا ہے؟

ہمارے خلیے شکر (یا گلوکوز) سے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ شکر ہماری غذا میں بہ شکل کاربوہائیڈریٹ ملتی ہے۔ کاربوہائیڈریٹ کی تین اقسام ہیں: شکر، ریشہ (فائبر) اور نشاستہ (سٹارچ)۔ کاربوہائیڈریٹ کی ہر قسم ہمارے بدن میں پہنچ کر شکر میں بدل جاتی ہے۔ تاہم ریشہ ہمارے جسم میں جذب نہیں ہوتا بلکہ فضلے کے راستے نکل جاتا ہے۔

کاربوہائیڈریٹ سے جنم لینے والی غذا پھر ہمارے خون میں داخل ہوتی ہے۔ یوں وہ سرتاپا ہر خلیے تک پہنچتی اور اُسے توانائی فراہم کرتی ہے۔ اگر خون میں شکر بچ جائے، تو وہ گلائکوجن نامی مادے کی صورت جگر اور عضلات میں ذخیرہ ہوجاتی ہے۔

ہمارے خون میں دو ہارمون شکر کا نظام کنٹرول کرتے ہیں۔ جب خلیوں میں توانائی کی کمی واقع ہو، تو انسولین ہارمون خون میں موجود شکر کو حکم دیتا ہے کہ ان تک پہنچ جاؤ۔ جبکہ خون میں شکر کی سطح کم ہو جائے، تو گلوکوجن (Glycogen) ہارمون جگر اور عضلات کو حکم جاری کرتا ہے کہ اپنی ذخیرہ شدہ شکر جاری کردو۔ اس نظام کے ذریعے نہ صرف خلیوں کو مسلسل توانائی ملتی ہے، بلکہ ہمارے خون

میں شکر کی سطح بھی متوازن رہتی ہے۔

توازن کب بگڑتا ہے

لیکن بعض کاربوہائیڈریٹ غذائیں کھانے سے خون میں شکر کی مقدار بہت تیزی سے بڑھتی ہے۔ چناں چہ اس شکر کو ٹھکانے لگانے کے لیے زیادہ انسولین جنم لیتی ہے۔ جب جگر اور عضلات میں جگہ نہ رہے، تو انسولین شکر کو چربی میں بدلنے لگتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جب انسان مسلسل کاربوہائیڈریٹ غذائیں کھاتا رہے، تو شکر خون اور انسولین کا توازن جاتا رہتا ہے۔ تب خلیے شکر جذب نہیں کرتے اور یوں خون میں اس کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ یہ طبی خلل اصطلاحاً ''انسولین مزاحمت'' (Insuline resistance) کہلاتا ہے۔

انسولین مزاحمت کو معمولی خلل نہ سمجھیے کیونکہ یہ رفتہ رفتہ انسان کو خطرناک بیماریوں...... ذیابیطس قسم 2، ہائی بلڈ پریشر، موٹاپا، فالج اور امراض قلب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس خلل سے بچنے کے لیے ہی 1980ء میں کینیڈین ڈاکٹر ڈیوڈ جینکنز نے گلائسیمک انڈکس ایجاد کیا۔ اس انڈکس کے ذریعے کاربوہائیڈریٹ غذاؤں کو تقسیم کر دیا گیا۔

جن غذاؤں میں کم کاربوہائیڈریٹ ہو، وہ 1 تا 55 نمبر پاتی ہیں۔ معتدل مقدار رکھنے والی غذاؤں کو 56 تا 69 نمبر ملتا ہے۔ 70 تا 100 نمبر رکھنے والے غذائیں بہت زیادہ کاربوہائیڈریٹ رکھتی ہیں۔ اس انڈکس کا فائدہ یہ ہے کہ ہم کم کاربوہائیڈریٹ غذائیں کھا کر اپنے خون میں شکر کو کنٹرول رکھ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ گلائسیمک انڈکس میں گوشت اور چکنائی والی غذائیں شامل نہیں کی جاتیں، کیونکہ ان میں کاربوہائیڈریٹ عنقا ہوتے ہیں۔

کم کاربوہائیڈریٹ والی غذاؤں میں پھلی دار سبزیوں کے بیج، ثابت اناج، زیادہ تر سبزیاں اور بیشتر پھل (ناشپاتی، آم اور اسٹرابری شامل ہیں۔ سب سے کم کاربوہائیڈریٹ پالک (15)، گوبھی (15)، بند گوبھی (15)، چقندر (15)، پیاز (15)، ٹماٹر (15)، دہی (15)، سویابین (25)، گریپ فروٹ (35) اور سیب (40) میں ملتے ہیں۔

اُبلے یا پکے آلو سب سے زیادہ کاربوہائیڈریٹ رکھتے ہیں۔ گلائسیمک انڈکس میں ان کا نمبر 119 ہے۔ اس کے بعد سفید آٹے (100)، تربوز (100)، چینی (95) جو (95)، سفید چاول (90)، کشمش (90) کا نمبر ہے۔ اناناس (83) اور کیلا (73) بھی خاصے کاربوہائیڈریٹ رکھتے ہیں۔

لیکن یہ یاد رہے کہ بعض زیادہ کاربوہائیڈریٹ کی حامل غذائیں بڑی غذائیت بخش ہوتی ہیں، مثلاً تربوز، آلو، شکر قندی (70) وغیرہ۔ لہٰذا انہیں حسب موقع استعمال کیجیے، مگر یہ دھیان رہے کہ کاربوہائیڈریٹ والی کوئی اور غذا نہ کھائیے۔ مزید برآں درج ذیل عوامل بھی ایک غذا کے گلائسیمک انڈکس پر اثرانداز ہوتے ہیں:

☆ پھل یا سبزی جتنی پک جائے، اس میں اتنے ہی زیادہ کاربوہائیڈریٹ ہوتے ہیں۔ نیز انہیں جتنا زیادہ ذخیرہ کیا جائے، تب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

☆ پکانے کا کم یا زیادہ وقت بھی بعض غذاؤں میں کاربوہائیڈریٹ کی مقدار بڑھا یا گھٹا دیتا ہے۔

☆ ایک غذا کی اقسام میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

☆ پروسیسنگ کا عمل خصوصاً پھلوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ مثلاً پھلوں کے رس (جوس) پھل کی نسبت زیادہ کاربوہائیڈریٹ رکھتے ہیں۔

کم کاربوہائیڈریٹ والی غذائیں دیر سے ہضم ہوتی اور طویل عرصہ ہمارے نظام ہضم میں رہتی ہیں۔ اسی باعث یہ بھوک ختم کرتی ہیں۔ یوں انہیں وزن کم کرنے میں مفید پایا گیا ہے۔ تاہم یاد رہے، وزن اسی وقت کم ہوتا

پروٹین یوریا

چھ ماہ قبل کینیڈین یونیورسٹی آف کال گرے میں اسسٹنٹ پروفیسر تنویر چودھری اپنی ٹیم کے ساتھ مختلف اسپتالوں میں محفوظ پیشاب کے نمونوں کا سائنسی تجزیہ کرنے لگے۔ چھ ماہ میں آٹھ لاکھ دس ہزار نمونوں کا تجزیہ کیا گیا۔ مدعا یہ جاننا تھا کہ پیشاب میں پروٹین کی زیادتی کیا گل کھلاتی ہے۔ یہ حالت طبی اصطلاح میں ''پروٹین یوریا'' (Protein Uria) کہلاتی ہے۔

تحقیق سے افشا ہوا کہ جن مرد و زن کے بول میں پروٹین زیادہ پایا گیا، وہ جلد چل بسے۔ (پیشاب کے نمونے مردہ انسانوں کے تھے)۔ جبکہ جن کے نمونوں میں پروٹین کم تھا، وہ کم از کم پندرہ برس زیادہ زندہ رہے۔ گو اب پیشاب میں پروٹین کی کمی یا بیشی انسان کو بتا سکتی ہے کہ وہ طویل عمر پائے گا یا کم!

پروٹین یوریا کا ٹیسٹ آسان ہے۔ بس ڈاکٹر کو کہیے کہ آپ پروٹین یوریا اسکریننگ کرانا چاہتے ہیں۔ اگر پیشاب میں پروٹین کی زیادتی نکلے تو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... یہ امر بس یہ واضح کرتا ہے کہ آپ کے گردے خراب ہو چکے۔ نتیجہ پھر ڈاکٹر کو دکھائیے۔ وہ یہ جاننے کی سعی کرے گا کہ پیشاب میں پروٹین کیوں ظاہر ہوا؟ وجہ جاننے کے بعد وہ ادویہ دے گا یا بتائے گا کہ اپنے طرز زندگی میں کیونکر اور کیا تبدیلی لائیں۔

ہے جب آپ کم حراروں (کیلوریز) والی غذائیں کھائیں اور حرارے جلانے کی رفتار بڑھا دیں۔

عام طور پر وزن کم کرنے والوں کو ڈاکٹر مشورہ دیتے ہیں کہ کم کاربوہائیڈریٹ اور حراروں والی غذائیں کھائیں۔ ساتھ ساتھ ورزش بھی کریں تاکہ بدن کی چربی گھل سکے۔ اس پروگرام پر بخوبی عمل کرنے سے آپ ہر ہفتے 1 تا 2 کلو وزن کم کر سکتے ہیں۔ لیکن ہر ہفتے 2 کلو سے زیادہ وزن کم ہو، تو یہ اس امر کی نشانی ہے کہ آپ چربی نہیں پانی یا بافتوں سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔

تاہم یہ یاد رہے کہ اچھی صحت حاصل کرنے کے لیے صرف گلائسیمک انڈکس پر عمل کرنا موزوں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بعض کم کاربوہائیڈریٹ والی غذائیں زیادہ حرارے، شکر اور نقصان دہ چکنائی رکھتی ہیں۔ لہٰذا ان کا زیادہ استعمال الٹا آپ کو بیمار کر سکتا ہے۔

کاربوہائیڈریٹ کی دو اقسام ہیں: سادہ اور پیچیدہ۔ سادہ میں چینی شہد اور مٹھاس کی دیگر اقسام شامل ہیں۔ پیچیدہ گروہ میں ثابت اناج، ریشے دار سبزیاں اور دالیں آتی ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ سادہ کاربوہائیڈریٹ کم جبکہ پیچیدہ زیادہ کھائیے۔

ذیابیطس قسم 2 کا شکار مرد و زن گلائسیمک انڈکس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یوں کم کاربوہائیڈریٹ والی غذاؤں سے ان کے خون میں شکر کی سطح اعتدال پر رہے گی اور وہ ذیابیطس کے منفی اثرات مثلاً امراض قلب، اندھے پن، گردوں کی خرابی وغیرہ سے دور رہیں گے۔

دیگر مرد و زن بھی گلائسیمک انڈکس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس کی مدد سے تھکن اور اضمحلال کی کیفیت سے بچنا مشکل ہے۔ یہ اُس وقت جنم لیتی ہے جب ہم بہت زیادہ میٹھی اشیاء کھا لیں۔ نتیجتاً بہت زیادہ انسولین جمع ہو جاتی ہے۔ یہ انسولین خون میں موجود شکر کو جگر، عضلات یا چربی میں مرتکز کر دیتی ہے۔ چناں چہ خون میں شکر کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہے۔ اسی خلل کے باعث ہم پھر تھکن اور سستی محسوس کرتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تھکن کی وجہ سے کئی مرد و زن سمجھتے ہیں کہ وہ کمزوری کا شکار ہیں۔ نتیجتاً وہ مزید غذا کھاتے ہیں۔ اگر یہ غذا زیادہ کاربوہائیڈریٹ پر مشتمل ہو، تو ان میں شکر بڑھنے سے مزید انسولین جنم لیتی ہے۔ یوں غیر فطری چکر چل پڑتا ہے جو صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

○○○

یہ ہیں یادداشت بڑھانے کے 9 آسان طریقے

ڈاکٹر حادی

انسان کی عمر جیسے جیسے بڑھے، اس کی یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ لیکن ہر شخص احتیاطی تدابیر اپنا کر اپنی یادداشت کو طویل عرصہ تک برقرار رکھ سکتا ہے۔ ان تدابیر کو اختیار کرنا چنداں مشکل نہیں جو درج ذیل ہیں۔

(1)۔ دماغ مضبوط کرنے والی غذائیں

ان غذاؤں میں وہ سرفہرست ہیں جن میں اومیگا 3 فیٹس، گلوکوز (ثابت اناج) اور ضدتکسیدی مادے (Antioxidants) ملتے ہیں۔ مزید برآں دن میں پانچ چھ بار کھانا کھائیے۔ وجہ یہ ہے کہ وقفے وقفے سے تھوڑا کھانا کھانے سے خون میں گلوکوز کی سطح برقرار رہتی ہے اور دماغ بنیادی طور پر گلوکوز ہی سے توانائی حاصل کرتا ہے۔

(2) - دماغ کو مصروف رکھیے

ایسی سرگرمیاں اپنائیے جن سے دماغ کی ورزش ہو..... مثلاً معمے حل کیجیے اور کراس ورڈ پزل کھیلیے۔ ان سرگرمیوں سے دماغ کی ورزش ہوتی ہے اور چاق چوبند رہتا ہے۔

(3)۔ جسم کو فٹ رکھیے

روزانہ صبح سویرے یا شام کو تیز چہل قدمی کیجیے اور بدن پھیلانے والی ورزش کیجیے۔ ان ورزشوں کے ذریعے نہ صرف دماغ کا سفید مادہ بڑھتا ہے بلکہ مزید نیورون (خلویاتی) کنکشن بھی جنم لیتے ہیں۔

(4)۔ دباؤ نہ بڑھنے دیں

ورزش سے ذہنی و جسمانی دباؤ کم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ دراصل اس دباؤ کے باعث جسم میں کورٹیسول کیمیائی مادہ پیدا ہوتا ہے جو دماغ کے مراکزِ یادداشت کو سکیڑ دیتا ہے۔ مزید برآں عبادت اور مراقبہ بھی یادداشت بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

(5)۔ فولاد کی سطح چیک کریں

ہمارے دماغ کے خصوصی خلیئے نیوروٹرانسمیٹر ہماری یادداشت عمدہ حالت میں رکھتے ہیں۔ اور یہ خود فولاد کے ذریعے توانا رہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے بدن میں اس اہم معدن کی کمی نہ ہونے دیجیے۔ جن مرد و زن میں فولاد کی کمی ہو، وہ عموماً بھلکڑ بن جاتے ہیں۔

(6) - ایک وقت میں ایک کام

کئی مرد و زن ٹی وی پر خبریں سنتے ہوئے کھانا کھاتے اور کبھی کبھی تو اخبار بھی پڑھنے لگتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ یوں انہیں سنی گئی خبریں یاد رہتی ہیں اور نہ ہی پڑھا گیا مواد۔ یہ کھانے کا صحت بخش طریقہ بھی نہیں۔

دراصل جب ہم ایک وقت میں دو یا زائد کام کریں، تو دماغ پروسیسنگ کا عمل ایسے علاقوں میں منتقل کر دیتا ہے جو تفصیل سے یادیں محفوظ نہیں کرتے۔ لیکن ایک وقت میں ایک کام کیا جائے، تو دماغ اس کی تفصیلات تک محفوظ رکھتا ہے۔

(7)۔ کولیسٹرول پر قابو پائیے

انسانی جسم میں کولیسٹرول کی زیادتی بڑا خطرناک عمل ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف دل کی شریانوں میں چربی جمتی ہے۔ بلکہ دماغ میں بھی خون کی نسوں میں لوتھڑے جنم لیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے دماغ کو قیمتی غذائیت نہیں ملتی اور بتدریج یادداشت جاتی رہتی ہے۔ واضح رہے، دماغ میں تھوڑی سی چربی بھی نسیں بند کر ڈالتی ہے۔ لہٰذا اپنا کولیسٹرول اعتدال پر رکھیے۔

(8)۔ ادویہ پر نظر رکھیں

کئی ادویہ انسانی یادداشت پر منفی اثرات ڈالتی ہیں اور ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انسان جتنا بوڑھا ہو، دوا اتنی ہی دیر تک اس کے بدن میں رہتی ہے۔ نظام یادداشت پر اثرانداز ہونے والی ادویہ میں اینٹی ڈیپریسنٹ، بیٹا بلاکرز، کیموتھراپی، پارکنسن مرض کی دوائیں، نیند آور، دردکش، اینٹی ہسٹامائنز اور سٹاٹینس شامل ہیں۔

(9) - ایک سیب روزانہ کھائیے

سیب میں شامل ضدتکسیدی مادوں کی بلند مقدار زیادہ ایسیٹلکولین (Acetylcholine) کیمیائی مادہ پیدا کرتی ہے۔ دماغ میں ملنے والا یہ نیوروٹرانسمیٹر عمدہ یادداشت کے لیے لازمی ہے۔ مزید برآں درج بالا ضدتکسیدی مادے دماغ کو مضرصحت آزاد اصلیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

مفید اور دلچسپ تحقیقات

انگلیوں کی ساخت سے لے کر لپ اسٹک کے استعمال تک نئی سائنسی تحقیقات، جو آپ کو دم بخود کر دیں گی

ڈاکٹر شائستہ خان

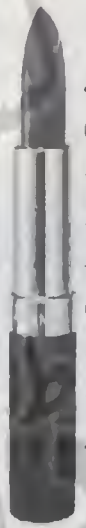

امریکی یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، برکلے کے ماہرین نے مختلف کمپنیوں کی لپ اسٹکوں اور لپ گلوسز (Glosses) میں زہریلی دھاتیں مثلاً سیسہ، کیڈمیم، کرومیم اور المونیم دریافت کی ہیں۔ اس سامان آرائش میں دھاتوں کی مقدار زیادہ نہیں ہوتی، مگر ان خواتین کے لیے یہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں جو زیادہ لپ اسٹک یا لپ گلوس لگاتی ہیں۔

دراصل ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک کھانے پینے یا زبان پھیرنے سے منہ میں داخل ہوتی رہتی ہے۔ جو خواتین زیادہ لپ اسٹک لگائیں، ان کے بدن میں زہریلی دھاتوں کی زائد مقدار داخل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ ان کی صحت متاثر کرتی ہے۔

یاد رہے کہ سیسہ، کرومیم اور دیگر دھاتیں انسان میں پیٹ کی رسولیاں اور نظام اعصاب کی خرابیاں پیدا کرتی ہیں۔ یہ دھاتیں خصوصاً حاملہ خواتین اور بچیوں کے لیے نقصان دہ ہیں۔ لہٰذا لپ اسٹک کے استعمال میں احتیاط کیجیے اور کم سے کم لگائیے۔

اعضائے جسم کے راز

بالوں کے رنگ سے لے کر بازوؤں کی لمبائی، ناخنوں تک ہمارے جسمانی اعضا کی شکل و صورت ہماری صحت کے کئی راز آشکار کرتی ہے۔ ان رازوں سے شناسائی مفید امر ہے کیونکہ اگر خطرے والی بات ہو، تو آپ بروقت اس کا سدباب کر سکتے ہیں۔

1۔ انگلیوں کی لمبائی

دوران حمل مختلف ہارمونز اور جینز (Genes) کے عمل سے بچے کی انگلیاں لمبی ہوتی ہیں۔ اگر کسی باعث اس عمل میں گڑبڑ ہو جائے، تو انگلیاں زیادہ لمبی یا چھوٹی ہو جاتی ہیں۔

امریکی بفلو یونیورسٹی کے ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ جس مرد یا عورت کی انگشت شہادت (Index finger) انگشت حلقہ Ring (finger سے چھوٹی ہو، وہ عموماً غصیلے، تند مزاج اور جھگڑالو ہوتے ہیں۔ یہ انکشاف ایک ہزار رضاکاروں کی انگلیوں پر تحقیق سے سامنے آیا۔ لیکن اس کی وجہ کیا ہے، ماہرین سائنس یا نفسیات یہ بتانے سے قاصر ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اُدھر برطانیہ کی وارک یونیورسٹی کے محققین نے ایک تجربے میں دریافت کیا کہ جن مردوں کی انگشت شہادت انگشت حلقہ سے زیادہ لمبی ہو، وہ مثانے کے سرطان کا زیادہ بڑی تعداد میں نشانہ بنتے ہیں۔ لہٰذا ان مردوں کو چاہیے کہ مرض سے بچنے کے حفاظتی اقدامات اپنائیں، مثلاً کم چکنائی والی غذا کھائیں، پھل و سبزی کا استعمال زیادہ کریں، ورزش کریں اور شراب نوشی سے دور رہیں۔

2۔ سرخ بال اور درد کی شکایت

جرمن سائنس دانوں نے تحقیق و تجربے سے جانا ہے کہ سیاہ اور سنہرے بال رکھنے والوں کی نسبت سرخ بالوں والے مرد و زن زخمی ہونے یا علاج کراتے وقت زیادہ تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا خیال ہے کہ زائد تکلیف کا سبب وہی جین ہے جس میں تبدیلی کی وجہ سے بال سرخ ہو جاتے ہیں۔

3۔ پست قامت طویل عمر پاتے ہیں

پچھلے ماہ طبی سائنس کے مشہور رسالے 'ویسٹرن جرنل آف میڈیسن' میں امریکی ماہرین کی ایک دلچسپ تحقیق طبع ہوئی۔ یہ تحقیق 25 سال پر مبنی تھی اور اس دوران دنیا بھر کی تحقیقی رپورٹوں اور دستاویزات کا مطالعہ ہوا۔ مدعا یہ جاننا تھا کہ پست قامت مرد و زن لمبی عمر پاتے ہیں یا لمبا قد رکھنے والے؟

تحقیق سے انکشاف ہوا کہ چھوٹے بدن رکھنے والے انسان زیادہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ نیز ان میں موذی بیماریاں بھی دیر سے جنم لیتی ہیں۔ واضح رہے، جاپانی، ہانگ کانگ کے چینی اور یونانی طویل عرصہ زندہ رہتے ہیں..... اور یہ سب مغربیوں اور دیگر ایشیائیوں کے مقابلے میں چھوٹے جسم رکھتے ہیں۔

طویل عمر پانے میں جسم کے سائز کے علاوہ جسمانی وزن، باقاعدگی سے ورزش اور مفید طبی عادات بھی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ لہٰذا انہیں اختیار کرنے سے طویل القامت مرد و زن بھی لمبی عمر پا سکتے ہیں۔

4۔ کان کی لو اور حملہ قلب

کان کی لو میں پڑتی لکیریں، کم ہوتے بال، گنجا پن اور آنکھوں کے گرد چربی کی تہیں نہ صرف بڑھاپے کی آمد کا پتا دیتی بلکہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ آپ مختلف طبی مسائل میں گرفتار ہو چکے۔ خاص طور پر کان کی ایک یا دونوں لوؤں پر لکیر پڑنا اس امر کی نشانی ہے کہ آپ حملہ قلب (ہارٹ اٹیک) کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

آنکھوں کے نیچے کولیسٹرول استحالہ (میٹابولزم) میں خرابی کی وجہ سے چربی کی تہیں چڑھتی ہیں۔ اسی خرابی کے باعث جسم میں زائد چربی جنم لیتی ہے یا صحیح طرح بدن سے خارج نہیں ہو پاتی۔ اس خرابی سے بچنے کے لیے جسم میں کولیسٹرول کی سطح مسلسل چیک کیجیے اور بلڈ پریشر قابو میں رکھیے۔

5۔ بایاں ہاتھ اور گھبراہٹ

کچھ لوگ دائیں اور بعض بائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں۔ امریکی یونیورسٹی آف لوئس ویل کے محققوں نے بعد از تحقیق یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ بائیں ہاتھ سے لکھنے والے دوسروں کی نسبت زیادہ جلد گھبراہٹ اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کا سبب ان کے دماغ میں ہونے والی اچھوتی وائرنگ ہے۔

تحقیق سے یہ دلچسپ بات بھی سامنے آئی کہ جو مرد و زن لکھتے وقت یا دوران گفتگو دونوں ہاتھ استعمال کریں، وہ مثبت طرز فکر رکھتے اور بے چینی میں کم ہی مبتلا ہوتے ہیں۔ ماہرین کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دماغ کے دونوں (دائیں و بائیں) حصوں سے مدد لیتے ہیں۔ اس تال میل کے باعث وہ منفی باتوں کی سمت متوجہ نہیں ہوتے۔

6۔ چھوٹے بازوؤں والی عورتیں

امریکی طبی ادارے 'کلیولینڈ کلینک سینٹر فار برین ہیلتھ' نے طویل تحقیق کے بعد دریافت کیا ہے کہ جن خواتین کے بازو چھوٹے ہوں، یعنی ان کی لمبائی 16 انچ سے کم ہو، وہ دوسروں کی نسبت الزائمر مرض کا زیادہ نشانہ بنتی ہیں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ وہ احتیاط کریں اور جب الزائمر مرض کی علامات ظاہر ہوں تو فوراً ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ شمالی مغربی ہندوستان میں اپنے زمانے کے سلسلۂ سہروردیہ کے اہم صوفی تھے۔اس سلسلے کا آغاز بغداد میں ہوا تھا۔حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت بابا فریدالدین گنجشکر آپ کے ہم عصر تھے۔آپ کا سلسلۂ نسب قریشی اسدی ہاشمی تھا۔

آپ کے دادا شیخ کمال الدین علی شاہ سن 200ھ میں مکہ سے خوارزم اور پھر ملتان کے نزدیک کوٹ کروڑ تشریف لائے۔ان کے والد شیخ وجیہہ الدین نے مولانا حسام الدین ترمذی کی صاحب زادی بی بی فاطمہ سے شادی کی۔بعض روایات میں ہے کہ ان کی والدہ حضرت بابا فرید الدین گنجشکر کی والدہ کی بہن تھیں۔آپ پیدائشی ولی تھے۔کہا جاتا ہے کہ ان کے والد قرآن پڑھتے تو آپ دودھ پینا چھوڑ کر قرآن پاک کی تلاوت پوری توجہ اور احترام سے سننے لگتے۔

آپ 566ھ میں کوٹ کروڑ میں بروز جمعہ بتاریخ 27 رمضان المبارک تولد ہوئے۔بعضوں کا خیال ہے کہ آپ کی پیدائش 587ھ (1192ء) کو ہوئی،یعنی اسی سال جس سال حضرت معین الدین چشتیؒ اجمیر میں وارد ہوئے۔انھوں نے نا صرف سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا بلکہ سات قسم کے لحن میں قرأت پر بھی عبور حاصل کیا۔

والد کی وفات کے بعد آپ خراسان چلے گئے اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تہذیب پر سات برس تک مشغول رہے۔انھوں نے تکمیل تعلیم بخارا میں کی۔اور اپنی پاکیزہ عادات واطوار کی وجہ سے فرشتہ کے عرف سے مشہور ہو گئے۔یہاں سے مکہ مدینہ کا سفر اختیار کیا جہاں اس زمانے کے جید محدث شیخ کمال الدین یمنی سے علمِ حدیث میں سند حاصل کی۔مدینہ سے آپ یروشلم، پھر بغداد گئے اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے حلقۂ طریقت میں شامل ہو گئے۔اور صرف 17 دن کی قلیل مدت میں تصوف کے اسرار و رموز میں درک حاصل کر کے خرقۂ خلافت پایا۔دوسرے شاگرد آپ سے حسد کرنے لگے تو شیخ شہاب الدین نے فرمایا کہ بہاؤالدین سوکھی لکڑی کی طرح ہے جو جلد آگ پکڑتی ہے جب کہ تم گیلی لکڑیوں کی طرح ہو جنھیں آگ پکڑنے میں دیر لگتی ہے۔

خرقۂ خلافت عطا ہونے سے قبل حضرت بہاؤالدین نے خواب دیکھا کہ ایک روشنیوں کا گھر ہے جس میں حضور ﷺ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔وہاں ایک رسی بندھی ہے جس پر بہت سے خرقے لٹک رہے ہیں۔حضور ﷺ نے ایک خاص خرقے کی طرف اشارہ کر کے حضرت شہاب الدین سے فرمایا کہ ''اے عمر! یہ خرقہ بہاؤالدین کو پہنا دو۔حضرت بہاؤالدین نے حضور ﷺ کے پیر مبارک کو چھوا اور خرقہ لے کر پہن لیا۔

جب صبح آنکھ کھلی تو انھیں شیخ شہاب الدین نے طلب فرمایا۔حضرت بہاؤالدین کو ہو بہو خواب کے منظر کا عکس نظر آیا۔شیخ نے آپ کو ایک خرقہ عطا فرمایا اور کہا کہ یہ خرقے حضور ﷺ کے ہیں جنھیں میں حضور ﷺ کی اجازت سے ہی کسی کو دے سکتا ہوں،جیسا کہ تم نے پچھلی رات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

شیخ شہاب الدین نے آپؒ کو واپس ملتان جا کر سلسلہ رشد و ہدایت شروع کرنے کا حکم دیا۔آپ کے ساتھ حضرت جلال الدین تبریزی بھی تھے جنھیں بنگال جانے کا حکم دیا گیا۔چنانچہ دونوں حضرات جب نیشاپور پہنچے تو شیخ جلال الدین تبریزیؒ حضرت فرید الدین عطارؒ سے ملے۔واپسی پر حضرت بہاؤالدینؒ نے پوچھا کہ ان درویشوں میں سے سب سے اچھا کس کو پایا۔تو انھوں نے جواب دیا بلاشبہ عطار بہترین ہیں۔

ایک مشکل سفر کے بعد آپ ملتان پہنچے اور وہاں ایک حلقہ درس قائم کیا۔وہاں کے شیوخ نے دودھ سے لبالب پیالہ ان کی خدمت میں بھجوایا۔شیخ نے اس میں گلاب کا پھول رکھ کر واپس کر دیا۔جس کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ تم سب موجود ہو لیکن میری حیثیت تم میں پھول کی مانند ہو گی۔تمام لوگ آپ کی ذہانت، دوررسی اور خوش اخلاقی سے بہت متاثر ہوئے۔چنانچہ آپ عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے اور حق کی تعلیم دینے لگے۔آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور بڑی تعداد میں تاجر حضرات عراق اور خراسان سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔آپ نے ایک وسیع خانقاہ تعمیر کرائی جہاں غلے کے ڈھیر لگے تھے۔لیکن یہاں معروف مذہبی علما، تاجر اور طبقۂ شرفا کے لوگ ہی قیام پذیر ہوتے تھے۔عام آدمی کا یہاں گزر مشکل تھا۔

شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں پرتھوی راج کی شکست کے بعد دہلی میں قطب الدین ایبک بحیثیت نائب حکومت کرتا تھا جبکہ ناصر الدین قباچہ ملتان کا گورنر تھا۔ایبک کی وفات کے بعد التمش دہلی کا حکمران بنا جو کہ ایک خدا ترس، نیک، متقی، نخی انسان تھا اور حضرت بختیار کاکیؒ کا مرید تھا۔لیکن قباچہ نے اس سے بغاوت کی اور خود کو ملتان کا حاکم قرار دیا۔ملتان کے قاضی مولانا شرف الدین اصفہانی اور شیخ بہاؤالدینؒ اس سے خوش نہ تھے۔انھوں نے التمش کو اس کی اطلاع دی۔لیکن التمش کو لکھے گئے دو خطوط قباچہ کے جاسوسوں نے پکڑ لئے۔قباچہ نے قاضی صاحب کو فوراً قتل کرادیا۔شیخ بہاؤالدین کو اپنے محل میں طلب فرمایا اور خط کے متعلق استفسار کیا۔شیخ نے انتہائی جرأت سے جواب دیا کہ انھوں نے خط خدائی حکم کے بموجب ارسال کیا تھا۔آپ کا جواب سن کر قباچہ کانپنے لگا اور آپ کو جانے کا حکم دیا۔

حضرت بہاؤالدین نے ملتان میں شادی کی۔آپ کے سات بیٹے تھے۔آپ کو اپنے بیٹے شیخ صدر الدین عارف کے صاحبزادے رکن الدین ابوالفتح سے محبت تھی جو کہ بہت بڑے صوفی تھے۔

آپ کی وفات کا واقعہ بہت عجیب ہے۔ایک دن ایک مرید نے ایک خط آپ کے صاحبزادے شیخ صدر الدین کو دیا کہ اسے اپنے والد کو دے دیں۔شیخ صدر الدین نے جب خط پر لکھا پتا دیکھا تو ان کا رنگ زرد پڑ گیا۔انھوں نے وہ خط شیخ بہاؤالدین کو دیا جسے پڑھ کر آپ باآوازِ بلند رونے لگے۔اسی رات آپ کا انتقال ہو گیا۔

آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے خرچ پر اپنا مزار تعمیر کرایا۔مزار کے دو درجے ہیں۔نیچے والا حصہ روایتی چوکور طرز کا ہے جبکہ اوپر والا حصہ ہشت پہلو ہے۔

آپ کے خلفا میں حضرت صدر الدین عارف، حضرت سید جلال الدین سرخپوش بخاری، حضرت شیخ حسن افغان، حضرت سید عثمان مروندی عرف لال شہباز قلندر، حضرت شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی اور سید حسین معروف ہیں۔

حسن افغانؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیتوں سے نوازا تھا کہ وہ ان پڑھ ہونے کے باوجود کسی تحریر میں سے قرآنی آیات کو پہچان لیتے تھے۔ حضرت بہاؤالدین نے ایک دفعہ فرمایا کہ اگر میری درگاہ کے سب لوگوں کا حساب دینے کے لئے ایک شخص کو بلایا گیا تو حسن افغان سب کی نمائندگی کے لئے پیش کردوں گا۔

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ میں حضرت فریدالدین گنجشکر کے مرید جمال الدین ہانسویؒ کے بدلے میں اپنے تمام مرید دینے کو تیار ہوں۔ اس پر بابا فریدؒ نے فرمایا کہ مال بدلا جاسکتا ہے ''جمال'' نہیں۔ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ صرف مذہبی عالم اور صوفی ہی نہ تھے بلکہ زبردست ماہر معاشیات اور مصلح تھے۔ وہ سندھ کے ریگستانوں کو سرسبز و شاداب زرعی زمین میں بدلنا چاہتے تھے جہاں نہری نظام ہو۔ تالاب اور کنوئیں ہوں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ دولت عطا کی تھی جسے راہِ خدا میں خرچ کرتے۔

اقوال:

1۔ اللہ کے طلبگار کو اندر سے دل کو ہر چیز سے الگ کرلینا چاہیے۔

2۔ جسمانی صحت برقرار رکھنے کے لئے کم کھانا چاہیے۔

3۔ صوفی کو چاہیے کہ روزانہ کا روزانہ رزق تلاش کرے اور ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر کرتا رہے۔

4۔ روح کی صفائی کے لئے ترک گناہ ضروری ہے۔

5۔ عقیدے کی پختگی کے لئے حضرت محمد ﷺ پر لاتعداد درود بھیجتا رہے۔

6۔ حقیقی محبت یہ ہے کہ صبح بیدار ہو تو اسے یاد نہ ہو کہ رات کو کیا ہوا، اور رات آئے تو دن کی کوئی بات یاد نہ ہو۔

7۔ اگر کوئی شخص بار بار اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے تو اللہ کی محبت کی خوشبو نہیں سونگھ سکتا۔

8۔ جسم کی حفاظت کم کھانے میں، روح کی کم سونے میں اور دین کی حفاظت نماز میں ہے۔

9۔ جس دل میں اللہ کی محبت نہیں وہ مردہ گوشت کا لوتھڑا ہے۔ لیکن اگر اس میں اللہ کا عشق ہے تو یہ ذات الٰہی کا آئینہ اور اس کی رحمت ہے۔

10۔ محبت کا مطلب ہے کہ سوائے اللہ کے کچھ نہ دیکھے۔ اور جنت، دوزخ، تعلقات اور ورثا کا خیال دل سے نکال دے۔

11۔ دنیاوی نفع و نقصان درویشوں کے لئے بے معنی ہے۔ انھیں نہ اس کے جانے کا افسوس ہوتا ہے نہ اس کے آنے پر خوشی۔

مشین گردی

آغا گل

ایک پوسٹ مین کا ماجرا، وہ اپنے اُس دشمن کا سر اُتار لایا تھا جس سے کئی زندگیاں اور نوکریاں جڑی ہوئی تھیں

پوسٹل کالونی میں کریم کا ڈھابا لٹ خانہ کہلاتا ہے۔ دنیا جہاں کے بے کار ملازمت کے متلاشی درختوں کی چھاؤں میں پاؤں پسارے اونگھنے والے غرض یہ کہ سب ہی چلے آتے۔ لاٹھی ٹیکتے پینشنر بھی جوانی کی یادیں تازہ کرنے مہینے میں ایک بار ضرور زیارت کے لیے آتے۔ یہاں کڑک چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے اور چند گھنٹوں کے لیے دوبارہ جوان ہو جایا کرتے۔ پنشن کی رقم لے کر بے رنگ کاپتی ٹانگوں والی میز، کرسیوں اور گھری چارپائیوں پہ چائے پینے کا عجب سرور تھا۔ کچھ لوگ لڈو سے جی بہلاتے تو بعض ایک تاش پھینٹنے لگتے۔ کریم کا لٹ خانہ افواہوں کا مرکز اور جاسوسی کا اڈا بھی تھا۔ ڈاک خانے کی ساری خبریں یہیں سے مل جایا کرتیں۔ محکمہ ڈاک کی عظمت گزشتہ کے قصے بھی دہرائے جاتے جب موسمیات کے علاوہ کونین کی فروخت اور محکمہ تار و ٹیلی فون بھی انہی کے پاس ہوا کرتا تھا۔ کیا بھلا دور تھا کہ ہر ایک تار پر جو دفتری اوقات کے بعد آیا کرتی، ایک روپیہ لیٹ فیس ملا کرتی۔ تنخواہ سے کہیں زیادہ تو لیٹ فیس ہوا کرتی جس کے باعث پوسٹ ماسٹر دو تین شادیاں رچا لیا کرتے۔ پوسٹ ماسٹر Morse پہ گٹ گٹ تاریں بھجوایا کرتے۔ موسم کا حال بھجوانے کا الگ سے معاوضہ ملا کرتا۔ بڑا ہی خوش حالی کا دور تھا۔ محکمہ ڈاک کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار مہاراجا بڑودا کی بگھی ریلوے اسٹیشن پہ ذرا تاخیر سے پہنچی۔ اس کے افسروں نے لپک کر گارڈ کو ٹرین روانہ کرنے سے منع کیا تاکہ

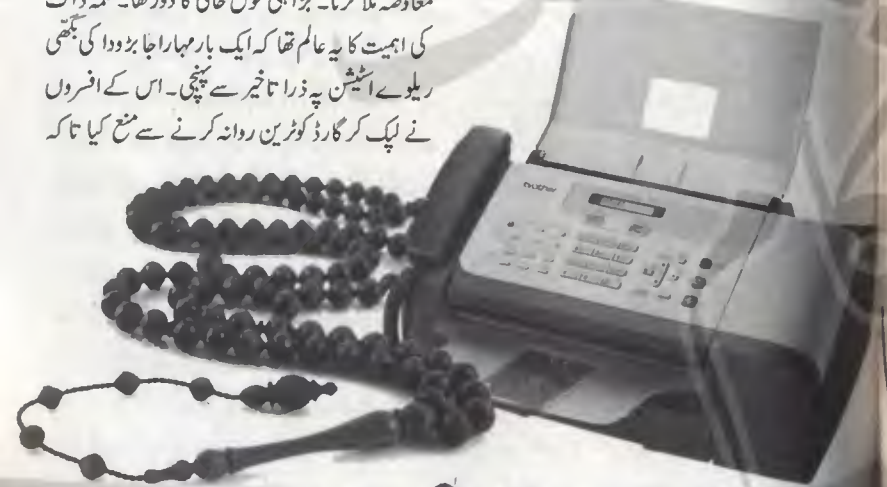

مہاراجا سوار ہو سکے۔ یہ ایک میل ٹرین تھی۔ سرکار کو علم ہوا چند منٹ تاخیر کی تو مہاراجا سے جواب طلبی ہوئی کہ اس نے سرکار انگلشیہ کی ڈاک کیوں روکی۔ مہاراجا نے لاکھ جواز پیش کیے مگر سرکار نہ مانی اور اسے تخت سے معذول کر کے اس کے بیٹے کو تخت نشین کر دیا، کہ جو شخص ڈاک کی ترسیل میں مزاحم ہو وہ ریاست چلانے کے قابل نہیں۔ ایسی کہانیاں سن کر سامعین کو اپنی عظمت گزشتہ کا اندازہ تو ہوتا مگر وہ ماضی کو یوں دیکھتے جیسے افیون چاٹنے والے بیاسی سالہ بہادر شاہ کو سترہ سالہ جواں بخت کا کٹا ہوا سر دکھایا گیا تھا۔ ایک ناقابل برداشت تکلیف اور اذیت ہوتی۔ ڈاک خانے والوں کے پیشِ نظر ماضی ہی تھا۔ حال نہ تھا، نہ ہی مستقبل۔ ایک گمبھیر سی فضا میں وہ جی رہے تھے۔ وہیں پہ ایک روز خبر ملی کہ عنقریب ایک نئی مشین بڑے ڈاک خانوں میں لگ جائے گی جو ڈاک کی تقسیم کا تمام کام خود ہی کرے گی۔ پوسٹ مینوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ تو اپنے بیٹوں کو پیکر، کینڈی ڈیٹ پورٹر اور پوسٹ مین لگوانے کے چکر میں تھے۔ یوں تو ان کی اپنی ہی نوکری خطرے میں پڑ جاتی۔ مشینوں کی چونکہ زبان نہیں ہوتی وہ کسی بھی لسانی گروہ کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ لہٰذا وہ ڈومی سائل سرٹیفکیٹ کے چکر سے بھی آزاد ہی رہتی ہیں۔ لٹ خانے میں کھلبلی مچی تو، پوسٹ مین یونین کے صدر علم دین کو سب نے آڑے ہاتھوں لیا جو نہایت انہماک سے رفیقوں کے ہمراہ چائے کی شرط کے بدلے لڈو کھیل رہا تھا۔ اس ڈاک بانٹنے والی مشین کے بارے میں جان کر اسے بھی کوفت ہوئی۔ یوں تو چھانٹی بھی ہو سکتی ہے، تاہم اُس کی تسلی سے پوسٹ مینوں کا حوصلہ بظاہر تو بڑھا ہی مگر دل کو ایک دھڑکا سا لگا رہا۔ اگلے ہی روز انھوں نے چیف پوسٹ ماسٹر سے میٹنگ مانگی جو فوراً ہی مل گئی۔ کیونکہ شورش کا اندیشہ تھا، انتظامیہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے کرنے کے حق میں تھی۔ یوں بھی انتظامیہ یونین کی شورش میں پسپائی اختیار کرتی۔ کہنے کو تو محکمہ فوج اور پولیس کی طرح Essential Services Department کے زُمرے میں آتا۔ مگر حکومت نے ووٹ بینک بڑھانے کے لیے انھیں مزدور یونین بنانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اسٹاف کسی کارخانے کا مزدور نہ تھا سرکاری ملازم تھا اور نہ ہی چیف پوسٹ ماسٹر Collective Bargaining agent سے اوقات کار اور مشاہرہ میں کمی بیشی کی اجازت دے سکتا تھا۔

عجب سا تماشا تھا۔ سبھی اس مزاحیہ ڈرامے میں برابر کے کردار تھے۔ یونین کی رسائی اوپر تک تھی۔ سیاست دان بھی ڈاک خانے والوں کو ووٹ بینک کے طور پہ استعمال کیا کرتے۔ حاضر سروس، ریٹائرڈ، ماں باپ، جوان اولاد غرض یہ کہ سبھی کے ووٹ تھے۔ ڈاک خانے تو دونوں کی دُکان ہوا کرتے ہیں۔ جلسوں کی رونق بڑھانے کے لیے ہیںرز کے علاوہ ان کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ چیف پوسٹ ماسٹر یوسف نے یونین کو خوش آمدید کہا۔ ان کے تیور قابو میں رکھنے کے پیش نظر سب ہی کے لیے سبز چائے بھی منگوا ڈالی تاکہ فضا دوستانہ ہی رہے۔ علم دین کا لہجہ میٹھی چائے پیتے ہوئے بھی درشت رہا۔

''چیف صاحب! آپ ایسی مشین لگا رہے ہیں جو پوسٹ مینوں کا کام کرے گی۔ ہمارا کیا بنے گا؟ ہم

ہڑتال کر دیں گے۔'' یوسف جانتا تھا کہ ''ہم ہڑتال کر دیں گے۔'' بطور ردیف استعمال ہوتا ہے ایسی گفتگو میں۔ اس نے تسلی دی۔ ''یہ مشین صرف ڈاک وصول کرے گی اور ٹرانسمیشن کرے گی۔ باقی کام تو پوسٹ مین ہی کریں گے۔ آپ صاحبان دیکھ لیں کہ مشین کی ٹانگیں ہی نہیں ہیں۔'' انھیں مشین دکھلائی گئی وہ ایک ڈبا نما مشین تھی۔

یوسف نے اقرار کیا ''ہاں بھئی فرسٹ جنریشن ہے گرمی میں یہ کام نہیں کر سکتی۔''

یونین ایک بار پھر مضطرب ہوگئی ''اور ہم جو ڈاک تقسیم کرتے ہیں۔ تربت اور سبی میں باون ڈگری میں جبکہ لو چلنے کے باعث جہاز بھی نہیں اتر پاتے۔ زمین انگارہ بنی ہوتی ہے گرمیوں میں۔ سردیوں میں زیارت اور کان مہترزئی میں جبکہ درجہ حرارت منفی پندرہ ڈگری سے نیچے گر جاتا ہے، ہم تب بھی ڈاک تقسیم کرتے ہیں۔ یہ کون سا انصاف ہے بھلا؟'' یوسف بدستور معنی خیز انداز میں مسکراتا رہا ''اے بھئی آپ تو اشرف المخلوقات ہیں۔ آپ کی کیا بات ہے؟''

علم دین نے اپنے خستہ حال ساتھیوں پہ نگاہ دوڑائی۔ محنت مشقت اور غربت نے انھیں وقت سے پہلے ہی بوڑھا بنا دیا تھا، زندگی نچوڑ لی تھی ان کے جسموں سے، ان کی آنکھوں سے۔ مگر وہ بھنا گئے۔ ''اشرف المخلوق اپنے پاس ہی رکھیں۔ ہمیں اور ہمارے بچوں کو پیٹ بھر کھانا تو دیں۔''

پوسٹ ماسٹر سے صبر نہ ہو سکا ''آپ صاحبان کفر نہ بکیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہی ہے۔ یہی ہمارا عقیدہ ہے اور نہ لگیں پوسٹ مین۔ جائیں فیکٹری لگا لیں۔''

اسٹاف کی مخالفت کے باوجود دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی دنوں میں بکنگ ہال کے اندر شیشے کا ایک ایئر کنڈیشنڈ کیبن بن گیا۔ یوں اس فیکس مشین نے کام شروع کر دیا۔ شہر کے چار نئی ڈیلیوری زونز بنے۔ چار پوسٹ مینوں کو نئے موٹر سائیکل دے کر فیکس مشین کی ڈیوٹی پر لگا دیا۔ جبکہ دیگر پوسٹ مین اپنی beats پر عمر رسیدہ کھڑکھڑاتی سائیکلوں ہی پہ نکلا کرتے۔ ایک ناقابل برداشت تضاد تھا۔ فیکس مشین نے ایک نئی کلاس ایک وی آئی پی کلچر متعارف کرا دیا تھا جس کے باعث سبھی کا دل جلتا رہتا۔ بخشو ماما کی سانولی سی لونڈیا بانو کو اس ٹھنڈے کیبن میں فیکس مشین کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ دن بھر وہ اس شاہانہ اور بہت ہی آرام دہ کیبن میں ٹھاٹھ سے کام کرتی، عشوہ طرازیاں کرتی، جبکہ پوسٹ مین لو میں جھلسی ہوئی آگ اگلتی سڑکوں پہ مرزا کی بائیسکل پہ ڈاک تقسیم کرتے پھرتے۔ سرد کمرے میں بجی وودھیا مشین اور سانولی بانو کو طنزیہ نظر سے دیکھتے ہوئے پوسٹ مین گزرا کرتے، تو ان کے دل پہ گھونسا پڑتا۔ ان کا بس چلتا تو فیکس باہر پھینک آتے اور شیشہ توڑ کے پورے کاؤنٹر ہال کے لیے آسودگی کے مواقع پیدا کرتے۔ بانو کے بارے میں نازیبا باتیں بھی کرتے۔ ایک رات لڈو کی گیم پہ رقم ہار کے علم دین بھاری قدموں سے گھر آیا اور بستر پہ ڈھیر ہوا تو بیوی نے توجہ دلائی کہ پنکھا خراب ہوگیا ہے۔ پنکھا دم سادھے پر پھیلائے خاندان سے بے تعلق رہا۔ نہ تو اسے بچوں پر ترس آیا نہ ہی میاں بیوی پہ جو من کی آگ میں بھی جھلسے ہی جا رہے تھے۔ گزر بسر بمشکل ہو رہی تھی، بازار میں قیمتیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ علم دین پہ

انکشاف ہوا کہ مشینوں کا دل نہیں ہوا کرتا۔ ورنہ اتنے برس ساتھ رہنے پہ کچھ تو اس کمبخت میں مروت ہوتی۔ جب نئی نئی شادی ہوئی تھی تو یہی پنکھا سائیکلوپس والی آنکھ سے انھیں تاڑتا رہتا۔ اس چمکتی ہوئی آنکھ میں اپنا عکس دیکھ کر دُلھن شرما جایا کرتی۔ مگر پنکھا افسروں کے مانند کٹھور اور بے مروت تھا۔ اگر یہ محکمہ ڈاک کا افسر ہوتا تو اگلے ہی روز اس کے خلاف اخباری بیان جاری کر دیتا جس سے اس کی سٹی گم ہو جاتی اور وہ سہم کر خود ہی گھومنے لگتا۔ مگر مشینوں کو بلیک میل نہیں کیا جا سکتا۔

اور پھر علم دین جلا بھنا گھر آیا تو اس نے صحن سے ڈنڈا اُٹھایا اور پنکھے کو غصے میں پیٹ ہی ڈالا۔ وہ اس قدر گرجا کہ پڑوسی دوڑ پڑے۔ انھوں نے بمشکل پنکھے کو علم دین سے چھڑایا جو فوجیوں کی دیکھا دیکھی پنکھے کو کوڑے ہی مارے جا رہا تھا۔ پڑوسیوں کو علم دین کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا، وہ اسے لٹ خانہ لے گئے۔ چائے پی کر علم دین کے حواس درست ہوئے وہ پشیمان بھی ہوا کہ اسٹاف میں بات پھیلی کہ وہ پاگل اور جنونی ہے تو ہاتھ سے صدارت بھی جائے گی۔ اگلے روز ڈاک بانٹتے وہ پروفیسر جلیل کے ہاں پہنچا۔ اگرچہ پروفیسر جلیل یونیورسٹی کے ڈین تھے۔ اِکتیس (21) گریڈ میں تھے پھر بھی ایک درویشی ان کی طبیعت کا خاصا تھی۔

علم دین نے خط اور بجلی کا بل ان کے حوالے کیا اور موقع غنیمت جانتے ہوئے دل میں ابلتے سوال اُگل دیے۔

''ساب لوگ کہتے ہیں انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مشینیں ان کی غلام ہیں۔ جبکہ مجھے یوں لگتا ہے کہ ہم مشینوں کے غلام ہیں۔ فیکس مشین ایئر کنڈیشن میں کام کرتی ہے جبکہ میں ان توے جیسی گرم سڑکوں پہ ڈاک بانٹتا ہوں۔ ہم میں سے کون افضل ہے؟ میں یا مشین؟''

پروفیسر نے علم دین کے لیے شربت منگوایا ''اتنا نہ سوچا کرو خالق مخلوق سے بڑا ہوتا ہے۔ انسان نے مشین تخلیق کی وہ ان سے یقیناً برتر ہے۔''

علم دین کراہا ''میں کام سے انکار نہیں کر سکتا جبکہ فیکس کر سکتی ہے۔ اس کے بیوی بچے بھی نہیں۔ افسوس کہ اس کا پیٹ بھی نہیں جسے دن میں تین بار بھرنا پڑتا ہو۔''

پروفیسر نے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا۔ ''ہوش کے ناخن لو علم دین! دراصل صنعتی انقلاب میں زیادہ مشینیں ایجاد ہوئیں، مقصد تھا بہتر سہولتیں مہیا کرنا۔ نوع انسانی کی خدمت کرنا رات دن، مگر رفتہ رفتہ سرمایہ دارانہ نظام میں انسان خود ایک پروڈکٹ بن گیا، انسان بھی قابل فروخت ہو گیا۔ وہ خود بھی مشینوں کا غلام بنتا چلا گیا۔ مشینیں مہنگی ہو گئیں اور انسان سستے۔''

علم دین مایوس ہو گیا ''ہم مشینوں کے خلاف بغاوت بھی تو کر سکتے ہیں۔ ہم آزاد بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

پروفیسر کو محسوس ہوا کہ علم دین میں بغاوت جنم لے رہی ہے۔ مفت میں چٹان پہ ماتھا مار رہا ہے۔ کیا عجب مارا ہی جائے۔

''دیکھو علم دین مشینوں کے ساتھ رہ کے ہم بھی مشینیں بن چکے ہیں۔ ہمارے انسانی جذبات کب کے ختم ہو چکے ہیں۔ مشین انرجی پر چلتی ہے۔ قدرت اور عقیدے سے بھی اس کا تعلق نہیں۔ ہم بھی لالچ اور خوف کے فیول سے چلتے ہیں۔''

علم دین تھکا ماندہ گھر آیا تو دیکھا کہ بیوی نے پنکھا ٹھیک کروا لیا تھا۔ جواب گھوں گھوں کر کے چل رہا تھا۔

اس کی گردش سے راحت سی محسوس ہو رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ لٹ خانہ چلا آیا۔ جہاں حسب معمول رونق تھی۔ غربت و افلاس کے مارے ہوئے انسان تاش اور لُڈو میں پانچ دس روپے جیت کر یوں چہکنے لگتے جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔ دور لیاقت ڈرائیور، صاحب کی گاڑی دھونے کے بعد پالش لگا رہا تھا۔ علم دین کو خیال آیا کہ وہ خود بھی تو ہر ہفتے اپنی سائیکل کی صفائی کرتا ہے۔ تیل دیتا ہے۔ ساری دنیا مشینوں کی غلام ہو کر رہ گئی ہے۔ لٹ خانے کی چارپائی پہ لیٹ کر وہ آنکھیں موندے سوچتا چلا گیا کہ اسی کمینہ صفت فیکس مشین کو حبیب نالے میں کیوں نہ پھینک آئے۔ جہاں بیہ ونچیوں کا بسیرا ہے۔ وہ خود ہی مشین کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس احساس طمانیت اور فتح مندی سے وہ سرشار سا ہو گیا۔ اس کو لگا وہ واقعی اشرف المخلوقات ہے۔

اور پھر رات گئے ڈاک کا تھیلا بغل میں دابے وہ چپکے سے کاؤنٹر میں داخل ہوا۔ دیوار پھاندنے اور لات مار کے بوسیدہ کھڑکی کا پٹ کھولنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی۔ ایئر کنڈیشن بند تھا۔ مشین بھی سوئی یا مری پڑی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دونوں تاریں کھینچ نکالیں اور مشین کو ڈاک کے تھیلے میں ڈال لیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ پیروں میں فٹ بال بنا لے۔ ٹھوکروں پر رکھ لے۔ مگر لوڈشیڈنگ کا فائدہ اٹھاتے گھر آ کے ہی دم لیا۔ ڈاک کا تھیلا اس نے چارپائی کے نیچے چھپا دیا۔ خود بھی اپنی اسی چارپائی پہ جا لیٹا۔ وہ دل ہی دل میں کھلا جا رہا تھا۔ موقع پاتے ہی وہ فیکس مشین کو حبیب نالے میں پھینک آئے گا۔ بیوی سے نہ رہا گیا۔

''بہت دنوں بعد تم خوش دکھائی دے رہے ہو کوئی اوور ٹائم ملا ہے۔''

علم دین ہنس دیا ''نہیں میں نے اپنے دشمن کا سر اُتار دیا ہے۔''

اس فتح مندی سے وہ مغلوب ہو رہا تھا۔ ٹھاٹھ سے فیکس کی لاش کے اوپر سویا رہا۔ مگر منہ اندھیرے پہلو میں کچوکے دے کے بیوی نے زبردستی جگایا۔

''دیکھو باہر کوئی مسلسل دروازہ پیٹے ہی چلا جا رہا ہے۔'' علم دین کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ''چھاپہ پڑ گیا۔'' ذہن میں ایک گونج ہوئی۔ مگر چار و ناچار باہر تو نکلنا ہی تھا۔ رمضان اور جمعہ چوکیدار کو دیکھ کر اس کے حواس بجا ہوئے۔

''کسی نے فیکس مشین چوری کر لی ہے، اب ہمارا کیا بنے گا۔'' دونوں روہانسے ہو رہے تھے۔ فرط خوف سے لرزاں تھے۔

''تو میں کیا کروں'' خوف دور ہوتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ ''میرا کیا تعلق ہے چوکیدار تو تم ہو۔''

''تمھارا تعلق تو ہے۔'' جمعہ نے فریاد کی تو علم دین کے ہاتھ پاؤں بے جان سے ہونے لگے۔ چہرے کا رنگ فق ہو گیا جو اندھیرے کے باعث دونوں چوکیداروں کو دکھائی نہ دیا۔ ''تم ہمارے صدر ہو۔ یونین ساتھ نہ دے تو ہم کہاں جائیں گے۔''

''وہ بڑی ہی نخرے باز مشین تھی، ایئر کنڈیشن کے بغیر کام ہی نہیں کرتی تھی۔ چلو جان چھوٹی۔''

رمضان مشین کی وکالت کرنے لگا ''ہمارے سارے حاکم بھی تو ایئر کنڈیشنڈ گھروں میں رہتے ہیں۔ ان کے دفتر بھی ایئر کنڈیشنڈ ہیں اور پھر یہ مشین جھوٹ بھی نہیں بولتی، رشوت نہیں لیتی، انسانوں کو غائب بھی نہیں کرتی اور بھتہ بھی نہیں لیتی۔''

علم دین پہ ایک نیا سورج طلوع ہوا۔ اس نے تو کبھی بھی اس پہلو پہ غور نہیں کیا تھا۔ وہ ہانپ سا گیا۔ اسی لیے لٹ خانہ چلا آیا کیونکہ دو کمرے کے کوارٹر میں جگہ کہاں تھی بٹھانے کی۔ بیوی کی متوحش آنکھوں نے مجبور کر دیا تھا کہ جاتے جاتے تسلّی دیتا جائے ''کچھ نہیں بس ان دونوں کا ذاتی مسئلہ ہے یونین کا صدر جو ہوں۔ مدد مانگنے آئے ہیں'' علم دین نے سینہ پھلا لیا۔ پوسٹل کالونی کے گیٹ پہ بھی ایک چوکیدار کہنے کو تو موجود ہی رہتا۔ حالانکہ وہ اخبار کے دفتر میں بطور چپراسی کام کرتا تھا۔ لیکن چوری کبھی نہیں ہوئی۔ لہٰذا لٹ خانہ کا سالخوردہ فرنیچر بھی کوئی ظریف چور یا اٹھائی گیرا غائب نہ کرتا۔ وہ تینوں بھی مدقوق کرسیوں پہ آبیٹھے۔

''کچھ کرو علم دین بھائی، دفتر کھلنے سے پہلے۔''

علم دین ٹھسک دکھانے لگا ''کیا کروں، میرے پاس الہ دین کا چراغ تو نہیں۔ سوچتا ہوں کچھ۔''

جمعہ نے بھی فریاد کی ''علم دین اب تو قمر دین کا ریز اور آداران سے خط فوراً پہنچ جاتا ہے۔ تفتان سے پانچ دنوں میں ڈاک آتی تھی۔ اب یوں چٹکی بجائے آجاتی ہے۔ کوئی کمبخت بیچ کھانا چاہتا ہے۔ ہماری روزی رساں کو۔''

علم دین نے آنکھیں دکھائیں ''ابے عقل کے اندھے مالک روزی رساں ہے۔'' رمضان نے گھبرا کے مداخلت کی مبادا علم دین بدک کر ساتھ دینے سے انکار ہی نہ کر دے ''بھیا! دیکھنے میں تو مشین ہی ملازمت دیتی ہے کار پہ ڈرائیور، فیکس پر بانو، ہر مشین ایک آدمی کو نوکری دیتی ہے۔''

صورت حال خاصی گمبھیر تھی۔ نائب صدر اور جنرل سیکرٹری کالونی سے باہر رہتے تھے۔ ورنہ دونوں ان کے دروازے پہ ہوتے۔ کالونی میں رہنے کے ا[illegible] فوائد ہیں۔ چوری کی بجلی، مفت کا پانی، مگر ایسے مر[illegible] بھی تو ہیں۔

علم دین نے سگریٹ سلگائی تو رمضان پھٹ پڑا ''ہماری نوکری چلی جائے گی۔ کوارٹر بھی ہم سے خ[illegible] کروالیں گے۔ ہماری جوان بیٹیاں ہیں۔ کہاں جائیں گے۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی تو نہیں۔''

علم دین کا دل پسیجا ''ارے چپ رہ، سوچنے دے۔'' ایک فیکس کی موت سے دو گھر اُجڑ جائیں گے۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔ مگر فیکس کا ظلم بھی تو ناقابل برداشت ہی ہے۔ علم دین کو سوچتے دیکھ کر دونوں پریشان حال قدرے مطمئن ہوئے۔ پرُامید نظریں اس کے چہرے پر جمائے رہے جو اندھیرے کے باعث غیر واضح تھا۔ ہیولا سا ہی دکھائی دے رہا تھا۔

''تم دونوں یہیں بیٹھو اور دعا کرو۔ میں اپنے مرشد کا وظیفہ جا کے پڑھتا ہوں۔ آدھ گھنٹے بعد لوٹوں گا۔ پھر چلیں گے۔ دیکھنا کہ جنات مشین وہیں رکھ جائیں گے۔''

ان پہ ایک ایک لمحہ بھاری تھا آدھ گھنٹا سے قبل ہی علم دین لوٹ آیا سانس چڑھا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں تسبیح تھی جس کے دانے گردش کر رہے تھے، بائیں ہاتھ کی انگشت ہونٹوں پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا، ساتھ ہی ہاتھ سے ڈاک خانے کی راہ دکھائی۔

چوکیداروں نے یکے بعد دیگرے دروازے کھولے اور کاؤنٹر ہال میں داخل ہوئے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ اندر لوڈشیڈنگ کا دورانیہ تھا۔ رمضان نے دیا سلائی جلائی اور اس کے ساتھ ہی وہ تینوں فرط مسرت سے سجدہ ریز ہو گئے۔ فیکس مشین حسب سابق بکنگ کاؤنٹر کی رونق بڑھا رہی تھی۔

OOO

بڑا آدمی

ایک بڑے ملک میں بسنے والے بڑے آدمی کی کتھا
دور دیس میں کوئی اس کا بہت شدت سے منتظر تھا

سجاد قادر

آنسو

پہلی مرتبہ ساون کی بارش کی طرح برس رہے تھے۔ زندگی میں کئی بار رونے کے مواقع آئے مگر رویا نہ گیا۔ بہت کوشش کی آنسو بہانے کی مگر نہ آئے، سُوں سُوں کرنے کی بھی کوشش کی مگر شرمندگی کا سامنا رہا۔ لیکن آج آنسو خود ہی تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ہماری زندگی میں بہت ساری چیزیں قیمتی ہوتی ہیں اور کچھ تو نایاب ہوتی ہیں مگر جب تک ہمارے پاس ہوتی ہیں تو ہم اُنھیں اہمیت نہیں دیتے اور جب ہم اُنھیں کھو دیتے ہیں تو زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔

آدھی رات کو کزن کا فون آیا کی تمھاری اماں شدید علالت کے بعد آج فوت ہوگئی ہیں اور جنازہ کل شام تک متوقع ہے۔ 30 سیکنڈ کی کال تھی، اور کوئی دو چار لفظوں پر مشتمل وہ جملے، مگر میری زندگی کا کلاک ہمیشہ کے لیے شاید رُک سا گیا تھا۔ کزن نے کال منقطع کردی مگر میری آنکھیں کھلی، لب سِلے ہوئے، سانس رُکا ہوا اور پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں خود کو زمین پر بوجھ تصور کر رہا تھا اور آج میرے ضمیر نے زندگی میں پہلی بار میری لگامیں کھینچی تھیں۔

میں آفس سے نکلا اور گاڑی اپنے گھر کی طرف دوڑا دی تاکہ جاتے وقت ضروری سامان ساتھ لے جاسکوں اس سے قبل ایک دوست کو فلائٹ کا پتا کرنے اور آج ہی کی تاریخ میں ٹکٹ بک کرانے کے لیے ائیر پورٹ روانہ کردیا تھا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے گاؤں کی بچپن کی زندگی سے لے کر آج لندن میں مرسڈیز پر گھومتے وقت تک کی کہانی ذہن میں چل رہی تھی اور میں وہ تمام واقعات یاد کر کے رو جا رہا تھا۔

میری اماں مجھ سے بہت پیار کرتی تھی، سب بھائیوں میں، میں ہی اماں کا لاڈلا بیٹا تھا۔ اماں شروع ہی سے کہتی تھی کہ میں اپنے اس بیٹے کو بڑا آدمی بنائوں گی۔ بچپن میں اماں مجھے خود اسکول چھوڑنے جاتی اور خود ہی واپس لاتی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد میری کاپیاں چیک کرتی اور مجھ سے پوچھتی کہ آج کیا پڑھا، کتاب کھول کے سناؤ۔ میں کہتا اماں! آپ تو اَن پڑھ ہو آپ کو کیسے پتا چلے گا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں مگر اماں پھر بھی ضد کر کے مجھ سے سبق سنتی تھی تاکہ میں کھیل کود میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنا سبق یاد کرسکوں۔

اماں مجھے کھانا بھی سب سے پہلے دیتی تھیں اور صبح کے وقت صرف مجھے ہی مکھن کی ڈلی ملتی تھی اور کسی کو نہیں، اور جس روز گوشت پکتا تو مجھے سب سے زیادہ اور اچھی بوٹیاں اماں دیتی تھی۔ میرے کپڑے بھی باقی بہن بھائیوں کی نسبت اُجلے اور صاف ستھرے ہوتے تھے۔ باقی بہن بھائی بھی اسکول جاتے تھے مگر اماں زیادہ محنت اور توجہ مجھ پر کرتی تھی کیونکہ بڑا آدمی مجھے نے جو بننا تھا۔

پانچویں پاس کرنے کے بعد اماں نے مجھے سائیکل لے کر دی کیونکہ میں پیدل اسکول جا کے تھک جاتا تھا۔ باقی بہن بھائی آہستہ آہستہ پڑھائی سے جان چھڑا رہے تھے۔ کسی کا پڑھائی کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا تو کسی کو اس نے روک لیا، واحد میں تھا جو بچا رہا۔ کیونکہ ہر مشکل

وقت میں اماں میری ڈھال بن جاتی تھی۔ سردیوں میں اماں مجھے اپنے پاس رضائی میں سُلاتی تھیں اور رات کو کئی بار اُٹھ کر چیک کرتی تھیں کہ کہیں میرے پاؤں یا ہاتھ رضائی سے باہر تو نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ سردیوں کی رات تھی۔ اماں کی آنکھ کھلی تو انھوں نے حسب معمول میری رضائی درست کی، جب میرے چہرے پر ہاتھ لگایا تو انھیں سانس گرم محسوس ہوئی، انھوں نے گردن، سینے، اسی طرح سارے جسم پر ہاتھ لگایا تو اُنھیں میرا جسم گرم محسوس ہوا۔ اماں نے اُسی وقت شور مچا دیا کہ میرے بیٹے کو بُخار ہوگیا ہے اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ ابا کو اُٹھایا کمبل مجھے اُوڑھایا اور ابا کو ساتھ لے کر چل پڑی، سردی بہت زیادہ تھی اور ڈاکٹر کا گھر بھی دوسری بستی میں کوئی 3، 4 میل کے فاصلے پر تھا۔ اماں وہاں ڈاکٹر کے پاس اُسی وقت گئی اور میری دوائی لے کر آئی۔

اسی طرح کئی بار اگر میں رات کو سونے سے پہلے اماں کو کہہ دیتا کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے تو وہ میرا سر گود میں رکھ لیتی تھی اور جب تک میں سو نہیں جاتا تھا تب تک میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہتی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اماں کب سوتی تھیں، میری تو رات کو جب جب آنکھ کھلتی تھی اماں جاگ رہی ہوتی تھیں اور میری آنکھ کھلتے ہی پوچھتی تھیں بیٹا کیا چاہیے، پیاس لگی ہے؟ پانی پینا ہے کیا؟

ہمارے گاؤں میں صرف نمبردار کے گھر میں ٹی وی تھا۔ جب کبھی میں ضد کرتا تو اماں مجھے وہاں ٹی وی دکھانے کے لیے لے جاتی تھیں۔ ٹی وی میں بڑی بڑی گاڑیاں اور بڑے بڑے گھر دیکھتی تو اماں کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ وہ پوری بستی میں ہر عورت سے اور ہر چھوٹے بڑے سے یہی کہتی پھرتی تھیں کہ میرا بیٹا ایک دن پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بنے گا اور اُس کے پاس بڑی گاڑی اور بڑا گھر ہوگا۔

جتنا بڑا گھر اس بستی میں میرے بیٹے کا ہوگا اتنا تو نمبردار کا گھر بھی نہیں ہوگا۔ اور میرے بیٹے کی گاڑی اتنی بڑی ہوگی کہ سبھی گاؤں والے غور سے دیکھیں گے۔ گاؤں والے کبھی تو اماں کی باتیں توجہ سے سنتے اور کبھی کہتے کہ اتنی بڑی گاڑیاں اور اتنے بڑے گھر صرف ٹی وی میں ہوتے ہیں، ہماری بستی میں نہیں آسکتے۔ لیکن میری اماں نے کبھی اپنی اُمیدوں اور خوابوں کو گہن نہیں لگنے دیا تھا۔

میٹرک کر کے کالج میں آگیا اور بی۔اے کر کے یونیورسٹی۔ کالج کی فیس تو جیسے تیسے دے دی جاتی تھی مگر یونیورسٹی میں اخراجات کافی زیادہ تھے۔ میں نے اماں سے کہا تھا کہ اگر مجھے بڑا آدمی بنانا ہے تو مجھے یونیورسٹی میں ضرور پڑھاؤ۔ وگرنہ میں بڑا آدمی نہیں بن سکوں گا۔

اماں نے پوچھا تھا کہ کتنے پیسے ہیں یونیورسٹی میں داخلے کے، تو میں نے جو رقم اُس وقت بتائی تھی وہ کافی زیادہ تھی۔ مگر اماں نے کہا کہ بیٹا آپ داخلہ لو، میں پیسوں کا بندوبست کردوں گی اور ایک دن اماں نے میری بڑی بہن کے زیور بیچ کے مجھے پیسے لا دیے کہ جاؤ اور جا کے یونیورسٹی میں پڑھو تاکہ بڑے آدمی بن سکو۔ جب جب اماں مجھے پیسے دیتی تھیں تو اماں کی آنکھوں میں چمک آجاتی تھی اور اُن کی خوشی بھی دیدنی ہوتی تھی۔ اماں مجھ سے پوچھا کرتی تھی کہ بیٹا کتنا پڑھ

لیا ہے؟ میں کہتا اماں بی۔اے ہوگیا ہے وہ پھر پوچھتی وہ کتنا ہوتا ہے؟ میں کہتا اماں چودہ کلاسیں پڑھ لی ہیں۔ اماں کو پھر بھی سمجھ نہ آتی تو وہ آخر میں پوچھتی کہ اتنا پڑھ لیا ہے کہ تم بڑے آدمی بن جاؤ؟ تب میں کہتا نہیں اماں اُس کے لیے تو ابھی اور پڑھنا پڑے گا۔اماں کہتی ٹھیک ہے جتنا پڑھنا ہے پڑھو لیکن تم نے بڑا آدمی ضرور بننا ہے۔

ایک دن یونیورسٹی کی تعلیم بھی مکمل ہوگئی اور ہم بوریا بستر باندھ کر گھر پہنچ گئے تو اماں نے پوچھا بیٹا پڑھائی مکمل ہوگئی؟

میں نے کہا جی اماں۔

اماں نے پوچھا کتنا پڑھ لیا ہے۔ میں نے بتایا کہ اماں میں نے ایم۔اے کرلیا ہے۔

اماں نے خوش ہوکے پوچھا تھا کہ وہ کتنا ہوتا ہے؟ میں نے بتایا کہ اماں سولہ کلاسیں پڑھ لی ہیں۔

اماں نے پھر ایک بچے کی طرح پوچھا تھا کہ بیٹا! اتنا پڑھ کے تم بڑے آدمی تو بن جاؤ گے نا! میں نے کہا تھا۔ جی اماں! مگر اُس کے لیے مجھے شہر جانا پڑے گا وہاں ملازمت کرنا ہوگی اور پھر میں بڑا آدمی بن جاؤں گا۔اماں نے کہا تھا بیٹا پہلے بھی تم اتنا عرصہ مجھ سے دور رہ کر آئے ہو، اب پھر مجھ سے دور جارہے ہو۔ میں تمھیں بڑا آدمی ضرور بنانا چاہتی ہوں مگر خود سے دور کبھی نہیں کرنا چاہتی۔

میں نے بڑے پیار سے کہا تھا اماں! میں ہمیشہ کے لیے تھوڑی آپ سے دور جارہا ہوں، ہر مہینے آپ سے ملنے آجایا کروں گا۔ مگر اماں پھر بھی مجھے شہر بھیجتے ہوئے ڈر رہی تھیں۔ جب اماں راضی ہونے میں دیر کر رہی تھیں تو ابا نے مداخلت کرکے کہا تھا کہ اس سرکار نے سانڈ کو گھر بٹھا کر کیا کرنا ہے۔ ہمارے تو اب کسی کام کا نہیں، جانے دو اب جہاں جانا چاہتا ہے۔ ہم بھی تو دیکھیں ذرا کہ کتنا بڑا آدمی بن جائے گا؟

خیر روتے دھوتے اماں نے شہر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ شہر آکے ہمیں ایک مناسب سی ملازمت بھی مل گئی۔ مہینے کے آخر میں تنخواہ لے کر میں خریداری کرنے گیا اور اماں کے لیے بھی ایک کپڑوں کا جوڑا اور جوتا خریدا۔ جب میری بس گاؤں جا کر رُکی تو اماں سڑک کنارے کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ انتظار تو وہ پہلے بھی میرے آنے کا کرتی تھی۔ مگر آج وہ بستی سے اتنی دور پیدل چل کر سڑک پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور ہمیشہ کی طرح میرے ماتھے پر بوسہ دیا تھا اور میرے ہاتھوں میں چیزیں اور سامان دیکھ کر اماں کی آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں نے ایک خوب صورت سی چمک پیدا کردی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی تھی کہ اماں آج اتنی دور سڑک پر آکر بے چینی سے میرا انتظار کیوں کر رہی تھی۔ جب میں یونیورسٹی ہوتا تھا اُس وقت بھی تو میں مہینے کے بعد ہی گھر آتا تھا۔ تب بھی اماں میرا انتظار کرتی تھی مگر کبھی سڑک تک نہیں آئی تھی۔ آدھی رات کو جب سارے سوگئے، تو اماں میرے پاس آئی میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھے پیار کیا اور پھر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا اماں کیا وجہ تھی میری یاد بہت زیادہ آرہی تھی جو آپ اتنا دور سڑک پر آکر میرا انتظار کر رہی تھی۔ اماں نے کہا تھا جی بیٹا آپ کو خود سے دور نہیں دیکھ سکتی، آپ میں تو میری جان ہے، میں نے

اپنی ساری اُمیدیں صرف آپ ہی سے تو لگا رکھی ہیں۔ میں نے کہا اماں اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟ اماں نے پوچھا تھا بیٹا تم بڑے آدمی بن گئے ہوتا میں نے کہا جی اماں بن گیا ہوں۔ اب میں بھی شہر میں پینٹ شرٹ پہنتا ہوں، باقاعدہ ٹائی لگاتا ہوں اور میرے آفس میں شیشے والی ٹیبل ہے اور میری کرسی بھی گول گول گھومتی ہے۔

اماں نے کہا تھا جی بیٹا، وہ تو سب ٹھیک ہے مگر تمھارے پاس گاڑی تو نہیں ہے۔ بڑا آدمی تو وہ ہوتا ہے جس کے پاس بڑی گاڑی ہوتی ہے اور میں اس لیے سڑک پر گئی تھی کہ تم گاڑی میں آرہے ہو اور میں تمھارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر واپس بستی آؤں گی، تو سارے دیکھتے رہ جائیں گے۔

میں نے کہا تھا، اماں! گاڑی کو ابھی دیر ہے وہ بھی آجائے گی تھوڑا صبر کرو۔ اماں پھر اپنی آنکھوں میں سجنے سجائے خاموش ہوکے میرے ساتھ سو گئی تھیں۔

وقت گزرتے دیر نہ لگی، دنوں کے مہینے، مہینوں کے سال اور پھر سالہا سال زندگی کی گھڑی نے جیسے رفتار پکڑلی، ہم نے آگے کی طرف اور اماں نے پیچھے کی طرف۔ اماں روز بہ روز بوڑھی ہوتی گئیں اور بیمار بھی اور ہم اپنی روز مرہ زندگی میں مصروف ہوتے چلے گئے۔ پہلے کبھی کبھار اماں کو ملنے چلے جاتے تھی۔ مگر مصروفیات بڑھ گئیں تو ہم بھی فون پر ہی اماں کا حال چال پوچھ لیا کرتے تھے۔ اماں شروع میں تو گاؤں آنے کے لیے کہتی تھیں، پھر آہستہ آہستہ خاموش ہوتی گئیں۔ ہم بھی اماں سے بات کرکے بور ہوجاتے تھے کیونکہ وہ جب بھی فون پر بات کرتی تھیں تو کہتی تھیں بیٹا بڑے آدمی بن گئے ہو بیٹا گاڑی مل گئی ہے؟ ہمیں چونکہ ان باتوں سے اب کوفت ہونے لگی تھی اس لیے جان چھڑانے والی بات کرتے تھے۔

جب سے اماں بیمار ہوئی تھیں، ہمیں لگتا تھا کہ وہ چڑچڑی بھی ہوگئی تھیں۔ اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی باتیں وہی مگر آواز نحیف ہوتی چلی گئی جبکہ ہماری آواز میں رُعب اور بڑا پن آتا گیا۔

ایک دن ہمیں غیر ملکی کمپنی میں ملازمت کی پیشکش ہوئی اور ملازمت کی جگہ لندن میں تھی۔ ہم نے گھر والوں کو بتایا جس میں اماں بھی شامل تھیں کہ ہم ملک سے باہر جانا چاہتے ہیں۔ اماں نے کہا تھا بیٹا میں تو مر جاؤں گی۔ اتنا دور بھیجنے کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، بیٹا تم گاؤں واپس آجاؤ۔

داناؤں کی باتیں

☆.....بہترین زہد، زہد کا مخفی رکھنا ہے

☆.....دو باتیں عقل کو حیران کرتی ہیں۔ بولنے کے وقت خاموشی اور خاموشی کے وقت بولنا۔

☆.....جب آپ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں، تو آپ کو شمالی ستارے کی طرح بن جانا چاہیے۔ یہ ستارہ ہمیشہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے، حرکت نہیں کرتا اور دوسرے ستارے اس کے گرد جھرمٹ ڈال دیتے ہیں۔

☆.....انسان کا جنم ہوتے ہی بڑھاپا اور موت اس کے ساتھ ہولیتے ہیں۔

☆.....مرض میں جب تک ہمت ساتھ دے، چلتے پھرتے رہو۔

(مرسلہ: فہد چوہدری، اولڈ سول لائن، ساہیوال)

میں نے کہا تھا اماں وہاں جا کے بڑی گاڑی اور بڑا گھر بھی ملے گا جو تم چاہتی تھی۔ اماں نے بڑی نفرت اور کراہت سے کہا تھا، بیٹا! مجھے گاڑی نہیں چاہیے، بس تم میرے پاس آجاؤ، مجھے تمھاری یاد آتی ہے۔ ہم نے چکڑی چپٹی باتوں سے اماں کو پھسلانا چاہا مگر اماں نے رضامندی ظاہر نہ کی۔

ہم تو چونکہ باہر جانے کا مصمم ارادہ کر ہی چکے تھے، اس لیے اماں کو بتائے بغیر بس بڑے بھائی اور ابا کو اپنے ارادے سے مطلع کیا اور لندن آ سدھارے۔ یہاں آ کے ہم واقعی بڑے آدمی بن گئے، سُوٹڈ بُوٹڈ ہوگئے، نوکر چاکر آگئے، بڑی گاڑی، بڑا بنگلہ، سب عیش وعشرت میسر ہوگئی مگر بستی کے وہ ٹیڑھے میڑھے راستے اور وہ سڑک کبھی یاد نہ آئی جہاں پر اماں ہمارا انتظار کرتی تھی۔ اماں کو جب پتا چلا کہ ہم ملک سے باہر چلے گئے ہیں تو اماں نے چارپائی کو اپنا ساتھی بنالیا اور بیماری سے دوستی کرلی۔ پھر نہ کبھی اماں تندرست ہوئی اور نہ چارپائی سے اُٹھ پائی۔ اُسی چارپائی کے ساتھ اپنی پیٹھ رگڑتے رگڑتے جان ہار گئیں اور وہی چارپائی اُنھیں قبر تک لے کر گئی۔

لندن سے جب کبھی میں گھر بات کیا کرتا تو اماں ایک ہی بات دُہرایا کرتی تھی بیٹا کب آرہے ہو۔ مجھے تمھاری یاد آرہی ہے۔ جب کہ میں اُن کا دِل بہلانے کے لیے بار بار بتایا کرتا کہ اماں اب میں بڑا آدمی بن گیا ہوں، میرے پاس بڑی گاڑی بھی ہے۔ اب میں بڑی گاڑی پر ہی گھر آؤں گا۔ مگر اب اماں کبھی گاڑی کا یا گھر کا نہیں پوچھا کرتی تھیں۔ بلکہ ایک ہی بات پر زور تھا کہ گھر آجاؤ، گھر آجاؤ۔

پچھلے چند مہینوں سے تو اماں نے باقاعدہ مجھے بُ بلانے کی ایک مہم شروع کردی تھی اور جب بھی فون بات ہوتی تو ایک ہی جملہ بار بار کہتی تھیں، بیٹا میرا پتا کہ کب مرجاؤں ایک دفعہ آکے مجھے اپنی شکل جاؤ پھر بے شک چلے جانا اور میں اُن کی بات ٹال کرتا، نہیں اماں! اللہ نہ کرے ایسا ہو، آپ اِتنا جلد مرنے والی نہیں ہو، میں جب گھر آؤں گا تو بڑے ہسپتال میں اور بڑے ڈاکٹر سے آپ کا علاج کراؤں گا۔ آپ ٹھیک ہوجاؤ گی۔ مگر اماں تو نہ جانے کہاں آس لگائے بیٹھی تھی۔

آخری بار جب اماں سے فون پر بات ہوئی تھی اماں نے بڑی لجاحت سے کہا تھا ''بیٹا! تم بہت مصروف ہوگئے ہو مجھے نہیں پتا تھا کہ جب بیٹے بڑے آدمی بن جاتے ہیں تو اپنی ماؤں کو بھول جاتے ہیں۔ ہوسکے تو مرنے سے پہلے مجھے اپنی شکل ضرور دِکھا جانا نہیں تو میرے جنازے کو کاندھا ہی دینے آجانا، میری آنکھیں اور روح تیری راہ دیکھتی ہوں گی۔''

میں گاڑی سے اُتر کے اپنے کمرے میں پہنچا تو کہ دوست کی کال آئی۔ ''بھائی اگلے دو دن تک پاکستان جانے کے لیے سیٹ نہیں مل سکتی، تیسرے دن کی سیٹ ہے، کہو تو بک کروالوں۔''

آنسو میری آنکھوں سے بہ نکلے تھے اور دل جیسے سینے سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے ہاں کہہ کے کال ڈراپ کردی اور فرش پہ بیٹھ کے زاروقطار رونے لگا تھا کہ جس ماں نے ساری زندگی صرف میری طرف دیکھا تھا آج اُس ماں کا آخری وقت آیا تو مجھے اُس کی ایک جھلک بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی تھی۔

یو-ڈیم-سالا

ایک بڑے شہر میں آباد ہونے کے خواہاں دو اجنبیوں کا قصہ
پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے دو مشترک غم ڈھونڈ لیے تھے

نعیم بیگ

پام ڈیرہ بیچ کورنش پر شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ایک ہجوم کورنش کی دیوار کے ساتھ ساتھ چہل قدمی میں مصروف تھا۔ سورج دور سمندر کے اس پار ٹھہرے ہوئے پانی کے اندر آہستہ آہستہ آسمان کی وسعتوں پر نارنجی رنگ بکھیرتا ہوا غروب ہورہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بادل ٹکڑیوں کی صورت میں قطار در قطار تیرتے ہوئے مشرق کی جانب سفر کررہے تھے۔

کورنش کی تین فٹ اونچی اور کافی چوڑی دیوار پر بیٹھا ایک نوجوان اپنے سامنے اخبار کے چند صفحات پھیلائے پڑھنے میں مصروف تھا۔ پچھلے دو دن سے تو میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا یہ معمول تھا۔ وہ شام ہونے سے پہلے اخبارات کا

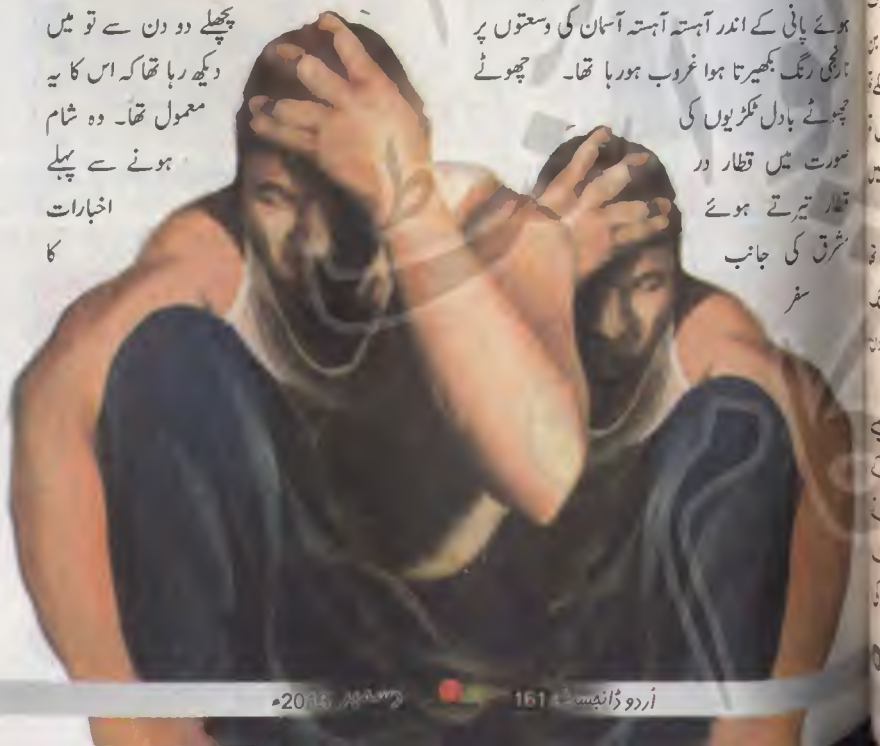

ایک پلندہ اُٹھائے کورنش پر آجاتا۔ پہلے وہ چند منٹ آہستہ آہستہ واک کرتا اور پھر برسک واک کرتے ہوئے کورنش کے دونوں طرف گھوم کر اپنی مخصوص جگہ پر آکر بیٹھ جاتا اور اخبار کا مطالعہ کرتا۔ بظاہر شکل سے وہ انڈین لگتا تھا۔

پام ڈیرہ دبئی کے مشہور تجارتی علاقے ڈیرہ میں واقع ہے۔

ایک طرف آسمان سے باتیں کرتیں بلند و بالا عمارتیں جن میں سب سے بڑی عمارت حیات ریجنسی نامی مشہور ہوٹل ہے۔ دوسری طرف سامنے نائف کا بازار اور تجارتی مرکز۔ لہٰذا بیچ کورنش پر شام ہوتے ہی سیکڑوں رہائشی اور نوجوان سیاح آجاتے۔ دوپہر کو البتہ گرمی ہونے کی وجہ سے یہ جگہ تقریباً سنسان ہی رہتی۔

آج جب میں نے اس نوجوان کو دوبارہ دیکھا تو میرے اندر تجسس نے انگڑائی لی اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

''آپ کے پاس ماچس ہوگی؟'' میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور انکار کرتے ہوئے سر ہلا دیا اور دوبارہ اخبار میں منہمک ہوگیا۔ میرا تجسس اور بڑھ گیا اور میں اچھل کر اس کے پاس ہی دیوار پر بیٹھ گیا۔

میں ابھی اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ کس طرح اس سے بات کی جائے کہ واک کرتے ہوئے قدرے ادھیڑ عمر کے ایک شخص نے اسے چلتے چلتے مخاطب کیا:

''ہیلو اشوک۔''

نوجوان نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا اور جواباً ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''سی یو، ٹو مارو۔'' یہ کہتا ہوا وہ شخص آگے نکل گیا۔

یوں تو میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ وہ انڈین نکلا۔ میں نے دل میں سوچا یوں تو دبئی جیسے شہر میں ذات پات، برادری، رنگ و نسل، مذہب اور کسی بھی ملک کا شہری ہونا کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے۔ یہاں صرف دو طبقات ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی یعنی تارکینِ وطن۔ ملکی مالک و آقا ہیں اور تارکین وطن چاہے کسی بھی ملک سے ہوں ورکر ہیں۔

یہ سوچ کر اشوک مجھے کچھ اپنا اپنا سا لگا اور میں نے اپنی ہچکچاہٹ دور کرتے ہوئے خود ہی اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

''اچھا تو تمھارا نام اشوک ہے۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟''

اشوک نے میری طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ میں بات کرنے کے لیے ابتدا کر رہا ہوں۔ لہٰذا اس نے اخبار ایک طرف کھسکایا اور انگریزی میں بولا:

''یس آئی ایم اشوک۔ اشوک شری واستری پٹیل، اینڈ آئی ایم فرام گجرات انڈیا۔'' اعتماد اس کے لہجے میں نمایاں تھا۔ ''آئی ایم سوری، بٹ مجھ کو اردو نہیں آتا۔''

''ڈو یو سپیک انگلش'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں تھوڑی بہت انگریزی تو

سبھی بول لیتے ہیں حالانکہ مجھ جیسے گریجوایٹ کو تو انگریزی فرفر آنی چاہیے۔ لیکن ہمارے ہاں ایسا ماحول نہیں ہے۔ لہٰذا میں بھی بس ٹوٹی پھوٹی انگریزی ہی بول سکتا ہوں۔

چونکہ مجھے بات کرنی تھی لہٰذا میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی ہی کا سہارا لیا۔

''یس آئی سپیک انگلش بٹ ویری لٹل۔''

اشوک میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا ''نو پرابلم چلے گا۔''

''تم کدھر کا ہے؟''

''میں پاکستان سے ہوں'' میرا لہجہ قدرے مایوسانہ سا تھا۔

''وچ سٹی؟''

''کالا پل کلوز ٹو لاہور۔''

''اوہ یو آر فرام پنجاب۔ آئی لو پنجاب''

''یس، یس'' میں نے فوراً اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی اشوک نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف مصافحہ کے لیے بڑھایا اور بولا ''ویری نائس ٹو سی یو مائی فرینڈ.....''

سے میرا نام جاننے کے لیے خاموش ہونا پڑا۔''

''میرا نام..... اوہ سوری مائی نیم از منظور علی'' اور میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اس کے مصافحہ میں گرم جوشی کا ایک طوفان سا محسوس کیا اور سچ پوچھیے تو میرے اندر بھی کچھ ایسے ہی جذبات تھے۔ میں کافی دنوں سے دبئی میں رہ رہا تھا لیکن کسی اچھے انسان کی دوستی سے محروم ہی تھا۔

پچھلے چند دنوں سے نوکری کی تلاش نے مجھے تقریباً ادھ موا ہی کر دیا تھا۔ لیکن میں بھی ہمت ہارنے والے انسانوں میں سے نہ تھا لہٰذا کوشش جاری تھی۔ وہ الگ بات کہ نوکری کی اُمید اب دن بدن مدھم ہوتی جارہی تھی۔

''تم کیا کرتا ہے؟''

اشوک کے سوال پر میں خیالوں سے نکل آیا۔ میں نے ہچکچاہٹ سے ایک سگریٹ نکالی اور ماچس کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''بھائی صاحب، ماچس ہوگی؟'' میں نے گزرتے ہوئے ایک شخص کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا تھا۔ وہ شخص رکا اور مجھے سلگانے کے لیے اپنی سگریٹ پیش کردی۔ میں نے اپنی سگریٹ سلگائی اور اسے شکریہ کہا اور دوبارہ اشوک کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ابھی تک کچھ نہیں'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔''

''اوہ ویری بیڈ، بٹ نو پرابلم'' دونوں ایک ساتھ ڈھونڈ لے گا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ اخبار کا مطالعہ اتنی باقاعدگی سے کیوں کرتا ہے۔

''اپنا سٹوری بولو؟''

لمحے بھر کے لیے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر ایک چھماکا سا ہوا۔

''میری سٹوری کچھ خاص نہیں۔ لاہور کے نزدیک کالا پل ہمارا گاؤں ہے۔ ماں باپ دونوں بوڑھے

ہو چکے ہیں۔ ماں بیمار رہتی ہے۔ ایک بہن اور چھوٹا بھائی۔ میں سب سے بڑا ہوں۔ شروع میں باپ کے ساتھ کھیتی باڑی کی، پھر منڈی کا کام، پھر لاہور سے گریجوایشن کی اور دو سال نوکری ڈھونڈتا رہا۔ گزارہ تو چلتا تھا لیکن مستقبل نہ تھا۔ ایک دوست کے مشورے پر یہاں چلا آیا۔ باپ نے بیل کی جوڑی بیچ دی اور پیسے دیے۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر یہاں معاملہ نہ بنا تو آگے کیا ہوگا؟''

''بس اپنی تو یہی کہانی ہے۔ فصل کی بوائی کے دن آنے والے ہیں۔ بیل نہ ہوئے تو ابا کھیت کیسے بوئیں گے۔ فی الحال تو یہی فکر ہے۔''

''سیم ڈیم سٹوری'' اشوک نے قدرے منہ بنا کر کہا۔

''تم بولو تمھاری کیا کہانی ہے؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''سورت معلوم ہے؟''

''سورت؟'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''اوکے۔ آئی ٹیل یو''

''گجرات میں سورت کے نام کا ایک بڑا شہر ہے۔ احمد آباد کے قریب ہے۔

زیادہ تر کاروباری لوگ رہتا ہے۔ ہم لوگ بھی ادھر رہتا ہے۔''

''مائی فادر ٹیلر ماسٹر ہے اینڈ آئی ہیٹ دِس جاب''

''سو آئی ٹولڈ مائی فادر۔ آئی ول ناٹ ورک ایز ٹیلر۔ آئی ڈڈ مائی ماسٹر فرام احمد آباد۔ بٹ یو نو اِن انڈیا نو جاب ایٹ آل۔ پھر مدر بولا، آئی گو یو (Give you) مائی جیولری، یو گو ٹو دبئی۔ پھر ہم یہاں آ گیا۔''

''تو پھر اب گزارہ کیسے کرتے ہو'' میں نے پوچھا۔

''ایک دوست کو بیڈ سپیس کا پیسہ دیا۔ فار ٹو منتھ۔ ادھر رہتا ہے۔ شام کو ایک ہوٹل والے سے بات کیا ہے، ادھر نائف میں۔ اب رات کو دس بجے اس کے پاس جائے گا۔ اس کے ہوٹل کا سارا برتن دھوئے گا پھر وہ رات کا کھانا دے گا اور صبح کا ناشتا۔ بس ابھی تک ایسے ہی گزارہ کرتا ہے۔''

''تو سارا دن کیا کرتے ہو؟'' میں نے رنجیدگی سے پوچھا۔

''بس جاب کا تلاش۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ شام کو کورنش پر آجاتا ہے۔ گلف نیوز میں جاب تلاش کرتا ہے اور اپنا بھوک اور پیاس کو رات تک روک کر رکھتا ہے۔''

''بس۔ اب ٹائم ہونے والا ہے، کچھ دیر میں جائے گا، کام کرے گا اور کھانا کھائے گا۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے کہا:

''کیا میں بھی تمھارے ساتھ چل سکتا ہوں؟ آئی ول شیئر یور ورک۔''

اشوک نے کچھ عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا:

''یو۔ ڈیم۔ سالا۔ کل رات سے بھوکا پیاسا ہے اور بولتا نہیں ہے۔''

اور آگے بڑھ کر اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

سلگن

پل پل سلگتی ایک بیسٹی کی اندوہ ناک کہانی
وہ جان گئی تھی کہ غصہ زیادہ ہو یا بے بسی
دونوں صورتوں میں یوں ہی سلگنا پڑتا ہے، جھلسنا پڑتا ہے

اختر عباس

ماسی بشیراں انڈا پھینٹ رہی ہے اور مجھے لگ رہا ہے اس برتن میں انڈا نہیں میرا وجود پھینٹا جا رہا ہے۔ غصہ زیادہ ہو یا بے بسی دونوں ہی صورتوں میں انسانی وجود اسی طرح پھینٹا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر پہلے میں نے گھر کے ملازموں میں تنخواہیں بانٹی ہیں۔ مہینے بھر کا سودا سلف لانے کے لیے پیسے دیے ہیں۔ دھوبی کا بل، دودھ والے کا حساب، اخبار والے کے پیسے..... سبھی ادا کر دیے ہیں۔ یہ سارا بوجھ اتار کے اصولی طور پر تو مجھے یوں شانت ہو جانا چاہیے تھا جیسے گرد بھرے پتوں سے لدے درخت کو بارش کی پہلی پھوار دھو ڈالتی ہے۔ ہلکا اور آسودہ کر دیتی ہے۔

مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ صرف ایک نگاہ نے سب کچھ زیر و زبر کر دیا ہے۔ میری اپنی ماں کی نگاہ نے یہ کام کیا ہے۔ سردیوں اور سرد ہواؤں کا سیدھا اثر نئی کونپلوں اور پھلدار پودوں کے پھلوں پر ہوتا ہے۔ ان پہ ایک نامہربان سرد رات بھی بہت بھاری پڑ جاتی ہے۔ پالے سے ساری نمو مار دیتی ہے۔ نئی بڑھوتری کے امکان مٹا دیتی ہے۔ یہ پالا مارے پودے پھر کبھی پھل نہیں دے پاتے۔ پروان کیا

پڑھتے، وہیں کچھو مچھو ہو جاتے ہیں۔

جیسے جیسے اسکول جانے کا وقت قریب آرہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کیا اس بھرے پُرے گھر پر اب کبھی بہار نہیں اُترے گی۔ کیا اب خزاں ہی یہاں مستقل بسیرا کرے گی اور ان سوکھے پتوں جیسے ناگوار رویوں کے ساتھ ہی جینا پڑے گا۔ میری ماں کی نگاہوں میں ناگواری ہمیشہ بوچھاڑ کی صورت رہتی ہے۔ وہ اپنے انتخاب اور حدف کو ڈھونڈتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ اتفاق کہیے یا سوئے اتفاق کہ میں جوان کی سب سے بڑی مداح اور حامی تھی اور ان کے ہر کام کی توجیح ڈھونڈا کرتی تھی۔ اب خود کو کتنی دیر سے سمجھا نہیں پا رہی۔ دکھ اور تکلیف سے اب میرا اپنا سانس پھول رہا ہے۔ آپ کو کیسے بتاؤں کہ میرے ماضی کے کتنے سال اس دکھ سے بھرے ہیں۔

تذکرہ نہ کیا جائے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ دکھ کا وہاں سے گزر ہی نہیں ہوا۔ یا کسی درد نے اس میں قیام نہیں کیا۔ میرا تو دل بھی اس دکھ سے لہولہان بھرا ہے۔ اسی دکھ میں صبح ہوتی ہے اور اسی میں شام۔ یہ ایسی قید ہے جس سے رہائی ممکن نہیں۔ اس کی اونچی دیواریں میری اپنی ہی ماں کی بنائی ہوئی ہیں۔ اس کی اتنی محنت کا حاصل یہ دیواریں میں کیونکر توڑ سکتی ہوں۔ پیارے ابو میں آپ کا کیا کروں؟ میں آپ کے اس آدھے اور پورے گھر کا کیا کروں جس میں جابجا مکڑی کے جالے لگے ہوئے ہیں۔

جب جب اسکول سے لوٹ کر آتی ہوں مجھے ان جالوں میں ایک بڑی سی مکڑی نظر آتی ہے۔ میں نے پہلی بار یہ جالا کب دیکھا، اب تو یاد بھی نہیں۔ ہاں وہ دن ضرور یاد ہے جب اپنے ابو کو ایک جالے کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ میرا کتنا جی چاہا تھا کہ بھاگ کر ان سے لپٹ جاؤں، ان کے سینے میں چھپ جاؤں، ان کے دکھ اور تکلیف کو چُن لوں اور رونے نہ دوں۔ پھر یہ سوچ کر رونے دیا کہ سنا ہے رونے سے اندر کا غبار دھل جاتا ہے۔ دل کو تھوڑا سکون آجاتا ہے۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ان کے پیچھے جا کھڑی ہوئی تھی۔ ممکن ہے یہ بہانہ ہو، میرا خیال ہو اور ابو کو دل سے پیار کرنے کی خواہش کبھی اتنی زور آور ہوئی ہی نہ ہو کہ اس پر عمل ہوتا۔

ابو کیا ہوا؟ میں نے بہت مان سے پوچھا تھا۔ انھوں نے میری طرف دیکھے بنا کہا۔ بچے! کچھ بھی تو نہیں۔ بس پڑھتے پڑھتے اس کا خیال آگیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اس میں لکھا تھا ''ان کی مثال مکڑی سی ہے۔ وہ بھی ایک طرح کا گھر بناتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ تمام گھروں میں مکڑی کا گھر ہی کمزور ہوتا ہے۔ یہ جس چیز کو خدا کے سوا پکارتے ہیں خواہ وہ کچھ ہی ہو۔ خدا اسے جانتا ہے۔'' سورۃ عنکبوت کی یہ آیت تھی جس نے انھیں اندر باہر سے دھواں دھواں کر دیا تھا۔ بولے ''وہ گھر جو میں نے تمھاری ماں کے لیے بنایا تھا وہ بھی تو اس جالے کی طرح بودا اور کمزور ثابت ہوا۔ بس اس میں ایک ہی تار باقی ہے، بچے! اور وہ ہو تم..... تم میرے یقین اور بے یقینی..... اُمید اور نا اُمیدی کے درمیان ایک تار عنکبوت بن کر اس لیے لٹکتی رہو گی کہ تم سے ابو نے پیار کیا ہے۔''

''پاپا پلیز!'' میں زور سے بڑبڑائی تھی۔

''جی بی بی جی!'' ماسی بشیراں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ وہ جانے کب سے ناشتا لیے میرے سامنے کھڑی تھی۔ بی بی جی آپ کا ناشتا کہاں رکھوں۔ اسکول سے دیر ہو رہی ہے آپ کو۔ وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بول رہی تھی۔ بڑی بی بی کو کمرے میں

ی ناشتا کروادیا ہے جی!

"بہور حکم!"

میں ناشتا کیے بغیر ہی اسکول آگئی ہوں۔ یہ سٹی اسکول کئی سالوں سے میری زندگی میں ہے۔ بے شک شہر کے مہنگے اسکولوں میں سے ایک ہے، مگر مجال ہے ں کی آبادی میں کبھی کمی ہوئی ہو۔ میں عام طور پر جلدی اسکول آنے کی عادی ہوں۔ پہلے اس لیے کہ مجھے کسی کی ڈانٹ نہ سننی پڑے اور اب اس لیے کہ مجھے کسی کو ڈانٹنا نہ پڑے۔ آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ پہلے میں یہاں پڑھا کرتی تھی۔ اب پڑھنے والوں کو سنبھالتی ہوں۔ ان کو سنبھالنے سے فرصت ملے، تو پڑھا بھی دیتی ہوں۔ میری کلاس کے اکثر بچے بڑے عجیب ہیں۔ ان کا گھر جانے کو دل ہی نہیں کرتا۔ کلاس ختم ہوجائے تو بیٹھے لگتے ہیں۔ کھیلنے کو منع کریں تو کسی کونے میں آنکھیں موندے اور اونگھتے نظر آئیں گے۔

وہ گھروں کو جائیں بھی تو کیسے۔ ان کو لانے لے جانے والی ویگنیں تو ہیں نہیں کہ وقت پر آجائیں۔ یہ بڑے گھروں کے بچے ہیں۔ ان کو پک کرنے والے بھی بڑے لوگ ہیں۔ کبھی کسی کی مما آتی ہیں تو کبھی کسی کے پاپا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ دونوں ہی ایک دوسرے کی ذمہ داری سمجھ کر اسکول آنا ہی بھول گئے اور بچوں کو رخصت کرنے کی ڈیوٹی کی وجہ سے مجھے کئی کئی گھنٹے ان کے انتظار میں سلگنا پڑا۔

یہ سلگن بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ ایک ٹھنڈی بھی ہوتی ہے، بس رُلا دیتی ہے۔ ایک کڑوی کسیلی سی، سلگا دیتی ہے، اندر سے دہکا دیتی ہے۔ ایک ایسی بھی ہوتی ہے جو لمحوں میں جھلسا دیتی ہے، سلگا دیتی ہے۔ سلگن کوئی بھی ہو اور کیسی بھی ہو نہ من کو راحت دیتی ہے نہ تن کو۔ بس سلگائے جاتی ہے۔ آنسو چھلکائے جاتی ہے جھلسائے جاتی ہے۔

وہ ایک جھلسی ہوئی دوپہر تھی۔ جب سالوں پہلے ایک کالے کوٹ والے صاحب ہمارے گھر آئے۔ یہ کئی مہینوں بعد ہوا تھا کہ کسی مہمان نے ہمارے گھر کی بیل بجائی ہو۔ ابو کے مہمان اس لیے نہیں آسکتے تھے کہ امی انھیں ہی نہیں ان کے مہمانوں کو بھی بہت گھٹیا اور گنوار سمجھا کرتی تھی۔ مسکرا کے ملنا تو درکنار وہ پاس سے گزر بھی جائیں تو آنے والے کو اپنے کانوں کی فکر پڑ جاتی جو ان کے آتے جاتے کہے جملوں کے باعث کبھی سرخ ہوتے اور کبھی گرم۔ امی کے مہمانوں کو یہ گھر اپنے گھروں سے چھوٹا، اس کا آرام اپنے گھروں سے تھوڑا اور اس کے باسی اپنے لوگوں سے چھوٹے لگتے تھے۔ ایسے میں امی کی زبان بہت کاٹ دار ہوگئی تھی۔

"دو دو ٹکے کے کالے کوٹ پہن کر آجاتے ہیں ملنے! میرے والد تو اپنے نوکروں کو بھی ایسے ردی کوٹ پہننے کو نہ دیتے۔" دروازہ کھولنے سے پہلے یہ ارشادات مہمان کے کانوں تک پہنچ چکے تھے۔ دروازہ کھلا تو ایک مسکراتا ہوا چہرا طلوع ہوا۔

"میڈم! یہ میرا پروفیشنل کوٹ ہے۔ پانچ ہزار روپے میں اسے H.Karim Bukhsh سے خریدا تھا۔ آپ کہیں تو رسید پیش کردوں۔ آج تک فائل میں لگی ہوئی ہے۔" امی نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ گھورا تھا۔ کسی نے ان کی بات کا اس قدر برمحل اور برموقع جواب کب دیا ہوگا۔

"کون ہو تم.....؟" امی نے بڑے تکبر اور بدتمیزی سے سوال کیا تھا۔ "خاتون! میں عمر، تجربے اور رتبے میں آپ سے بڑا ہوں۔ یہ طرز گفتگو مناسب

نہیں۔ کاش آپ نے کسی پڑھے لکھے اور مہذب خاندان میں آنکھ کھولی ہوتی تو آپ کی زبان میں کسی قدر نرمی اور زندگی میں راحت ہوتی۔'' یہ سن کر میری والدہ نے ترنت جواب دیا تھا۔

''میرے والد اس شہر کے بڑے رؤسا میں سے ہیں کسی بھول میں مت رہیے۔ آپ جیسے کئی دو دو کوڑی کے وکیل ان کے ذاتی ملازم ہیں۔ جسے آپ ملنے آئے ہیں اس کو پہلی ملازمت میرے والد نے ایک سیمنٹ فیکٹری میں لے کر دی تھی تب اس ٹٹ پونجیے کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ آج بڑا بنا پھرتا ہے۔ دانش ور۔ وہاں رہتا تو آج جنرل منیجر ہوتا۔ ممکن ہے میرے والد اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے۔''

''ثمن بی بی! میرا خیال تھا کہ تکبر حماقت ہی کی ایک قسم ہے مگر آج پتا چلا اگر دونوں مل جائیں تو ان کا جادو دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہ زبان سے فوارے کی طرح پھوٹتا ہے۔ بوند بوند نہیں گرتا۔ چھینٹے اُڑاتا ہے۔ پنچ پنچ کر متکبر کو گراتا ہے اور گرائے چلا جاتا ہے۔ بڑی ہمت ہے عبدالقدیر صاحب کی۔ آپ جیسی خاتون کے ساتھ اتنے سال رہ لیا۔

آج بھی وہ مجھے منع کرتے ہی رہ گئے کہ خود مت جائیے۔ ڈاک سے بھجوا دیں یا کسی ہرکارے کے ہاتھ۔ مگر میں نے سوچا چل کر بات کرتا ہوں۔ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔ پر آپ دوسروں کو زخم دے کر اپنی انا کو خوراک دیتی ہیں۔ آپ کو کوئی کیا سمجھائے۔''

میں صوفے پر ہاتھ رکھے یہ سب سن رہی تھی۔ میرا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ کسی ڈر اور خوف سے نہیں۔ صدمے سے، بے بسی سے، ایک دو بار میری سہیلیاں آئی تھیں۔ مما نے انھیں کھلانے پلانے اور حال احوال پوچھنے کے بجائے اپنا اور اپنے خاندان کی امارت کا اس قدر تذکرہ کیا کہ میری دوستیں بے مزہ ہو کر اُٹھ گئیں۔ پھر کبھی میرے گھر نہ آنے کے لیے۔

''ایڈووکیٹ صلاح الدین نام ہے میرا۔ عبدالقدیر میرے کلائنٹ ہی نہیں، پرانے دوست بھی ہیں۔ ایک سیلف میڈ اور مہذب انسان کے طور پر انھیں ایک دنیا جانتی ہے۔ مگر میں نے انھیں ایک متوازن اور احسان شناس آدمی پایا ہے۔

انھوں نے آپ کی خواہش اور مطالبے کے مدنظر اس گھر کا آدھا حصہ آپ کے نام کر دیا ہے اور باقی کا آدھا حصہ آپ کی بیٹی ملیحہ کے نام ہوگا۔ آپ کو اپنی مرضی کا حصہ چننے کا بھی حق دیا گیا ہے۔ اس دستاویز پر دستخط ہونے کے ساتھ ہی آپ دونوں کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ملیحہ اس گھر میں رہے گی اور اسے تمام عمر بغیر کسی مطالبے کے اپنی اور گھر کی ضرورت کے تمام اخراجات ملتے رہیں گے۔ آج سے گھر کی چابیاں اس کے حوالے ہوں گی۔ آئندہ سے نوکروں، ملازموں اور لین دین کے تمام معاملات کی مختار وہی ہوگی۔ اسی کی بات مانی جائے گی۔''

''گڈ!'' امی نے جلدی سے سائن کر دیے تھے۔

''تو اس جاہل نے بالآخر گھر پر میرا حق مان ہی لیا۔ میری زندگی کا نیا تجربہ ہوگا۔'' وہ بڑبڑائی تھیں۔ ''جی جی!'' صلاح الدین ایڈووکیٹ زیرِ لب مسکرائے۔

''خاتون! برا مت مانیے گا آپ کو اس نئے تجربے میں لگے گا کہ خدا نے آپ دونوں کو اکٹھا کرنے کے تجربے کے اثرات اتنے بگڑے ہوئے دیکھے ہیں کہ اس نے تجربے کی بساط ہی لپیٹ دی ہے۔''

ایڈووکیٹ انکل چلے گئے تو میرا خیال تھا امی بہت

دل سے روئیں گے۔ دکھی ہوں گی۔ عمر بھر کا رشتہ تھا ٹوٹ گیا۔ جہاں کبھی اتنے تعلق رہے ہوں وہاں وہ بنیاد ہی نہ رہے تو دل پر کیا بیتتی ہوگی۔ مگر ان کا ایک ہی تبصرہ تھا۔ ''خس کم جہاں پاک۔'' میرے سات بھائی ہیں۔ دیکھنا کیسے پلکوں پہ بٹھاتے ہیں۔ پھر فون کے نمبر گھومنے لگے۔ امی نے یہ خبر ہر جگہ دے کر داد پائی۔ تب انھیں اندازہ ہوا کہ پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ گیا ہے۔

انھی دنوں میں مِس امبر سے ٹکرائی تھی۔ میرے لیے تو ابر کا ٹکڑا تھیں۔ ایسی مہربان جیسے پیاسی دھرتی اور سوکھی دراڑوں میں اُگے کسی پودے کو اچانک کہیں سے بہت سا پانی میسر آجائے۔ میں نے ایک روز ان سے پوچھا تھا ''مِس! یہ بروکن ہوم کیا ہوتا ہے؟'' انھوں نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے سے رو دیں۔ تب تو مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ روتی دوست کو گلے لگا کر چپ کرایا جاسکتا ہے، کوئی مِس رو پڑے تو کیا کرتے ہیں۔ مِس امبر نے اپنے پرس سے ایک چھوٹی سی کتاب نکالی۔ اس پر قرآن پاک لکھا تھا۔ اس میں سے انھوں نے سورۃ عنکبوت نکالی۔ وہی سورۃ جسے کبھی میرے ابو پڑھ کر رو دیئے تھے۔ انھی دنوں میرے ابو مجھے سیر کروانے لے گئے تھے۔ چھوٹی سی عمر کے اتنے بڑے تجربے سے میں دوچار ہو چکی تھی کہ یہ بوجھ میری برداشت سے زیادہ تھا۔ میں نے کہا ابو ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ وہ بولے نہیں بیٹے یوں نہیں کہتے۔ رشتے ضرورتوں سے تو نہیں پہچانتے۔ نہ یہ ضرورتوں سے بنتے ہیں اور نہ ضرورتوں کی تکمیل سے جڑے ہی رہتے ہیں۔ محبت اور خدمت نہ ہو تو ایسی کوئی ایلفی ایجاد نہیں ہوئی جو ان رشتے کو جوڑ سکے۔

ہمارے گھر ملازموں اور کام کرنے والوں کے علاوہ مہینوں کوئی نہیں آتا تھا۔ تبھی تو مجھ پر بھید کھلا کہ غم اور خوشی سے بے نیازی بھی ایک کیفیت ہے جو ان دونوں سے بے نیاز ہونے پر حاصل ہوتی ہے۔ پھر نہ پیز رہتی ہے نہ جلن۔ چبھن بھی ہو تو وقتی سا درد ہوتا ہے۔ پھر دکھ درد...... خوشی سب ختم ہو جاتے ہیں۔ میری ماں بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ وہ عمر بھر اس سے بھی بڑے گھر کے خواب دیکھتی رہی۔ اسے گھر والوں نے یہ خواب دیکھنے دیا بلکہ شاید سبھی مل جل کر اسے یہی خواب دکھاتے رہے۔ یہیں سے وہ تکبر اور لالچ خیال کے راستے ان کے ذہن میں جا بسا جس کو دنیا کا کوئی پلاس، کوئی زنبور اکھاڑ نہیں سکتا۔

آپ کو میں نے یہ تو بتا ہی دیا ہے کہ علیحدگی کے بعد میرے ابو کم ہی گھر آئے۔ آخری بار جب آئے تو اسکول سے میرے ساتھ، سیدھے میرے ہی کمرے میں۔ نہ کوئی مطالبہ نہ کوئی فرمائش۔ نہ کوئی گلہ نہ کوئی شکوہ۔ تبھی میں نے کہا تھا ''ابو! کوئی آپ کا کیا کرے۔'' وہ بولے ''بیٹے! ایک گھر میں نے بھی بنایا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہ مکڑی کے گھر سے مضبوط ہوگا۔ یہاں رہنے والوں کے تعلق کی مضبوطی ہوگی۔ مگر سالہا سال بعد دیکھا تو محسوس ہوا یہ تو مکڑی کے گھر جیسا ہی نکلا۔ ممکن ہے جب اللہ نے انسانوں کے بیچ محبت اور مودت اتاری ہو کچھ لوگ دونوں ہاتھوں سے لے رہے ہوں گے۔ میرے جیسے کچھ لوگ ہوں گے جو کچھ اور سوچ رہے ہوں گے اور اپنی ہتھیلیوں کو سیدھا کر کے اس دولت اور نعمت کو سمیٹنے ہی سے محروم رہے ہوں گے۔''

میں نے اس روز پہلی بار ابو کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔ ان کے ماتھے پر ڈھیر سارا پیار کیا تھا۔ ان کے بالوں میں انگلیاں پھیری تھیں۔ ان کی آنکھوں پر دھیرے

دھیرے مساج کیا تھا۔ اس دوران وہ بند آنکھوں سے دھیمے دھیمے مسکراتے رہے۔ پھر بولے۔ ”بچے میری بات مانو گے۔“ میں نے گھبرا کر کہا ”پاپا پلیز! میرا آپ کے علاوہ اور ہے کون؟ اور کس کی مانوں گی میں۔ پر آپ مجھے بچے نہ کہیں اب میں بڑی ہوگئی ہوں۔ آپ کا گھر سنبھالتی ہوں۔ سارا حساب کتاب رکھتی ہوں۔“

بولے! دیکھ چاند!! میرے من میں تو کب کی نہ لگن رہی نہ جلن رہی۔ ایک تعلق نبھانا چاہا سالوں نبھاتا رہا۔ پر دوسرا ساتھ نہ دے تو تانگے میں جُتے گھوڑے جیسا حال ہوتا ہے، نہ دلکی چال چلا جاتا ہے نہ دوسرا ٹھیک سے چلنے دیتا ہے۔ ہاں گردن پر زخم بڑے گہرے آتے ہیں چونکہ روز آتے ہیں اس لیے گھاؤ بن جاتے ہیں۔ دیکھ تو ایسا کچھ نہ کرنا۔ کون جانے میں کل تیرے پاس ہوں نہ ہوں۔ رہوں نہ رہوں۔ کوئی تجھے مجھ تک آنے دے، نہ آنے دے۔ کل تیری شادی ہوگی۔ نئی زندگی ہوگی، نیا ساتھ ہوگا۔ اگر اپنے پاپا کی بیٹی ہو تو ہمارے بابا جی کی ایک بات یاد رکھنا۔ اپنے میاں کو بادشاہ جاننا۔ بادشاہ ہی کہنا۔ بادشاہ کہو گی تو سلطنتِ دل کی مالک بنو گی۔ ملکہ کہلاؤ گی اور جو تُو نے اس رشتے کی ناقدری کی، اپنے آپ کو بڑا جانا، باپ کے روپے پیسے اور گھر کو، گھر کی چیزوں کو اہم جانا، اپنے میاں کو چھوٹا اور دولت کو بڑا مانا تو اسے نوکر سمجھو گی۔ بس یہ سوچ لینا، اسے نوکر سمجھو گی تو نوکرانی کہلاؤ گی۔ کبھی خیر نہ پاؤ گی۔ خالی ہاتھ رہ جاؤ گی۔ میرے مولا کو یہ سب بہت ناپسند ہے۔ وہ کہتا ہے سمندر میں انگلی ڈبو کر نکالو تو جتنا پانی انگلی کی پور پر لگے وہ تمھاری کُل دنیا ہے اور یہ دے کر میرے خزانے میں کمی نہیں آتی۔ تو بھلا قطرہ بھر پانی پر کیا اترانا۔ اس پر کیا تکبر کرنا۔“

میری قسمت دیکھیے کہ چھوٹی سی عمر میں اتنے بڑے سارے گھر کی آدھی مالکن بنی۔ ابو کے سارے بینک اکاؤنٹس میں حصہ دار ٹھہری۔ دوسرا گھر، جس میں وہ اکیلے رہا کرتے تھے وہ بھی میرے ہی نام تھا اور شمن بی بی جی ہاں میری ماں کہا کرتی ہے۔ ”بیٹی تو بہت قسمت والی ہے۔ تیرے پاس اتنی دولت جائداد ہے جو اس گھر میں آئے گا۔ تیرا غلام کہلائے گا۔“ میں انھیں کیا بتاؤں کہ ”میری عمر کی لڑکیاں کہانیاں پڑھتی ہیں۔ ریڈیو سنتی ہیں۔ نئے گیتوں کی دھنوں کو گنگناتی ہیں اور میں اکثر خالی وقت میں اس پل کو یاد کر کے روتی ہوں جب میرے پاپا میری گود میں سر رکھے سو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں پر میرا ہاتھ گیا تو یوں لگا جیسے وہاں نمی ہو، وہ رو رہے ہوں۔ میں بے قرار ہو کر انھیں پیار کرنے کو جھکی تھی اور عین اس لمحے ان کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر یوں گرا جیسے کوئی چھت سے گرتا ہے۔ میں تو چیخ بھی نہ سکی۔ کوئی دلاسا دینے والا نہ ہو۔ چپ کرانے والا نہ ہو تو ساری چیخیں اندر ہی گھٹ کر رہ جاتی ہیں اور عمر بھر سلگاتی ہیں۔“

یہ سلگن بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ ایک ٹھنڈی میٹھی کہ بس رُلا دیتی ہے۔ ایک کڑوی کسیلی جو سلگا دیتی ہے۔ اندر سے دہکا دیتی ہے۔ ایک سلگن ایسی بھی ہوتی ہے۔ جو لمحوں میں جھلسا دیتی ہے۔ آگ لگا دیتی ہے۔ مجھ غریب پر تو یہ ساری ہی مہربان ہیں۔ پل پل میرے ساتھ رہتی ہیں۔ مجھے رلاتی ہیں، آنسو چھلکاتی ہیں اور اس عالم میں کہ انھیں پونچھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔

ماسی بشیراں ہر روز ناشتے میں آملیٹ بناتے ہوئے انڈا اٹھینٹتی ہے اور وہ کیا انڈا اٹھینٹتی ہے۔ میرا ہی وجود پھینٹا جاتا ہے۔ غصہ زیادہ ہو یا بے بسی دونوں ہی صورتوں میں انسانی وجود اسی طرح پھینٹا جاتا ہے۔

ooo

نے بی۔ ایس سی کا امتحان پاس کیا تو اپنے **ارشد** والد سے کہنے لگا کہ وہ اپنے چچا کے پاس امریکا جانا چاہتا ہے اور بقیہ تعلیم وہیں مکمل کرے گا۔ والد نے جواب دیا کہ تم دو ہی بھائی ہو، عمر ابھی چھوٹا ہے۔ اللہ کا کرم ہے ہمارے پاس خاصا رقبہ ہے۔ اتنی دور پرائے دیس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں اپنے ملک میں جتنا پڑھنا ہے پڑھ لو۔ ویسے بھی میں اب بوڑھا ہو رہا ہوں، تعلیم مکمل ہونے کے بعد تم یہ کھیتی باڑی کا کام سنبھال لو۔ نوکری بھی کرنی ہو، تو تمھاری مرضی! اللہ رکھے تمھارا چچا حق نواز بھی تمھاری عمر میں ضد کر کے امریکا چلا گیا تھا کہ مزید تعلیم حاصل کر کے اور گھوم پھر کر واپس آجائے گا۔ مگر چالیس برس ہو گئے آج تک اسے واپس وطن آنا نصیب نہ ہوا۔ دو تین سال بعد بیوی بچوں کے ساتھ آکر مل جاتا ہے اور بس۔ وہیں کا ہو کر رہ گیا ہے، اولاد بھی وہیں پلی بڑھی، دیکھا نہیں تم نے بالکل صاحب لگتے ہیں۔ ویسی ہی عادتیں ہیں، ویسے ہی کھاتے پیتے ہیں۔ وہ دیسی، تو لگتے ہی نہیں۔

ارشد کی ماں بھی رونے لگی ”بیٹا تم ہمیں چھوڑ کر کہاں جاؤ گے، اپنا گھر بار ہوتے ہوئے کیوں دربدر کی ٹھوکریں کھانا چاہتے ہو۔ اللہ نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا۔ ہمارے پاس کسی چیز کی کمی ہے بھلا؟“

مگر ارشد نے ملتجی نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اماں! میں بھلا زیادہ عرصہ آپ لوگوں سے دور رہ سکتا ہوں؟ مجھے کسی چیز کا لالچ نہیں۔ بس ذرا گھومنے پھرنے کا شوق ہے اور ساتھ تعلیم بھی مکمل کرلوں گا۔ پھر چچا حق نواز بھی تو وہاں ہے۔ انہی کے پاس رہوں گا، فاروق میرا ہم عمر ہے اور پھر اس کے ساتھ دوستی بھی ہے۔ دونوں سیر سپاٹا کریں گے اور چچی جان بھی اتنی اچھی ہیں۔ وہ مجھ سے بڑا پیار کرتی ہیں۔ بھلا مجھے وہاں کیا تکلیف ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں، دو تین سال تک واپس آجاؤں گا۔ آپ جب اداس ہو جائیں، تو مجھے بتا دینا، میں فوری طور پر آجاؤں گا۔''

''اس کی ماں اگرچہ پڑھی لکھی خاتون نہ تھی، مگر نہایت سمجھ دار عورت تھی۔ بولی ''بیٹا ماں تو اسی وقت اداس ہو جاتی ہے جب اس کا بیٹا گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتا ہے اور جب تک وہ واپس نہ آجائے اس وقت تک وہ اس کے لیے فکر مند رہتی اور دعائیں مانگتی رہتی ہے۔''

ارشد کے والد نے بھلے وقتوں میں میٹرک پاس کیا تھا۔ وہ نہایت دانا اور رکھ رکھاؤ والا شخص تھا۔ اگرچہ وہ گاؤں کا چودھری تھا مگر اس میں چودھریوں والی ''بومزاج'' نہ تھی۔ ارشد نے دبے دبے لفظوں میں امریکا جانے کی ضد جاری رکھی اور آخر اس کے والدین کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ماں نے اس سے بس ایک شرط رکھی کہ وہ شادی وہاں نہیں کرے گا۔ اس کی شادی وہ اپنی مرضی سے خود کرے گی۔ ارشد نے یہ شرط راضی خوشی منظور کر لی۔ اور کہا ماں یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں آپ لوگوں کی مرضی اور رضا مندی کے بغیر شادی باہر کر لوں۔ ویسے بھی مجھے ولایتی عورتیں پسند نہیں۔ اماں بھلا ہمارا ان کے ساتھ کیا میل ہوسکتا ہے یہ سن کر اس کی ماں خوش ہوگئی۔

چند ماہ بعد ارشد ریاست جارجیا کے شہر اٹلانٹا میں اپنے چچا چودھری حق نواز کے گھر پہنچ گیا۔ وہ بھی بڑے خوش ہوئے۔ خاص طور پر اس کے چچا زاد فاروق کی خوشی تو دیدنی تھی، اس کا دوست جو اس کے گھر آگیا تھا۔ ماہ ڈیڑھ ماہ تک تو فاروق نے اسے خوب گھمایا پھرایا۔ پھر جب اٹلانٹا یونیورسٹی میں داخلوں کا سیزن آیا، تو ارشد نے ایم۔ایس (پلانٹ پتھالوجی) میں داخلہ لے لیا اور فاروق نے ایم۔ ایس (کمپیوٹر سائنس) میں۔ ارشد اگرچہ پڑھا لکھا، روشن خیال نوجوان تھا، مگر اس کی جڑیں اپنے وطن کی مٹی میں پیوست تھیں۔ اس نے سوچا اگر نوکری بھی کرنی ہوئی، تو وطن واپس جا کر کرے گا۔ ورنہ اپنی زمینوں پر جدید طریقوں سے کاشتکاری کرے گا اور اپنے کام کو وسعت دے گا۔ یوں ارشد اور فاروق اکٹھے ہی یونیورسٹی آتے جاتے اور ان کا بیشتر وقت ساتھ ہی گزرتا۔

ارشد کا چچا حق نواز ستر کی دہائی میں بی۔اے میں پڑھائی چھوڑ کر امریکا چلا گیا تھا۔ وہاں قدم جمانے میں اسے سخت محنت کرنا پڑی۔ پہلے تو اس نے محنت مزدوری کی، پھر آہستہ آہستہ اپنا کاروبار سیٹ کر لیا اور کچھ عرصے بعد اپنی بیوی کو بھی وہیں لے گیا۔ فاروق اس کا چھوٹا بھائی علی اور بہن ثمینہ بھی وہیں پیدا ہوئے۔

حق نواز نہایت ذہین اور ملنسار شخص تھا۔ وہ اپنے کاروبار کے ساتھ ساتھ وہاں سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ اس طرح سوشل حلقوں میں وہ کافی مقبول ہوگیا، آخر تھا تو زمیندار کا بیٹا ہی نا! خاندانی چودھراہٹ کی بُو ابھی باقی تھی۔ اُس نے اپنے اثر وسوخ سے ایک زرعی فارم الاٹ کرالیا اور وہاں بزنس کے ساتھ ساتھ کاشتکاری بھی شروع کر دی۔ جب کچھ سالوں بعد پاکستان آیا، تو چودھری فتح محمد نے ہنستے ہوئے اسے کہا ''حق نواز اگر زمینداری ہی کرنا تھی، تو اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی، اپنی زمین کیا کم تھی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ بھائی جان زمیندار کا بیٹا جہاں بھی ہو وہ زمین کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ساتھ ہی ایک دلچسپ بات بتائی کہ جب وہ زرعی فارم الاٹ کروانے کی کوشش میں تھا، تو میو برادری سے تعلق رکھنے والے ایک پاکستانی بزرگ سے اس بارے میں مشورہ کیا، تو اسے نے پوچھا ''جمیندار کا پوت ہووے؟'' (کیا زمیندار کے بیٹے ہو؟) میں نے کہا ''بابا ہووے۔''

وہ بولا ''تو جمین تو دوخ میں بھی ملے تو لے لیو۔'' (تو پھر زمین دوزخ میں بھی ملے، تو لے لینی چاہیے۔) یہ سن کر چودھری فتح محمد بہت ہنسا اور بولا کہ بابے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

ارشد کی کلاس میں پندرہ بیس لڑکے اور دس پندرہ لڑکیاں تھیں جو زیادہ تر امریکن ہی تھے اور امریکا کی مختلف ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک لڑکی ماریا جو کیلیفورنیا کی رہنے والی تھی، وہ ذہین اور خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش ذوق اور خوش لباس بھی تھی۔ وہ بہت متجسس عادت کی مالک تھی، ہر شے کی گہرائی تک جاتی۔ ہر بات پر خوب بحث مباحثہ کرتی تھی۔ لڑکے اسے ''فلاسفر'' کہتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ ارشد سے مانوس ہوگئی اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ پھر ان کی دوستی میں فاروق بھی شامل ہوگیا۔ اب یونیورسٹی میں اکثر تینوں اکٹھے دیکھے جاتے۔ وہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہتی تھی۔ ''ویک اینڈ'' پر ماریا اکثر فاروق اور ارشد کے ساتھ ان کے گھر جایا کرتی تھی اور کبھی کبھار ان کے ساتھ پکنک منانے ان کے زرعی فارم پر بھی جاتی۔ فاروق کے گھر والے بھی ماریا کو پسند کرنے لگے تھے۔ کبھی کبھار ماریا اور ارشد کسی ریستوران میں اکیلے ہی لنچ کرتے اور فاروق کو اِس بات کی خبر نہ ہوتی۔ دونوں کے درمیان دنیا کے ہر موضوع پر بحث ہوتی۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے مگر کبھی کسی نے اظہار محبت نہ کیا۔

آخر وہ دن آگیا جب اِن تینوں نے اچھی پوزیشن کے ساتھ ایم۔ایس کرلیا۔ ماریا تو پورے ڈیپارٹمنٹ میں فرسٹ آئی تھی۔ جلد ہی ماریا کو کیلیفورنیا میں ایک نہایت اچھی جاب کی آفر ہوئی جو اس نے فوری طور پر قبول کرلی۔ فاروق کو بھی جلد ہی ایک اچھی نوکری جارجیا ہی میں مل گئی، ارشد کو بھی وہاں ایک اچھی ملازمت کی آفر ہوئی۔ مگر وہ تذبذب کا شکار رہا اور کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ آخر والد کو خط لکھا کہ اس نے اچھے نمبروں میں ایم ایس سی کرلی ہے اور ایک ٹھیک ٹھاک نوکری مل رہی ہے اگر وہ اجازت دیں، تو وہ نوکری کرلے۔

ارشد کے والدین بہت خوش ہوئے کہ ان کے بیٹے نے ''ولایت'' پاس کر لی ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جلد واپس آجائے۔ اس کی والدہ نے تو اس کے لیے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔ وہ واپس آئے گا، تو اس سے پوچھ کر ''ہاں'' کریں گے۔

جب ارشد نے چچا کے اہلِ خانہ کو اپنے والدین کی خواہش کا بتایا، تو سب پریشان ہوگئے۔ فاروق بہت غمگین تھا۔ علی اور ثمینہ بھی اداس ہوگئے، چچی چچا الگ پریشان ہوئے۔ وہ سب ارشد کے ساتھ بہت مانوس ہو چکے تھے۔ ارشد تو ان کے گھر کا فرد ہی بن چکا تھا۔ سب نے اصرار کیا کہ وہ وہیں رہ جائے اور اپنے گھر والوں کو کسی طرح راضی کر لے۔ مگر ارشد کو والدین سے کیا اپنا وعدہ یاد تھا۔ پھر اس نے امریکا کے علاوہ سارا یورپ بھی گھوم پھر لیا تھا۔ اب اس کے لیے وہاں مزید رہنے میں کوئی خاص کشش نہ تھی۔ جب ماریا کو پتا چلا کہ ارشد واپس اپنے ملک جارہا ہے، تو وہ بھی سخت پریشان ہوئی۔ اس نے اکیلے میں ارشد کے ساتھ کئی ملاقاتیں کیں، اس پر زور دیا کہ وہ وہیں رہ جائے اور جاب کر لے۔ مگر ارشد وطن واپس جانے کے فیصلے پر قائم رہا۔

ارشد کی وطن روانگی سے قبل آخری شب ماریا، ارشد سے ملنے خاص طور پر کیلے فورنیا سے آئی۔ دونوں رات دیر تک شہر کے سب سے زیادہ خوبصورت ریستوران ''You & me'' میں بیٹھے رہے اور اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ ماریا پھر ارشد سے اصرار کرتی رہی کہ وہ امریکا ہی میں رہ جائے مگر وہ جواب میں اپنی مجبوری ظاہر کرتا رہا۔ آخر ماریا سے نہ رہا گیا اور اپنی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے ارشد سے اپنی محبت کا اظہار کر ہی دیا اور کہا کہ وہ اس کے بغیر نہ رہ پائے گی۔ ارشد کافی دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا ''دیکھو ماریا! ہم اچھے دوست تھے اور رہیں گے۔ ہم نے بہت اچھا وقت ساتھ گزارا۔ مگر میں اپنی والدہ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ شادی باہر نہیں کروں گا بلکہ ان کی مرضی اور رضامندی سے اپنے وطن اور اپنی ہم قوم کے ساتھ ہی کروں گا۔ میں اپنے وعدہ سے نہیں پھر سکتا۔ میرے لیے سب کچھ میری والدہ ہی ہے جس نے مجھے نہایت پیار سے پالا ہے۔ میرے والد نے بھی میری پرورش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، میں انھیں مایوس نہیں کر سکتا۔ پھر ہم مختلف قوم اور مختلف مذہب کے ہیں۔ ہماری ہر چیز جدا ہے، ہمارا کلچر جدا ہے، ہمارے رسم و رواج جدا جدا ہیں اور تو اور ہمارے اخلاقیات جدا جدا ہیں۔ محبت کا خمار جذبات میں عارضی حدت کے باعث ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے، تو سب ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد زندگی کے تلخ حقائق سامنے آتے ہیں، تو آدمی کو سب ''چانن'' ہو جاتا ہے۔ پھر زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔''

جواب میں ماریا بولی'' ارشد ایسا کچھ نہیں ہے۔ محبت ایک سچا جذبہ ہے، جو دو ذہنوں اور دو روحوں کے ملاپ سے وجود میں آتا ہے۔ اگر میاں بیوی میں محبت ہو تو زندگی پُرمسرت بن جاتی ہے۔ اگر دونوں میں ذہنی مطابقت اور محبت نہ ہو، تو پھر زندگی اجیرن ہوتی ہے۔ ارشد! مشہور یونانی مفکر

افلاطون نے اپنا نظریہ محبت یوں بیان کیا تھا کہ شروع شروع میں تخلیق کائنات کے وقت مرد اور عورت ایک ہی اکائی ہوا کرتے تھے۔ دونوں کا جسم ایک ہی ہوتا تھا، انھوں نے دیوتاؤں کے حکم کی نافرمانی کی، تو انھوں نے ناراض ہو کر انسان کو دو حصوں یعنی مرد اور عورت میں تقسیم کر کے زمین پر پھینک دیا۔ وہ حصے جو الگ الگ ہوئے تھے اپنے اپنے جوڑے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اور دونوں مل جائیں، تو آپس میں محبت ہو جاتی ہے اور شادی بھی کامیاب ہوتی ہے اور زندگی پُرکیف گزرتی ہے۔ مختلف جوڑے مل جائیں تو زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ ارشد ہنس پڑا اور بولا ''دیکھو! محبت اور جنسی کشش میں فرق ہے۔ مرد اور عورت کی محبت کی بنیاد جنسی جذبہ ہے۔ مگر خالص محبت بے غرض ہوتی ہے۔ جیسے ماں باپ کی اولاد کے ساتھ محبت اور اولاد کی ماں باپ کے ساتھ، بہن بھائیوں کی محبت، دوستوں کی محبت۔ انسان کی اپنے پالتو جانوروں کے ساتھ محبت اور جانوروں کی انسانوں کے ساتھ محبت، مگر ہمارے دانشور ان دونوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ پھر پسند ناپسند کا ہر ایک کا اپنا اپنا معیار ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ مرد عورت کی خوبصورتی جنسی کشش پر منحصر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھے لوگ آپ کو اتنے خوبصورت نہیں لگتے نہ ہی بوڑھوں سے عشق ہوتا ہے۔''

دونوں چپ رہے۔ ارشد بولا ''کسی فلاسفر نے کہا تھا کہ خوبصورت چیز وہ ہوتی ہے جو آپ کو بے غرض حظ دے۔ جیسے پھول، آپ ان کی خوبصورتی سے لطف اٹھاتے ہیں، مگر آپ کے اندر کوئی مزید جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ پھر مزید کوئی بات کیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اگلی شام ارشد کی پاکستان کے لیے فلائٹ تھی۔ فاروق، ارشد کے ساتھ اسے رخصت کرنے آیا تھا۔ جب وہ ایئرپورٹ پہنچے، تو ماریا پہلے سے وہاں موجود تھی۔ تینوں نے لاؤنج میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بیتے ہوئے دنوں کو یاد کیا، تینوں کے چہروں پر جدا ہونے کا دکھ نمایاں تھا۔ فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہوا، تو تینوں اٹھ کر انٹری گیٹ کے پاس آگئے۔ فاروق اور ارشد گلے ملے، تینوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ تاہم ماریا پرسکون تھی، اس نے پھولوں کا گلدستہ ارشد کو دیتے ہوئے کہا ''یہ میری طرف سے الوداعی تحفہ ہے۔ رومینیا کے پھول صرف کیلے فورنیا ہی میں پائے جاتے ہیں یہ امریکا میں کسی اور جگہ نہیں ملتے۔ نہ ان جیسی خوشبو کسی اور پھول میں ہوتی ہے۔ انھیں پھینک نہ دینا، یہ مرجھا کر بھی خوشبو دیتے رہتے ہیں۔ یہ تمھیں میری یاد دلاتے رہیں گے۔'' پھر اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور فاروق اسے سہارا دے کر ایئرپورٹ سے باہر لے آیا۔

دوسرے ہی دن ارشد اپنے گاؤں میں اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے درمیان موجود تھا۔ گاؤں کے سبھی لوگ اسے ملنے آئے اور سب خوش تھے کہ ارشد واپس اپنے گھر آگیا ہے۔

جب ارشد کو آئے چھ سات روز ہو گئے، تو ایک دن اس کی والدہ نے اسے کہا کہ میں نے تیرے

لیے ایک لڑکی پسند کرلی ہے۔ بڑی خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے۔ تمھاری بہن کو بھی بہت پسند آئی ہے، تُو کہے تو جا کر ''ہاں'' کر دیں۔ ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔ میں جلد اپنے ارمان پورے کرنا چاہتی ہوں۔

ارشد کے باپ نے بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''جیسے آپ لوگوں کی خوشی! میں راضی ہوں۔''

پھر چودھری فتح محمد بولا ''مناسب ہے بات پکی کرنے سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔'' تو ماں فوراً بولی ''اس کی کیا ضرورت ہے ہم نے جولڑکی دیکھ لی ہے۔ ان سے کہیں گے، تو انھیں بُرا لگے گا۔'' ارشد بھی بولا ''ٹھیک ہے ماں! آپ لوگوں نے جولڑکی دیکھ لی ہے، تو پھر میرے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔'' خیر بات آئی گئی ہوگئی اور کچھ دنوں بعد ارشد کی منگنی ہوگئی اور شادی کی تیاریاں بھی شروع ہوگئیں۔

ارشد کی منگیتر نبیلہ چودھری عمر دراز کی اکلوتی بیٹی تھی۔ خوبصورت اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس نے حال ہی میں شہر کے کالج سے بی۔اے پاس کیا تھا اور کالج میں فرسٹ آئی تھی۔ اسے مطالعہ کا شوق بھی تھا اور کالج میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ چودھری عمر دراز بھی اچھا خاصا زمیندار تھا، پڑھا لکھا تھا اور علاقے میں اس کی بڑی عزت تھی۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو ابھی چھوٹا تھا۔

منگنی کے تین ماہ بعد چیت کے مہینے میں ارشد اور نبیلہ کی شادی کی تاریخ طے پا گئی۔ دونوں گھرانوں میں زبردست تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ہر طرف خوشیوں کا پھیرا تھا۔ شادی سے پندرہ دن پہلے ہی مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ راتوں کو حویلی سے باہر نوجوانوں کے میلے ٹھیلے سجنے لگے۔ ڈھول کی تھاپ پر لڈیاں ڈالی جاتیں اور ماہیے گائے جاتے۔ گھروں میں لڑکیوں نے ڈھولک پر اودھم مچا رکھا تھا۔ شادی سے دو دن پہلے چودھری حق نواز بھی اہلِ خانہ کے ہمراہ امریکا سے اپنے وطن پہنچ گیا۔ ارشد کے گھر والوں کی خوشیاں تو دوبالا ہوگئیں۔ ارشد کا ایک دوست فوج میں کپتان تھا اسے کہہ کر بارات کے لیے ملٹری بینڈ کا بطور خاص اہتمام کرایا گیا۔

بارات کی رات ارشد اور فاروق ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔ دونوں دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ارشد نے اس سے ماریا کے متعلق پوچھا اس نے بتایا کہ وہ کیلے فورنیا چھوڑ کر ریاست ٹیکساس چلی گئی ہے۔ وہ اکثر اس سے فون پر بات کرتی رہتی ہے اور اس کے بارے میں بھی پوچھتی رہتی ہے۔ اچانک فاروق نے ارشد سے پوچھا ''ہماری ہونے والی بھابھی کیسی ہے؟''

ارشد نے جواب دیا ''میں کیا جانوں!''

فاروق بہت حیران ہوا ''تم نے اسے دیکھا نہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' ارشد بولا۔

''تو پھر شادی کیسے کر رہے ہو؟''

وہ پھر بولا ''گھر والوں نے جو پسند کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں خوبصورت ہے۔''

''یار ان کی بات کا کیا بھروسا؟'' فاروق بے چینی سے بولا۔

''آپا رضیہ اتنا پڑھی لکھی تو ہے نہیں اور تائی جان، تو نہایت سادہ دل خاتون ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تایا جی نے تو اس کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر تائی جان کو تو کسی میں کوئی برائی نظر آتی ہی نہیں۔ وہ کہا کرتی ہیں کہ بیٹا سب خامیاں اللہ نے بنائی ہیں، کسی کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ قرآن پڑھے لکھے ہو، تم نے دنیا دیکھی ہے، تم شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی کو ایک دفعہ دیکھ تو لیتے۔ ماریا کتنی خوبصورت ہے وہ تمھاری محبت میں دیوانی تھی۔ تم اس کی محبت کو ٹھکرا کر آ گئے۔''

''مگر اب کیا ہو سکتا ہے صبح شادی ہے، پھر میں اپنے ماں باپ کے اعتماد کو ٹھیس بھی نہیں پہنچا سکتا۔'' شد نے جواب دیا۔

دونوں چپ ہو گئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ فاروق تو جلد سو گیا مگر ارشد کو نیند نہ آئی۔ وہ ماریا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کی ایک ایک بات اس کو یاد آنے لگی۔ روانگی سے قبل اس کے ساتھ ریستوران میں آخری ملاقات یاد آئی اور ان کی محبت کے موضوع پر لمبی چوڑی بحث، ائیر پورٹ پر الوداع کرتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لینا، یاد آ گیا۔ پھر اس کا دیا ہوا گلدستہ اب بھی اس کے گھر میں موجود تھا۔ اگرچہ پھول مرجھا چکے تھے، مگر اب بھی ان میں سے ایک ناقابل بیان بھینی بھینی مسحور کن خوشبو آتی تھی۔ یہ زردی مائل سفید رنگ کے پھول تھے، انھیں خیالوں میں گم ارشد نہ جانے کب سو گیا۔

اگلی صبح باراتیوں کو اکٹھا ہوتے اور تیار ہوتے کافی دیر ہوگئی۔ بارات گیارہ بارہ بجے کے قریب گھر سے روانہ ہوئی۔ بڑا طمطراق تھا، چودھری فتح محمد نے علاقے کے سب چودھری بھی بلائے ہوئے تھے۔ سیانوں نے کیا خوب کہا ہے کہ بارات کی ''چڑھت'' ہی قابل دید ہوتی ہے۔ واپسی نہیں، خیر چودھری عمر دراز کا گاؤں زیادہ دور نہیں تھا۔ کوئی گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا بعد بارات چودھری عمر دراز کے ڈیرے پر جا اتری۔ ڈیرہ اس کی حویلی کے ساتھ ہی تھا۔ وہاں بارات کا شاندار استقبال بھی دیدنی تھا۔ ایک جم غفیر تھا، علاقے کے سب چودھری استقبال کرنے والوں میں شامل تھے۔

بیٹھتے ہی بارات کی تواضع شربت اور سافٹ ڈرنکس سے کی گئی۔ کچھ دیر بعد ہی نکاح خواں بھی آ گیا۔ اس نے نکاح پڑھانا شروع کیا، تو چھ کے چھ کلمے ارشد کو پڑھائے پھر چند سورتیں بھی۔ پھر ایجاب و قبول کی باری آئی، تو ارشد سے پوچھا ''تمھیں پچاس ہزار روپے حق مہر کے عوض نبیلہ خاتون دختر چودھری عمر دراز نکاح میں قبول ہے۔'' ارشد خاموش رہا، اس کا ذہن تو فاروق کی رات والی باتوں سے تپ رہا تھا۔ اگر دلہن پسند نہ آئی تو؟'' ماریا جیسی پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی کو ٹھکرا کر کہیں میں نے ناشکری تو نہیں کی؟'' مولوی صاحب نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر سوال دہرایا۔ ارشد پھر خاموش رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اب مولوی صاحب کو قدرے پریشانی ہوئی۔ اِردگرد جو لوگ بیٹھے سن رہے تھے سب چونکے۔ مولوی صاحب نے پھر توقف کیا اور تیسری بار ذرا اونچی آواز میں سوال دہرایا۔ پھر جواب نہ پا کر بولے ''بیٹے جواب

دو!'' ارشد کے باپ نے جو خود بھی بہت بے چین ہو چکا تھا اسے ٹہوکا دیا کہ جواب دو۔ تو کافی توقف کے بعد ارشد بولا ''میں پہلے لڑکی دیکھنا چاہتا ہوں؟'' اس کا جواب سن کر سب پر سناٹا چھا گیا۔ سب حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ چودھری عمر دراز پر تو جیسے بجلی گر گئی ہو۔ چودھری فتح محمد بھی سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ ارشد کا جواب سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ مجلس میں چند لمحے مکمل سناٹا چھایا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ سرگوشیاں شروع ہوگئیں، کوئی کہتا لڑکے کو لڑکی پسند نہیں، اسے زبردستی لایا گیا ہے۔ کوئی کچھ بولتا تو کوئی کچھ۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں!

ارشد کے اس بے محل مطالبے سے باراتی اور گھر والے پریشان تھے۔ چودھری فتح محمد چودھری حق نواز اور ان کے سب رشتہ داروں نے ارشد کو بہت سمجھایا مگر وہ اپنے مطالبے سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا۔ چودھری عمر دراز اور اس کے رشتہ داروں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ پریشانی اور ندامت سے زمین پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔ انھیں کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ نہ ''جائے ماندن نہ پائے رفتن'' والا معاملہ تھا۔

وہاں ابھی ایسی ہی صورت حال تھی کہ یہ خبر اڑتے اڑتے اندر زنان خانے میں بھی پہنچ گئی۔ عورتوں نے پریشانی میں رونا شروع کر دیا۔ نبیلہ کی ماں تو بے ہوش ہی ہوگئی۔ جب اس بات کی سن گن نبیلہ تک پہنچی تو فرطِ غم سے اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ لیکن کچھ دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا اور اپنی والدہ کو بلا کر کہا کہ اسے دُلھا کی شرط منظور ہے۔ اسے اندر بلا لو، میں تیار ہوں۔ سب عورتوں نے نبیلہ کو بہت سمجھایا دیکھو پاگل نہ بنو۔ اگر دُلھا نے تمھیں دیکھ کر ناپسند کر دیا، تو تمھارے پلے کیا رہ جائے گا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ آخر کار یہ بات باہر نکاح کی مجلس میں پہنچائی گئی۔ ارشد اپنے کزن فاروق اور اپنی بہن رضیہ کے ساتھ زنان خانے میں آیا اسے دُلھن دکھائی گئی۔ جب دونوں ایک دوسرے کو دیکھ چکے تو ارشد بولا ''اسے دُلھن پسند ہے اور وہ نکاح کے لیے تیار ہے۔''

جب وہ واپس جانے لگے، تو نبیلہ بولی ''ٹھہرو!'' اور ارشد سے مخاطب ہو کر کہا ''تمھارے پسند کرنے کا شکریہ! لیکن تم مجھے پسند نہیں آئے۔ اس لیے میں تمھارے ساتھ شادی کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ تم بارات واپس لے جاؤ۔ جب تک میں نے تمھیں نہیں دیکھا تھا، تو میں اپنے گھر والوں کے بھروسے پر تم سے شادی پر راضی تھی۔ اب ہم نے تمھاری خواہش پر ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے اور تم مجھے پسند نہیں آئے اس لیے تمھارے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔ اگر تمھیں اپنے گھر والوں پر بھروسا نہیں تھا، تو منگنی سے پہلے مجھے دیکھ لیتے۔''

نبیلہ کے یہ الفاظ ارشد پر بجلی بن کر گرے۔ وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ اب اس کے پاس کہنے کو رہ ہی کیا گیا تھا؟ وہ باہر آگئے۔

اس کے بعد باراتیوں اور نہ ہی گھر والوں کے پاس کچھ کہنے سننے کی ہمت اور گنجائش باقی تھی۔ سو ارشد ناکام و نامراد مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا بغیر دُلھن کے بارات لے کر واپس اپنے گاؤں آگیا۔

ooo

حماقت کہانی

ہونی ہو کر رہتی ہے

عزیز احمد لیل / حامد مشہود

ایک خوشحال و خوش بدن کا قصہ اس کا دماغ ایک ہی طرح سوچتا تھا

ہونی ہو کر رہتی ہے۔

ہم اس گاؤں میں ایک قتل کا سُراغ لانے گئے تھے کہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ قتل پر بھی قتل ہوئے۔ یہ بہت بڑا گاؤں تھا، ہم اسے فرضی طور پر ''وارث پور'' کہہ لیتے ہیں۔ اس گاؤں کا ایک امیر زمین دار قتل ہو گیا تھا۔ مقتول کا نام ''نیک'' تھا۔ اس کے بیٹے اصغر نے فوری طور پر ہمیں بلا بھیجا اور ساتھ ایک بس بھی بھیجی۔ یہ وہ بس تھی کہ جس کا ڈرائیور اگنیشن میں چابی گھماتا، تو اسی وقت کنڈکٹر بس کے انجن کے آگے لگا لیور گھماتا اور انجن چالو ہو جاتا تھا۔ اب یہ بس آپ کسی عجائب خانے میں ہی دیکھ سکتے ہیں۔

ہم بس میں دو گھنٹے سفر طے کر کے وارث پور پہنچے تو سرما کی سرد شام ہو چکی تھی۔ جائے وقوعہ ایک ویران ڈیرا تھا۔ نیک یہاں سے ایک بیل لینے آیا تھا

کہ مارا گیا۔ اس کا مردہ جسم بیل کے ٹوٹے ہوئے پتوں کے درمیان پایا گیا تھا۔

کھوجی نے قاتل کے قدموں کے نشانات پر ٹوکرے اُلٹا کر رکھے تھے۔ اسی وقت وہاں پولیس انسپکٹر ''سنجے رائے'' بھی آ گیا۔ سنجے کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بہت قابل اور دیانت دار پولیس افسر تھا۔ سنجے ہمارے علاقے میں بھی اپنا فرض نبھا چکا تھا، اس لیے ہم ایک دوسرے کو جانتے۔ سنجے نے مجھے بتایا کہ مقتول کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا، وجہ مرگ پستول کی گولیاں تھیں۔ کھوجی نے ٹوکرے اُٹھا کر ہمیں قاتل کا کھرا دکھایا۔ قاتل نے مضبوط جوتا پہن رکھا تھا۔

کھوجی نے کہا ''یہ ایک جوان مرد کا کھرا ہے۔ کھوج لگانا ہمارا آبائی پیشہ اور فن ہے۔ میں علاقے کے بہت سے افراد کے کھرے تو ویسے بھی پہچان لیتا ہوں مگر یہ کھرا میرے لیے اندھا ہے کہ قاتل چند قدم مٹی پر چلا تو پھر گھاس پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد دور دور تک اس کا کھرا نہیں ملا۔''

ہمارے کُتے اتا پتا لگانے ہی آئے تھے۔ ہم نے کُتوں کو کھرا سنگھایا۔ پھر خاکِ پا دو لفافوں میں بھی محفوظ کر لی گئی تا کہ کُتے دوبارہ اپنی قوتِ شامہ بوقت ضرورت تازہ دم کر سکیں۔

کتے گھاس کی پٹی پر چلتے ہوئے فصلوں کے بیچ ایک کھال میں چل پڑے۔ پھر ان کا رُخ بدلتا چلا گیا۔ ہم ان کی معیت میں چلتے رہے۔ رات ڈھل گئی، ہم ٹارچ جلا جلا کر راستہ دیکھتے رہے۔ کھوج جاری رہی، راستے میں بھی کتوں کو خاکِ پا سنگھائی گئی۔ یوں ہی ہم نے بارہ میل کا فاصلہ طے کر لیا۔

ہمارے سامنے ایک گاؤں تھا اور ہم بانسوں کے درختوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ گاؤں کی بیرونی پٹی پر ایک بہت بڑا گھر تھا۔ ہمارے کتے اسی گھر کی نشاندہی کر رہے تھے۔ تب انسپکٹر سنجے رائے نے گھر کا محاصرہ کر کے اہلِ خانہ کو جگایا۔

گھر کے سربراہ چراغ دین نے پولیس کو بتایا کہ ان کے ہاں کوئی بھی مجرم کبھی نہیں رہا۔ تاہم رائے نے اس بات سے اتفاق نہ کیا۔ چراغ دین کے دو بیٹوں کو باہر بلایا گیا، تو کتوں نے انھیں بری الذمہ قرار دیا۔

''گھر کے اور مرد کہاں ہیں؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''سلامت گھر پر نہیں۔'' چراغ دین نے کہا ''وہ کھیتوں کو پانی لگانے گیا ہوا ہے۔''

اسی وقت سلامت ایک ملازم کے ساتھ گھر آ گیا۔ وہ چھبیس سال کا جوان تھا۔ دراصل وہ گھر میں موجود تھا، پولیس کا سُن کر دبک گیا تھا۔ پھر بیٹھک کا دروازہ کھول کر اپنے ملازم کے ساتھ گھر میں یوں داخل ہوا جیسے ابھی ابھی آیا ہو۔

کتے تو سلامت پر لپکنے لگے۔ سلامت نے بڑی اداکاری کی مگر سنجے رائے نے اسے دھر لیا۔ پولیس انسپکٹر نے اس پر باتوں کا جال پھینکا کہ تم فلاں فلاں راستے سے آئے تھے، قتل کے بعد تیرا فرار کس نے دیکھا تھا۔ دراصل سنجے کتوں کے اختیار کیے گئے راستے سے مدد لے رہا تھا۔

سلامت نے کہا ''موقع کا گواہ پیش کرو۔''

سنجے کے دو سپاہی سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے، انھوں نے انھیں آگے دھکیل دیا۔ سلامت کے چہرے کا رنگ ذرا بدل گیا۔ وہ عادی مجرم نہیں تھا۔ سنجے کے ایک دو سوالات نے تو اسے جڑ سے اکھاڑ دیا۔ یہ سوالات اس مقدمے کے متعلق تھے، جو استغاثہ نے عدالت میں کرنے تھے۔ سلامت پیلا پڑ گیا۔

تب سنجے اسے نمبردار کی چوپال میں لے گیا۔ نمبردار نے ہمیں گرم گرم دودھ کے ساتھ لذیذ بیسن کھلایا۔ بند کمرے میں مختصر تفتیش کے بعد اس نو آموز مجرم نے اعتراف جرم کر لیا۔ اس نے انسپکٹر کو بتایا کہ ...ب اپنی بیٹی سنبل کی شادی اس سے نہیں کر رہا تھا، سو اس نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔

لڑکی کا نام ''سنبل'' سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے مقتول کے ایک پڑوسی سے پوچھا ''کیا ٹیپو جو سرکاری محکمے میں محرر تھا، اسی گاؤں کا تھا؟''

''ہاں جی، مگر آپ اُسے کیسے جانتے ہیں؟'' وہ حیران ہو کر بولا۔

''ٹیپو دراصل میرا ماتحت رہا ہے۔'' میں نے بتایا۔

آدھی رات کو ہم وہاں سے روانہ ہوئے، تو پولیس مجرم کو ساتھ لے گئی ورنہ مقتول کا چھوٹا بیٹا، تو اسی وقت ...ے کا بدلہ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

صبح سویرے، جب ابھی پو پھٹ رہی تھی تو مقتول کا جنازہ اٹھایا گیا۔ تدفین کے بعد میں نے ساری کہانی ...ب دے دی۔ اس کہانی کا ابتدائی حصہ میرے ماضی ...ا فن تھا۔ کچھ کہانی میں نے گاؤں سے حاصل کر لی، باقی ماندہ رات کو پولیس نے دے دی تھی۔

کہانی کچھ یوں ہے:

''سرکاری نوکری میں ایک محرر ''ٹیپو'' میرا ماتحت تھا۔ انگریز کی غلامی کا دور تھا۔ اس کے والدین نے بڑے ...ب سے اس کا نام ''ٹیپو سلطان'' رکھا تھا مگر وہ ...بخت تھا۔ عاشق نامراد شاعر بن بیٹھا۔ جناب! یہ ...بے بال اور سگریٹ پھونک کر غزلیں ...۔ پتا چلا کہ موصوف اپنے گاؤں کی لڑکی سنبل کے ...ہیں کہ کب وہ میٹرک پاس کرے اور ان کی دُلھن بنے۔

ٹیپو اچھی بھلی زمین کا مالک تھا۔ پھر سرکاری نوکری اس دور میں مستزاد...... ٹیپو کی محبت یک طرفہ تھی۔

سنبل ایک بڑے زمین دار کی بیٹی اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ سنبل کا باپ ''نیک'' فوج میں بھی رہا تھا۔ وہ ایک ضدی مرد تھا۔ سنبل ایک خوب رو بیس سالہ دوشیزہ تھی، جو بڑی ہو کر اسکول گئی تھی۔ ایک ٹیپو ہی اس کی اُلفت میں خوار نہیں تھا۔ اس گاؤں کے کئی جوان سنبل کو بیاہ لانا چاہتے تھے کہ اس خوبرُو کا تب میٹرک پاس کرنا آج کی پوسٹ ڈاکٹریٹ کے برابر تھا کہ اس علاقے میں تو مسلمان لڑکیاں اسکول کا منہ نہیں دیکھتی تھیں۔ زیادہ تر لڑکیاں اَن پڑھ ہوتی تھیں۔

ٹیپو ایک دن مجھے فائلیں چیک کرا رہا تھا کہ میں نے پوچھا ''بابو! تیری محبت کا کیا بنا؟''

''میں نے تازہ غزل داغ دی ہے۔'' وہ بولا:

''عشق حیا لایا، سوزِ جگر لایا۔''

''تم غزلیں داغتے رہنا، اتنے لوگ ڈولیاں کندھوں پر رکھے کھڑے ہیں۔''

''سنبل صرف اور صرف میری ہے۔ ہم دونوں کی مٹی کی مشت ایک ہی ہے۔ ڈولیاں اُٹھانے والے بڑا غم اُٹھائیں گے، چودھری صاحب!''

میں نے اس کے ذہن رسا کی داد دی۔ عاشق نت نئے خود کو بہلاوے دیتے آتے ہیں۔ مینا، چرخ، جنت اور رنگ...... ان کی خود ساختہ دنیا بڑی عجیب ہوتی ہے، میٹھی اور رنگین۔

پھر ٹیپو کو ایک خط گھر سے ملا۔ یہ خط اس کے کسی اَن پڑھ دوست نے کسی اسکول ماسٹر سے لکھوایا تھا۔ اس نے مجھے خط دکھایا، مضمون کچھ یوں باندھا گیا تھا:

"باقی سب خیریت ہے۔ دو ماہ سے ایک شیر خونخوار ہو کر ادھر کے جنگل میں آن نکلا ہے۔ اس نے چھوٹتے ہی برکتے اور نصرو کو کھالیا ہے۔ مائی برکتے ایندھن چگتے ہوئے اس کے ہتھے چڑھی تھی اور نصرو نشہ بیچنے اگلے گاؤں جارہا تھا۔ پھر ہفتہ ٹھہر کر شیر نے دو گاؤں چھوڑ تیسرے گاؤں سے چارا کاٹتا ہوا برہمن لڑکا اٹھالیا جس کے ملازمین چھٹی پر تھے۔ باقی سب خیریت ہے۔

مبارک ہو، سنبل نے دس جماعتیں پاس کرلی ہیں۔ ان کے گھر ایک ہفتے میں تین رشتے گئے تھے، تینوں منظور نہیں ہوئے۔

سنبل نے اب کہا کہ وہ اس جوان سے شادی کرے گی جو آدم خور شیر کو ہلاک کرے گا۔ چودھری نیک بھی اپنی بیٹی کی ہاں میں ہاں ملانے لگا کہ جوان سب اپنی برادری کے ہیں، گاؤں کے ہیں مگر دلیر کون ہے...... یہ ثابت کرنا ہوگا۔

پھر ہمارے گاؤں سے پندرہ جوان شیر مارنے چلے۔ کچھ کے پاس ذاتی اسلحہ تھا، باقی کسی سے بندوق یا پستول مانگ لائے، جو مانگ کر بھی پستول نہ لاسکے، برچھی لے کر نکل پڑے، مگر شیر نہ ملا۔ پانچ جوان تیسرے دن اپنے کھیتوں میں کام کرنے لگے کہ شیر واپس جاچکا ہوگا۔ دس شکاری ایک شیر کی خاطر مختلف سمتوں میں جاتے رہے مگر بات نہ بنی۔ پھر شکاری جھڑنے لگے۔

ایک بڑا بیمار ہوگیا، اس نے جنگل سے کوئی لذیذ بوٹی کھالی تھی۔ دوسرے کا خوف ناک رومانوی جذبہ دیکھ کر اس کے والدین نے اس کی شادی فوری طور پر کسی اور معقول لڑکی سے کردی۔ تیسرا ویرانے میں ڈر گیا، اس نے سنبل سے دست برداری میں عافیت سمجھی۔ چوتھے کے باپ نے کلہاڑی تھام کر اپنے بیٹے کا رستہ روک لیا کہ سنبل کا رشتہ نہیں لینا۔ کسی زمانے میں اس کی ماں نے میرا رشتہ ٹھکرایا تھا۔ اور اب چوتھا پورے گاؤں میں کہتا پھرتا ہے کہ اس کے باپ کی عزت آڑے آگئی ورنہ وہ شیر کو کچا چبا جاتا اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی کہ کیسے سنبل اس کی دلھن بنتی۔

پانچویں اُمیدوار کی بندوق خراب ہوگئی۔ چھٹے جوان نے ایک دن شیر دیکھ لیا تھا۔ وہ دیسی پستول سے فائرنگ کرتا ہوا گھر بھاگا کہ شیر گاؤں کے پاس ہی تھا۔ شیر نے اس کا تعاقب کیا مگر جوان گاؤں کے کنارے پر برگد تلے موجود حکیم کے دواخانے تک آن پہنچا، جہاں مریض موجود تھے۔ شیر نے زیادہ افراد دیکھ کر اس کا تعاقب ترک کرلیا۔ جوان ڈر سے بخار میں مبتلا ہوگیا اور مرگیا۔

ساتویں شکاری سے اس کا واقف آکر اپنی بندوق واپس لے گیا۔ آٹھواں تنگ آکر ڈاکے ڈالنے چلا گیا ہے کہ وہ پہلے بھی یہی کام کرتا تھا۔ نواں اور دسواں قید ہیں، وہ سنبل سے شادی کے فولادی متمنی ہیں۔

میں معافی چاہتا ہوں کہ میں تیرا سرنامہ کہیں دیکھ کر بھول گیا تھا۔ اس لیے فوری طور پر تجھے خط نہ لکھ سکا۔ ٹیپو! تم آج ہی واپس آجاؤ، ورنہ تیری شادی سنبل سے کبھی نہ ہوگی۔ باقی سب خیریت ہے۔"

ٹیپو نے مجھے خط دکھا کر ایک ماہ کی چھٹی طلب کی۔ میں نے خط یادگار کے طور پر رکھ لیا۔ میں نے اسے چھٹی دے دی اور ان کے علاقے کے پولیس افسر فارسٹ افسر کے نام خطوط سرکاری کاغذ اور مہر ساتھ لکھ دیے کہ آدم خور مارنا خالص شکاری کا کام ہے عوام کی مدد کسی ماہر شکاری کو بلا کر کی جائے۔

ٹیپو اسی رات چلا گیا۔ پچیس دن بعد اس کا خط مجھے ملا کہ..... "سنبل کے متمنی دونوں جوان آپس میں الجھے تو زبردست لڑائی ہوئی۔ کئی افراد زخمی ہوئے اور مقدمات شروع ہوئے۔ میں کئی دن ناجائز اسلحہ لے کے شیر ڈھونڈتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا مگر ناکام رہا۔

آخر میں نے ایک بوڑھی دایہ کو پیسے دے کر سنبل کے ہاں بھیجا کہ "میں شیر خرید سکتا ہوں، تم کہو تو ایک شیر لاکر باہر ماردوں؟"

دایہ سنبل کا جواب لائی کہ "میں حیات سے شادی کروں گی۔ وہ ولایت سے آنے والا ہے۔ وہ فوج کے کنڈکٹر کا بیٹا ہے۔ تم ایک شیر خرید سکتے ہو، وہ بارہ شیر خرید سکتا ہے۔ تم نے وہ گھر بار کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا، جو حیات کا شہر میں ہے۔"

میں یہ سن کر گر گیا۔ سرکاری طور پر متعین شکاری نے اگلے دن شیر مار ڈالا، جب وہ جنگل میں، ایک کپڑے دھوتی لڑکی کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ سنبل کا نکاح حیات سے چند دن پہلے ہوگیا تھا۔ شہر سے دو بڑی بڑی گاڑیاں اور دو بگھیاں آئی تھیں۔ ساتھ بڑا دھوم دھڑکا بھی تھا۔ میں اب ہسپتال میں آخری گھڑیاں گن رہا ہوں۔"

پھر کافی دن گزر گئے۔ ٹیپو کی چھٹیاں ختم ہوچکی تھیں کہ اس کے والد آئے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ سنبل کی رخصتی نکاح کے پندرہ دن بعد ہوگئی تھی۔ اسی دن ٹیپو مرگیا تھا۔

میں نے ان سے تعزیت کی اور اپنے عملے کو ہدایت کی کہ ٹیپو کے واجبات کے لیے کیس فوری تیار کیا جائے۔ وہ نایاب خط میرے پاس رہا۔ جب میں نے سرکاری نوکری کو خیرباد کہا تو بھی خط میرے پاس رہا۔ اس خط میں سے ایک بدتر جمالیت جھلکتی ہے مگر اندازِ بیان سادہ ہے۔ ایک حسین لڑکی جو امیر زادے سے شادی کررہی تھی، کیسے جوانوں کو تگنی کا ناچ نچارہی تھی؟

اب اس گاؤں میں جاکر مجھے ٹیپو کا کیس پھر مل گیا تھا۔ جو ٹیپو مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ ٹیپو سلطان کہلاتے ہیں اور امر ہوجاتے ہیں۔ جو برائے نام ٹیپو ہوتے ہیں وہ اپنی جذباتی شدت کے ہتھے چڑھ کر مرجاتے ہیں۔ شیر انھیں ملتا نہیں اور تمنائے خام تعاقب نہیں چھوڑتی۔ ایسے گیدڑوں کی سوسالہ زندگی پر ہی شیر کا ایک دن بھاری ہوتا ہے۔

سنبل ایک تیز لڑکی تھی، اس نے دورانِ تعلیم ہی امیر لڑکے "حیات" سے بیاہ کا ارادہ باندھ لیا تھا۔ شیر مارنے کی شرط عائد کرکے تو وہ گاؤں کے جوانوں کو تگنی کا ناچ نچارہی تھی۔ دوسروں سے کھیلنے والی دولت سے بھی نہ کھیل سکی۔

سرما کا آغاز تھا کہ سنبل حیات کی دلھن بن گئی۔ حیات بڑا امیر جوان تھا۔ شہر میں ان کا بہت بڑا گھر تھا اور نوکروں کی فوج آگے پیچھے رہتی تھی۔ ان کے ہاں گاڑیاں اور بگھیاں تھیں۔ ایک شام سنبل کا باپ "نیک" گھوڑی پر سوار ہوکر سنبل کے ہاں جاپہنچا۔ وہ وہاں قیمتی پرندے دیکھتا رہا۔ حیات کو پرندے پالنے اور جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ قیمتی سے قیمتی پرندے لاتا تھا۔ سنبل نے پرندے دیکھتے ہوئے اپنے باپ نیک کو جل کر بتایا۔

"حیات کو صرف پرندے پالنے کا ہی شوق نہیں..... وہ بلبلیں بھی جمع کرنے کا شوقین ہے۔ ابھی شادی کو تین ماہ گزرے ہیں کہ وہ ایک نئی لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔ میں بھی اس کی دوسری بیوی ہوں۔ اس کی پہلی بیوی ایک علیحدہ گھر میں رہتی ہے۔"

نیک کو غصہ تو آیا مگر اس نے سوچ کر جواب دیا۔ سوچنا اس کی مجبوری تھی، وہ بیٹی بیاہ چکا تھا۔ "بیٹی! تم دوسری سوکن بھی برداشت کرلو۔ امیر خاوند ہے، دولت

اس کی شادیاں کرا رہی ہے۔''

سنبل غرائی ''میں سوکن برداشت نہیں کر سکتی..... میں دوسری تو کیا پہلی بھی برداشت نہیں کروں گی۔''

''تو پھر بیوگی پسند کرو کہ میں طلاق کا ٹیکا تیرے ماتھے پر نہیں لگنے دوں گا۔''

''کیا مطلب؟'' سنبل بولی۔

میں اگر حیات کو شادی سے روکوں تو بات گولی تک جائے گی۔ وہ رکے گا نہیں اور جھگڑا ہوگا۔ پھر تجھے طلاق ہوگی، میں تجھے طلاق نہیں دلوا سکتا بلکہ بیوگی برداشت کرو۔ ہم اونچے لوگ ہیں۔''

''مجھے قبول ہے۔ ابا! ابھی کوشش کرو۔'' سنبل نے حیات کی زندگی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

نیک گھر میں متلاشی نظروں سے گھومنے لگا۔ اسے اپنا داماد ٹھکانے لگانا تھا۔ آخر کار اسے بجلی کے تار نظر آئے، کھمبا اس گھر کی چھت کے بالکل پاس سر اٹھائے کھڑا تھا۔ نیک کے گاؤں وارث پور میں بجلی کا شائبہ بھی نہیں تھا مگر وہ بجلی کے متعلق خاصا جانتا تھا کہ وہ فوج میں رہا تھا۔ نیک مطمئن ہو کر سو گیا۔

صبح نیک نے اپنے داماد کے ساتھ گھر کی چھت پر دھوپ میں ناشتا کیا۔ پھر اس نے حیات کو کھمبے کے تاروں پر دھکا دے کر اُلجھا دیا۔ گھر کا پرانا نوکر جو رات کو سنبل سے طلائی زیور لے چکا تھا، اس نے گواہی دی کہ حیات چھت پر آنے والی بلی کے پیچھے بھاگا۔ حیات اپنے پرندوں کی وجہ سے بلیوں کا دشمن تھا بلکہ خاص دشمن۔ اس کا پاؤں ٹھوکر کھا گیا اور وہ مینڈھ کے ساتھ تاروں پر جا پڑا۔

نیک بیٹی کو بیوہ کر کے گھر لے آیا۔ گھر وہ پڑی رہی پھر رشتے آنے لگے۔ نیک ہر کسی کو ایک ہی جواب دیتا تھا ''ہم بڑی ذات کے ہیں، بیوہ بیٹی کی دوبارہ شادی نہیں کرتے۔''

سلامت نے ایک مرگ پر کسی گاؤں میں سنبل کو دیکھ کر اس کا رشتہ مانگا، تو نیک کا جواب سن کر اس نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ قاتل خود قتل ہو گیا۔

ہم وارث پور سے چلے، تو میں نے مقتول کے بڑے بیٹے کو سمجھایا۔ ''دوست اصغر! تم اپنے والد کی غلطی نہ دہرانا۔ بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔''

تین ماہ بعد ہم ایک آدم خور جانور مار کر واپس آ رہے تھے کہ وارث پور سے گزرے۔ وہاں زبردست لڑائی ہو رہی تھی۔ تلواریں ڈنڈے اور پتھر چلائے جا رہے تھے۔ پتا چلا کہ اصغر نے اپنی بہن سنبل کی شادی طے کر دی تھی۔ نکاح کے بعد سنبل نے رخصتی سے انکار کر دیا کہ دُلہا کا خاندان ان سے کم تر تھا۔ اس کا نکاح بھی جبراً کرایا گیا تھا۔ تب سنبل کے چچاؤں نے سنبل کی مدد کر کے اپنی پرانی مخالفت تازہ کی کہ نیک نے ان کے بیٹوں کو رشتہ نہیں دیا تھا۔

سنبل کے بھائی، اس کے چچا اور دُلہا کے حواری اُلجھ پڑے۔ آخری منظر میں نے یہ دیکھا کہ سنبل اپنے بھائی کی لاش پر دہاڑیں مار مار رو رہی تھی۔ وہ واقعی بڑی حسین لڑکی تھی، ایسی حسین کہ اس کے لیے قتل ہو سکتے تھے۔

اس حسینہ کے سر میں دماغ نہیں تھا۔ اگر اس میں دماغ ہوتا، تو اپنے میاں ''حیات'' کو قتل نہ کراتی۔ میاں، باپ اور بھائی کے قتل کے بعد اب اس احمق کے نالے بے کار تھے۔ ''آئزک نیوٹن نے واقعی سچ کہا تھا کہ دنیا میں عقل کی کوئی حد ہو سکتی ہے مگر حماقت کی نہیں۔'' خدا جانے یہ قصہ سن کر نیوٹن کیا کہتا۔ یہ بہرحال طے ہے کہ ہونی ہو کر ہی رہتی ہے۔

ooo

خزاں کی ایک سنہری خنک دار سہ پہر تھی جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ ایک میلی کچیلی بچی، جس میں غربت اور غم کے چیتھڑے بھرے نظر آتے تھے، کاندھے پہ لادے وہ پارک میں داخل ہوا اور ایک خوب پھیلے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ بچی سے جہازی سائز کاغذ نکال کر اس پر اس طرح لکیریں کھینچنے لگا جیسے اپنی قسمت کی لکیروں کو درست کر رہا ہو۔ اس کی بچپنی نرالی تھی۔ ایسی بچپنی میں نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ یہ ان گھڑیوں کی طرح نہ تھی جس میں لوگ دولت بھرنے کے لیے دن بھر اٹھائے پھرتے ہیں۔ اسی دوران اس نے اپنی بوجھل آنکھیں، جن پر زمانے کی تہ جم چکی تھی، اوپر اٹھائیں اور درخت کی پھیلی شاخوں کے بیچ دیکھنے لگا، جیسے اس کا خوبصورت منظر اپنی نگاہوں میں سما لینا چاہتا ہو۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور باہر چلا گیا لیکن اپنا کردار وہیں پر میری آنکھوں میں بھول گیا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر سو خزاں کا موسم رقص کر رہا تھا۔ اچانک قریبی درخت سے ایک بوسیدہ اور خزاں زدہ پتا میری بینچ پہ آ گرا جس کی نسیں خوب پھیلی تھیں۔ مجھے ایسا

محمد انعام الٰہی شاہین

بوسیدہ پتا

ایک کردار کی سوچ کا شاخسانہ جس کی نسوں میں ان کہی کہانیاں بولتی تھیں

لگا کہ اس کی نسوں میں ہزاروں ان کہی اور ان سنی کہانیاں دفن ہیں۔ لیکن میں ان کو پڑھ نہ سکا کیونکہ میں صرف کہانیاں لکھنا جانتا تھا، پڑھنا نہیں۔ لیکن آج میں نے اس نامعلوم جیتے جاگتے کردار میں کچھ عجیب سا دیکھا کہ میری آنکھیں اس کو پڑھنے کو تڑپنے لگیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے اندر ایک خلا ہے۔ کوئی چیز مجھ سے دور جارہی ہے۔ میں سوچتا رہا لیکن مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ یہاں تک کہ قریبی مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دینے لگی۔

مسجد میں جماعت ہوچکی تھی۔ کچھ لوگ تو اسی وقت چلے گئے، کچھ اپنی بقیہ نماز پڑھنے لگے اور چند منٹوں میں مسجد تقریباً خالی ہوچکی تھی۔ میں نے امام صاحب کو دیکھا جو پرنور چہرے کے ساتھ جانماز پر بیٹھے کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ملا۔ میں ان کے نزدیک جا بیٹھا۔ انھوں نے سر اُٹھایا اور ایک راحت افزا تبسم کیا۔ ''جی فرمائیے۔'' حوصلے اور راحت کی مٹھاس میرے حلق میں گھلنے لگی۔

''حضرت مجھ سے کچھ کھو گیا ہے۔ میں ڈھونڈتا ہوں لیکن وہ شے مجھے مل نہیں رہی۔'' لیکن بیٹا آپ کس کو ڈھونڈ رہے ہیں؟'' انھوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کچھ معلوم نہیں ہے سائیں۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ کچھ نہیں کھویا۔ کچھ بے یقینی سی حالت ہے۔''

''آپ کا نام کیا ہے بیٹا؟''

''شاہین۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''افسانے لکھتا ہوں۔''

''کیا تخلص کرتے ہو؟''

''شاہین تخلص ہے، نام دوسرا ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے۔

''تم شاہین کو ڈھونڈ رہے ہو۔''

''کیا؟ حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔''

''تمھاری حیرت بجا ہے بیٹا!''

لیکن بعض اوقات ہم جو دیکھتے ہیں ہماری نظریں اس کو پہچان نہیں پاتیں۔ یہ وقت ہی ہے جو تمھیں اس کا جواب دے گا۔'' زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں وہاں سے اٹھ کر چل دیا، اپنی منتشر سوچوں کو گھسیٹتے ہوئے۔ ذہن میں مختلف شکلیں جنم لے رہی تھیں۔ میں گھر پہنچا اور آنگن میں بچھی چارپائی پر لیٹ کر منتشر سوچوں کو ترتیب دینے لگا۔ ان پراگندہ سوچوں میں ایک غیر واضح تصویر ابھری۔ وقت..... ہاں یہ وقت کی دھندلی تصویر تھی جس کو میں بڑی مشکل سے پہچان پایا۔

وقت نجانے کیا شے ہے؟ شاید ایک گورکھ دھندا ہے جس میں ہماری زندگی بھٹکتی رہتی ہے۔ اس کے باہر کیا ہے کسے معلوم۔ بہرحال جو بھی ہو اس کے باہر بھی ایک اتنا ہی بڑا جہان ہوگا۔ میں وقت اور کرداروں کو ترتیب دیتا رہا اور رات میرے آس پاس سے گزرتی رہی۔ میرے کمرے کی مشرقی دیوار پر لیونارڈو داونچی کا شاہکار ''La Bella Principessa'' چسپاں تھا۔ جس میں ایک خوبصورت عورت کا غمگین چہرہ عیاں تھا۔ اس کو تکتے رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ پھر اچانک اس تصویر کا رنگ بدلنے لگا۔ چہرے کے نقوش تبدیل ہونے لگے اور وہ رنگ ابھرنے لگے جو پہلے ظاہر نہ تھے۔ تصویر مجھ سے باتیں کرنے لگی اور حقیقت واضح ہونے لگی۔

اس کے بعد نجانے کتنا عرصہ گزر گیا۔ شاید صدیاں تھیں یا پھر سال۔ میری نظریں اب بھی کسی کو

ڈھونڈتی تھیں۔ پارک میں درختوں پر خزاں کا رقص تھا۔ ہوا ویسی ہی خنک تھی۔ وہ ویسے ہی چپ چاپ اندر داخل ہوا اور اسی خوب پھیلے درخت تلے بیٹھ گیا۔ میں اس کو غور سے دیکھنے لگا۔ کیا یہ میں ہوں؟ کیا یہی میرا کردار ہے؟ میں یہ سوال اٹھائے اس کے پاس گھاس ہی پر بیٹھ گیا۔ نزدیک ہی ایک تصویر رکھی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے میں نے سر جھکایا۔ اس تصویر کو دیکھ کر حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ تو وہی تصویر ہے جو میرے کمرے میں لگی تھی۔ لیکن یہ اس کے پاس..... وہ اب بھی اسکیچنگ کر رہا تھا۔ اس نے میری حالت پر کوئی توجہ نہ دی۔ میں حیرت کی زنجیروں سے آزاد ہوا اور لبوں کو جنبش دی ''تم..... تم کون ہو؟'' میرے منہ سے بڑی مشکل سے نکلا۔

اس نے آواز سنی اور آہستہ سے سر اُٹھایا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں کو یقین نہ آیا۔ یہ تو واقعی میں ہوں۔ لیکن یہ کیسے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس کو شاہین کس نے بنایا۔ لیکن اس کے چہرے پر حیرت نہیں تھی۔

''شاہین۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن شاہین تو میں ہوں۔''

''میں ہنوز حیرت میں تھا۔'' میں اس قلم کا کردار ہوں جس نے اس کو جنم دیا۔ کردار کبھی نہیں مرتے..... میں بنا تھا حقیقت کو ڈھونڈنے کے لیے اور اسے کبھی نہ کبھی تلاش کرلوں گا۔''

''لیکن مجھے خود نہیں معلوم کہ حقیقت کیا ہے تو..... تو میں تمھیں.....'' حیرت سے یہاں مجھ سے بات نہ بن سکی۔ ''کردار ضمیر کے اندھیروں میں بنتا ہے اور اس دنیا میں آکر روشنی کا سامان بنتا ہے۔ میں تمھارے ضمیر کی آواز ہوں۔'' اس نے ایک لمبا سانس لیا۔

''حقیقت کوئی ایسی شے نہیں جو خود بخود آنکھوں کے سامنے آجائے۔ یہ تو ہمارے ضمیر میں مخفی ایک آنکھ ہے جسے حاصل کرنے کے لیے کئی زندگیاں قربان کرنا پڑتی ہیں۔ لیکن اس جہان میں تو تمھاری کوئی حقیقت نہیں۔ تم تو صرف ایک کردار ہو اور بس۔''

''تو تم یوں کہو کہ ایک بوسیدہ پتے کی کوئی حقیقت نہیں جو کئی کرداروں کے ساتھ زمیں پر آگرتا ہے۔'' میری آنکھوں میں منظر بدلنے لگے تھے۔ ایک بے نام سی شے واضح ہونے لگی۔ میں اپنی نم آنکھوں کے ساتھ وہاں سے چل پڑا اور پتھر کے بینچ پر آبیٹھا۔ ایک خزاں زدہ بوسیدہ پتا پاس آکر گرا۔ میری نظریں اس میں کردار ٹٹولنے لگیں۔ اس کی نسوں کے درمیان ایک کہانی دفن تھی۔ میں پوری کہانی نہ پڑھ سکا صرف ٹھنڈی اور غمزدہ آہیں ہی نکل رہی تھیں۔ شاید میری نظریں دھواں ہونے لگی تھیں۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جارہی تھی۔ لیکن میری آنکھیں اشکوں کے قطروں سے جل رہی تھیں۔ میں نے پتے کو ہاتھ میں دبایا اور ضمیر کو ٹٹولا۔ ایک گہرا اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔ میں اسی اندھیرے میں قلم سے کردار تراشنے لگا۔

○○○

☆ سچ بیان کرنے اور اس کے اظہار اور شہادت کے لیے جگہ موقع وقت اور حالات پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ..... ایک سچ کہہ کر، ہم پبلک میں خُش پھیلاتے ہیں۔ ایک سچ کہہ کر ہم چغل خوری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک سچ کہہ کر ہم غیبت گو بن جاتے ہیں۔ (عاصمہ غنی)

شکاریات

بدروح کا تعاقب

سلور جیگل محمد محبوب حسن خان کانجو

ایک درندے کی خوفناک کہانی
ایک ہندو انسپکٹر نے اسے بدروح بنا ڈالا تھا

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنے تار میں مجھ سے انسانیت کے نام پر اپیل کی کہ میں فوری طور پر دیوبان روانہ ہو جاؤں اور وہاں کے باشندوں کو اس بلائے بے درماں سے نجات دلاؤں جو ایک آدم خور چیتے کی شکل میں ان پر نازل ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے کیمپ کا سازوسامان اسی روز اپنے ملازموں کے ہمراہ دیوبان روانہ کر دیا۔ اگلے روز خود بھی وہاں پہنچ گیا۔ ابھی میں اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے اترنے بھی نہ پایا تھا کہ رونے پیٹنے کی بلند اور رنجیدہ صوت وصدا نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

دیوبان وسطی ہندوستان (سی پی) کی اُجڑی اور بنجر سی پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ان پہاڑیوں پر جابجا کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ غار موجود تھے جہاں درندے آسانی سے پناہ لے سکتے۔ دیوبان کے اردگرد دو دو چار چار میل کے فاصلے پر اسی طرز کے کچھ اور بھی دیہات تھے۔ جن میں کچے مکانات تھے۔ وہ زیادہ تر گھاس پھونس اور بانس سے بنائی ہوئی جھونپڑیاں تھیں۔ ان دیہات میں کول قوم کے لوگ آباد تھے، جو تمام ان پڑھ اور تہذیب وتمدن سے نا آشنا تھے۔ یہ لوگ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ رکھتے یا معمولی کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔

دریافت کرنے پر میرے ملازمین نے مجھے بتایا ''آج صبح یہاں سے کوئی ایک میل دور بکریاں چرانے والی ایک بیوہ عورت کے دس بارہ سالہ بچے کو ایک چیتا اٹھا کر لے گیا اور ابھی تک اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔'' میں نے گھوڑے کو یوں ہی چھوڑا اور اسی وقت گاؤں کے اندر چلا گیا۔ وہاں مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک جم غفیر تھا۔ وہ لوگ بے اختیار رو رہے تھے۔ ان میں سب سے بلند رونے کی آواز اس عورت کی تھی جو چیتے کا شکار ہونے والے لڑکے کی ماں تھی۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ان لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور فریاد کی کہ میں اس چیتے کا کھوج لگا کر اسے جہنم واصل کردوں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ پہلے رونا دھونا بند کریں اور مجھے یہ بتائیں کہ یہ واقعہ کب اور کیسے رونما ہوا۔ میری ہدایت پر وہ لوگ چپ ہو گئے لیکن لڑکے کی ماں مسلسل رو رہی تھی۔ وہ کسی طرح خاموش ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

اس غم ناک حادثے کا عینی شاہد اسی گاؤں کا تقریباً سولہ سترہ سالہ ایک نوجوان لڑکا تھا جو اس لڑکے کے ہمراہ بکریاں چرا رہا تھا۔ اس نے بتایا ''میں اور وہ لڑکا آج صبح یہاں سے ایک میل دور بکریاں چرانے گئے۔ ہم لوگ بکریاں چرا رہے تھے کہ اُس لڑکے کو پیاس لگی اور وہ چند قدم کے فاصلے پر واقع تالاب پر پانی پینے چلا گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ قریبی جھاڑیوں سے ایک چیتا نکلا اور بکریوں کے ریوڑ میں سے گزرتا ہوں لڑکے کی طرف بڑھا۔ میرا ابھی تک یہی خیال تھا کہ وہ کوئی موٹی تازی بکری اٹھائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے کسی بکری کو نہیں چھیڑا بلکہ لڑکے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اِس سے پہلے کہ میں چیخ کر اُسے بھاگنے کے لیے کہتا' میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے لڑکے پر چھلانگ لگا دی جو حالات سے بے خبر تالاب کے کنارے بیٹھا پانی پی رہا تھا۔ چیتے نے اُسے ٹانگ سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا جس طرف سے آیا تھا اسی طرف جھاڑیوں میں گھس گیا۔ یہ واقعہ کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ مارے ڈر کے میں وہاں سے گاؤں بھاگ آیا۔''

لوگوں نے مزید بتایا کہ اس درندے کو علاقے میں آئے ہوئے کوئی تین ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصے میں وہ پندرہ کے قریب مردوں، عورتوں اور بچوں کو اپنی خوراک بنا چکا ہے۔ اس کا نوالہ زیادہ تر وہ لوگ بنے جو رات کو اپنے کھیتوں میں لمبی تان کر سوئے ہوئے تھے یا پھر جن کے مسکن جنگل کے کنارے واقع تھے۔ جھونپڑیوں کی گھاس پھونس اور مٹی سے بنی ہوئی دیواروں میں اپنے پنجوں سے سوراخ کرنا اس آدم خور کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس کا آخری نشانہ ایک عورت تھی جو رات کو اپنے کنبے کے دوسرے افراد کے ہمراہ اپنی جھونپڑی میں سو رہی تھی۔

چیتا آیا، اس نے حسب معمول دیوار میں سوراخ کیا اور جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ پہلا انسان جو چیتے کے قابو آیا وہ یہی عورت تھی۔ چیتے نے اس عورت کا منہ اپنے منہ میں لینا چاہا، تو عورت کے بال اس کے منہ میں آ گئے۔ اس نے عورت کو بالوں سے پکڑ کر باہر نکالنا چاہا لیکن اس عرصے میں وہ جاگ اٹھی اور اس کی چیخ پکار سے گھر کے دوسرے افراد بھی بیدار ہو گئے۔ چیتے نے گھبرا کر اُسے چھوڑ دیا۔ اِس دوران چیتے کے کئی دانت عورت کے سر پر لگے۔ اس کے دانتوں کا زہر اس قدر مہلک ثابت ہوا کہ وہ عورت اگلے ہی دن دوپہر کو جاں بحق ہو گئی۔ چیتا اب تک تاریک شب میں حملہ کرتا آیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے دن میں بکریاں چرانے والے لڑکے کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ دیوبان میں اس کی یہ دوسری واردات تھی۔ ورنہ گاؤں کے لوگوں کی اطلاع کے مطابق اس کی وارداتوں کا زیادہ زور یہاں سے سات میل دور اجھارا نامی گاؤں پر تھا جہاں اس کا شکار ہونے والوں کی تعداد چھ تک پہنچ چکی تھی۔ میں یہ حالات جان کر اپنے کیمپ میں واپس آ گیا۔ میرے گھوڑے پر زین ابھی تک کسی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی

رائفل سنبھالی اور اس نوجوان اور گاؤں کے چھ سات دوسرے آدمیوں کو ہمراہ لے کر لڑکے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ لڑکے کی ماں نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی۔ چار گھنٹے گزر چکے تھے، مجھے گاؤں والوں کا غیر ہمدردانہ اور بزدلانہ رویہ دیکھ کر صد افسوس ہوا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اب تک لڑکے کی تلاش کا متلاشی نہ ہوا تھا۔ ہم جلد ہی تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں لڑکے کے گھسیٹے جانے کے آثار موجود تھے۔ چناں چہ ان کی مدد سے ہمیں لڑکے کی لاش تک پہنچنے میں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔ چیتے نے لڑکے کی لاش کو ایک خشک نالے میں ایک جھاڑی کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ اس نے لڑکے کی ٹانگ کا کچھ حصہ کھا لیا تھا۔ بچی کھچی لاش کا حلیہ بُری طرح بگڑ چکا تھا۔

نعش کی حالت جیسی بھی تھی، لیکن ممتا کی ماری ماں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ وہ تیزی سے لاش کی طرف بڑھی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ پھر بیٹے کے مردہ جسم کو اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا کبھی وہ اس کا منہ چومتی اور کبھی دہاڑیں مار مار کر روتی۔ چند ثانیے تک میری بھی حالت غیر رہی۔

ممتا کا پیار دیکھ کر ہم سب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سب کے رخسار آنکھوں کی نمی سے بھیگ گئے۔ ایسا سوہانِ روح منظر دیکھ کر وہاں موجود سب لوگوں کا وجود خزاں رسیدہ پتے کے مانند لرز اٹھا۔ بہرحال میں نے اس عورت کو دلاسا دیا، صبر کی تلقین کی اور بڑی مشکل سے چپ کرایا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں آج رات لڑکے کی لاش کے قریب ایک مناسب درخت پر بیٹھ کر چیتے کا انتظار کروں۔ گاؤں کے لوگوں کے سامنے جب میں نے اپنے ارادے کا اظہار کیا' تو انھوں نے بڑی خوشی سے مجھے اجازت دے دی، لیکن لڑکے کی ماں نہ مانی۔ میں نے اسے دس روپے اس وقت کے قریباً (تین صد روپے) کا نوٹ بھی دینا چاہا اور یہ بھی بتایا کہ آج اس درندے سے انتقام لینے کا شاندار موقع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں اسے آج ہی جہنم واصل کر ڈالوں اور اگر وہ آج نہ مارا گیا، تو اس امر کا خدشہ ہے کہ پھر گاؤں کا کوئی نہ کوئی بدنصیب اس کا نشانہ بن جائے گا۔ لیکن وہ عورت اتنی ہٹ دھرم ثابت ہوئی کہ اس نے دس روپے قبول کیے نہ میری کسی دلیل پر کان دھرے۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی ''میرے بچے کو میرے گھر لے چلو میں اسے کسی صورت یہاں نہیں چھوڑوں گی۔'' بہرحال یہ ماں کی ممتا تھی اور اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ عورت چند مردوں کے ساتھ اپنے لڑکے کی نعش لے کر چلی گئی۔ اب چیتے کے انتظار میں میرا یہاں بیٹھنا لاحاصل ہو گیا تھا۔ پھر بھی میں اندھیرا پھیلنے تک وہاں بیٹھا رہا، لیکن جیسی توقع تھی ویسا ہی ہوا، چیتا نہ آیا۔ میرا خیال ہے کہ یا تو اس نے مجھے وہاں دیکھ لیا تھا یا پھر اس کی چھٹی حس نے اسے متوقع خطرے سے مطلع کر دیا تھا۔

رات، کھانے کے بعد جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد گیدڑوں کی مخصوص چیخ پکار نے مجھے جگا دیا۔ میں جانتا تھا کہ گیدڑ یہ خوفزدہ آوازیں اس وقت نکالتے ہیں جب وہ کسی شیر یا چیتے کو جنگل میں پھرتا دیکھیں۔ میں اٹھ بیٹھا، اپنی بندوق سنبھالی اور کیمپ کا چکر لگانے کے لیے باہر نکل آیا۔ میں نے اردگرد کے ماحول پر ایک نظر ڈالی۔ ملازمین کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی اور پھر واپس آ کر سو گیا۔ رات خیر و عافیت سے گزر گئی، لیکن صبح یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ چیتا اُس

رات ایک دفعہ نہیں بلکہ دو مرتبہ کیمپ کے اردگرد پھرتا رہا، لیکن خیریت رہی۔

لڑکے کی موت کے بعد چند دن تک علاقے میں امن رہا، لیکن ایک ہفتے بعد اچھارا سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ چیتا پھر وہاں ایک آدمی کو اپنا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ آدمی رات گئے، پیشاب کرنے باہر نکلا تھا کہ پھر اس کو لوٹنا نصیب نہ ہوا۔ بدقسمتی سے چیتا اس وقت باہر موجود تھا۔ وہ فوری طور پر اس شخص پر حملہ آور ہوا اور اسے نیچے گرا لیا۔ اُس کی دلدوز چیخیں سن کر اس کا ساتھی ایک جلتی ہوئی لکڑی لیے جھونپڑی سے باہر نکلا۔ اسے دیکھتے ہی چیتا فرار ہو گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ چیتا اپنے شکار کو یوں چھوڑ کر چلا گیا۔ چونکہ اس واقعے کی اطلاع مجھے کافی تاخیر سے ملی تھی، اس لیے میں نے اچھارا جانا بے سود سمجھا اور دیوبان ہی ٹھہرا رہا۔

اب چاندنی راتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک رات میں اور میرے دو ساتھی کیمپ کے باہر کرسیوں پر بیٹھے تھے کہ میں نے اپنے سامنے کھلے میدان میں ایک چیتے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میں فوراً ایک کر اٹھا اور خیمے میں گھس کر رائفل نکال لایا۔ وقت بالکل نہیں تھا لہٰذا میں نے چیتے پر فائر کیے، لیکن نشانہ خطا گیا۔ چیتا الٹے پاؤں مُڑا اور تیزی سے بھاگتا ہوا ہمارے کیمپ کی پشت پر واقع ایک نالے کی طرف چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا، لیکن وہ نالہ پار کر کے دوسرے کنارے پہنچ چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوبان کا چکر لگا کر آیا تھا، لیکن جب وہاں اسے کچھ نہ ملا تو قسمت آزمائی کے لیے ہماری طرف آ نکلا۔ میرا خیال تھا کہ یہ آدم خور چیتا ابھی ہمارے علاقے میں ہے، اس لیے میں نے اگلی شام اپنے کیمپ سے کچھ فاصلے پر ایک مچان بنوائی اور اس کے بالکل قریب درخت کے نیچے ایک بکری بھی بندھوا دی۔ آدھی رات کے قریب جب میں مچان پر کچھ غنودگی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ بکری کی اُچھل کود کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی درندہ اس پر حملہ آور ہو چکا ہے۔ میں نے اسی وقت نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ گولی کا چلانا تھا کہ ایک دم خاموشی چھا گئی۔ میں نے مخصوص سیٹی بجائی اور تھوڑی دیر میں میرے آدمی ہاتھوں میں لالٹین لیے باہر آ گئے۔ حملہ کرنے والا ایک لگڑ بگڑ تھا جس نے بکری کے نرخرے کو اپنے دانتوں میں سختی سے دبوچا ہوا تھا اور اسی عالم میں وہ اپنی جان بھی کھو بیٹھا۔

اس واقعے کے دو روز بعد میں شام کو گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا کہ میرے ساتھی کول نے مجھے ایک چیتا دکھایا جو ہم سے کوئی دو سو گز دور ایک پہاڑی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نشانہ لے رہا تھا کہ چیتا اٹھ کھڑا ہوا۔ شاید اس کا ارادہ اِدھر اُدھر چھلانگ لگانے کا تھا، لیکن میری رائفل چل چکی تھی۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ پلٹ کر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ ہمارا خیال تھا کہ آج ہم نے آدم خور کا قلع قمع کر دیا ہے، لیکن جب ہم پہاڑی پر پہنچے تو معلوم ہوا یہ تو اوسط قد کی مادہ ہے جس کے متعلق پورے کیمپ کی رائے تھی کہ یہ ہرگز آدم خور نہیں ہے۔ کیونکہ آدم خور جسمانی لحاظ سے بڑے قدو قامت کا بتایا گیا تھا۔ ابھی ہم اس معاملے پر غور ہی کر رہے تھے کہ اگلے روز ہمیں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ اچھارا کا ایک لڑکا گم ہو گیا ہے۔ یہ لڑکا اپنے چھ سات ہم عمر لڑکوں کے ہمراہ جنگل میں سوکھی لکڑیاں چننے گیا تھا کہ وہیں گم ہو گیا۔ ہر چند اس کو تلاش کیا گیا مگر اس کا کوئی

نشان نہ ملا۔ ہاں البتہ ایک جگہ کچھ خون ضرور پڑا ہوا ملا۔

لڑکے کے گم ہونے کی خبر مجھے اسی روز بعد دوپہر مل گئی اور میں اپنے گھوڑے پر اجھارا روانہ ہو گیا۔ اجھارا سے میں نے تین آدمی ہمراہ لیے جو مجھے جنگل میں اُس جگہ لے گئے جہاں لڑکا گم ہوا تھا۔ ہم اس مقام پر بھی گئے جہاں خون پڑا ہوا ملا تھا، لیکن جابجا کانٹے دار جھاڑیوں کی وجہ سے یہ تعین کرنا مشکل تھا کہ درندہ لڑکے کی لاش کدھر لے گیا ہے۔ ہم مایوسی کے عالم میں لوٹ رہے تھے کہ میں نے قریبی پہاڑی کے اوپر گدھوں کو چکر لگاتے دیکھا۔ ان کی موجودگی سے میرا یہ شبہ قوی ہو گیا کہ ہو نہ ہو لڑکے کی لاش یہیں کہیں موجود ہے۔ چناں چہ ہم پہاڑی کی طرف چل پڑے۔ میں سب سے آگے آگے پہاڑی پر چڑھ رہا تھا کہ مجھے کچھ پتھروں کے گرنے کی آواز آئی جونہی میں نے اس طرف دیکھا ایک چیتا بجلی کی سرعت سے ایک چٹان سے کودا اور جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ ہمیں چیتے کو دیکھ کر یقین تو ہو گیا کہ اب ہم لڑکے کی لاش کے قریب پہنچ چکے ہیں، لیکن آدمیوں کی نفری انتہائی کم ہونے کی وجہ سے اس وقت چیتے سے دو دو ہاتھ نہیں کر سکتے تھے۔ چناں چہ ہم نے لڑکے کی تلاش جاری رکھی اور جلد ہی اسے پا لیا۔ بدنصیب کی لاش دو بڑی چٹانوں کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ صحیح و سالم تھا، لیکن سینے پر ایک بڑا زخم تھا۔ اس کے علاوہ بازوؤں اور ٹانگوں کا گوشت درندے نے کھا لیا تھا۔ بہرحال یہ منظر بے حد دلخراش تھا جس کے باعث ماحول پر خوف و ہراس پھیل گیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ لڑکے کی نعش اٹھا لیں کیونکہ اب سورج بھی غروب ہوا چاہتا تھا۔ تمام راستے، میں یہی سوچتا رہا کہ اس آدم خور کو کیسے قابو کیا جائے کیونکہ وہ روز بروز دلیر ہوتا جا رہا تھا اور مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے اجھارا کے لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر یہ صورت حال یوں ہی قائم رہی، تو پھر وہ سب کے سب یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اقدام سے حکومت کی بدنامی ہونی تھی۔ میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مجھے چند دن کی مہلت اور دیں۔

اگلی صبح پولیس کا ایک سب انسپکٹر جو ہندو تھا، ہمارے کیمپ آیا۔ چونکہ پچھلے دنوں اجھارا میں آدم خور کے ہاتھوں کئی آدمی مارے جا چکے تھے، اس لیے وہ پولیس رپورٹ تیار کرنے کے لیے وہیں جا رہا تھا۔ مجھے

بتیسی کا کمال

بازار میں ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ وہ اپنے دانتوں سے اپنی آنکھ کاٹ سکتا ہے۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ایک دوسرے شخص نے اس سے کہا کہ اگر وہ ایسا کر دکھائے تو انعام کے طور پر اس کو ایک ہزار روپے دے گا۔ پہلے شخص نے اطمینان سے مصنوعی بتیسی نکالی اور اپنی آنکھ کو کاٹ کر بتیسی واپس منہ میں رکھ لی۔ دوسرے شخص نے انعام کے طور ایک ہزار روپے دے تو دیے مگر ساتھ ہی احتجاج کیا کہ یہ غلط طریقہ ہے، بتیسی منہ سے نہیں نکالنی چاہیے۔ ''اگر یہ غلط طریقہ ہے تو بتیسی نکالے بغیر بھی ایسا کر کے دکھاؤں گا پر اب دو ہزار روپے لوں گا۔'' مظاہرہ کرنے والے نے کہا۔ دوسرے شخص نے منظور کر لیا۔ پہلے شخص نے اطمینان سے اپنی پتھر کی مصنوعی آنکھ نکالی اور دانتوں سے کاٹ کر اسے واپس اپنی جگہ فٹ کر دیا اور بولا ''نکالو دو ہزار روپے.....''

(مرسلہ: خلیل احمد، مردان)

مجھے انسپکٹر کی باتیں سن کر حیرت ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اس نے بتایا کہ یہ چیتا دراصل کوئی بدروح ہے، جو چیتے کی شکل اختیار کر گئی ہے، اس لیے مجھے چاہیے کہ میں اس کا پیچھا بالکل نہ کروں۔ بلکہ واپس چلا جاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں مجھے اس سے نقصان پہنچے یا میرا کوئی آدمی اس کا نوالہ بن جائے۔ انسپکٹر کی بے ہودہ باتوں کا مجھ پر تو کیا اثر ہونا تھا، بہرحال وہ چلا گیا۔ میرا سب وہیں لگا رہا اور اگلا ہفتہ پورے کا پورا بغیر کسی حادثے کے گزر گیا۔ میں حیران تھا کہ چیتا کہاں گیا۔ ایک شام میں معمول کے مطابق سیر کو نہیں نکلا، بلکہ کیمپ کے باہر ایک کتاب کے مطالعے میں محو تھا کہ میرا ملازم ہانپتا کانپتا بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ایک چیتے کو ہمارے کیمپ سے کوئی سو گز دور آموں کے درختوں کے جھنڈ سے گزر کر نالے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ میں نے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں پوچھا فوراً اٹھا اور اپنے خیمے سے اعشاریہ تین سو پچھتر میگن سچر رائفل سنبھالی اور اس طرف دوڑ پڑا جس طرف ملازم نے نشاندہی کی تھی۔ نالے پر پہنچ کر مجھے ایک مرتبہ تو کچھ نظر نہ آیا، لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ نالے کے دوسرے کنارے پہاڑی ڈھلوان پر ایک چیتا آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا ہے۔ اگرچہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، تاہم اس کے باوجود اس نے اپنی چال میں کوئی پھرتی یا تیزی نہیں دکھائی۔ خوش قسمتی سے آس پاس کوئی جھاڑی بھی نہیں تھی جہاں وہ پناہ لے سکتا۔ حالات بڑے سازگار تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ آج آدم خور بچ کر نہیں جا سکتا۔ میں نے بڑے اطمینان سے نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرے فائر نے درندے کو گرا دیا ہے اس کے ساتھ ہی میں نے ایک اور فائر کیا جس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ چیتا اب زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ فائروں کی آواز سنتے ہی گاؤں کے لوگ بھی دوڑتے ہوئے وہاں آ گئے۔ پہاڑی کے قریب جا کر دیکھا، تو سب کی یہ متفقہ رائے تھی کہ یہ وہی آدم خور چیتا ہے جو اس علاقے کے لوگوں کے لیے بلائے جاں بنا ہوا تھا۔ اب کیا تھا، دیہاتیوں نے جوش مسرت سے میری ''جے'' کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ فوراً ہی تندرست و توانا کول میرے نزدیک آیا اور ہم لوگ ایک جلوس کی شکل میں اپنے کیمپ پہنچے۔ یہ خبر جلد ہی قریبی دیہات میں پہنچ گئی اور آدم خور چیتے کو دیکھنے کا سلسلہ اگلے روز تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں نے اس کی کھال اتروا لی۔ یہ رات میں نے دیوبان ہی گزاری اور اگلی صبح وہاں سے روانہ ہو گیا۔

جانے سے بیشتر میں نے گاؤں کے نمبردار کو اپنے کیمپ میں بلوایا اور اسے نصف درجن پوسٹ کارڈ جن پر میں نے اپنے قلم سے اپنا پتا لکھا ہوا تھا دیے اور اسے ہدایت کی کہ وہ ہر ہفتے مجھے ایک پوسٹ کارڈ ارسال کرتا رہے کہ میں نے واقعی صحیح آدم خور کو جہنم واصل کیا ہے۔ اور اب ان کے علاقے میں کوئی آدم خور دیکھنے میں نہیں آ رہا ہے۔ نمبردار نے چھ ہفتوں تک میری ہدایت کی تعمیل کی اور مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے صحیح آدم خور مارا تھا۔ مجھے یہاں ایک افسوس بھی ہے وہ یہ کہ میری اس ہندو انسپکٹر سے ملاقات نہ ہو سکی جس نے اس آدم خور کو بدروح قرار دیا تھا۔ ملاقات ہوتی، تو میں اسے بتاتا کہ میں نے اس ''بدروح'' کو مار ڈالا ہے۔

سُوکھی ٹہنی

محمد قاسم رضا

ہمارے کچے مکان کے ساتھ ہی ان کا دو منزلہ چوبارہ تھا۔ عمر، قد، رنگت، بول چال اور عادات میں ہم جڑواں لگتے۔ ہم دونوں کا ساتھ چاند اور ستارے کی طرح تھا، جہاں میں وہاں وہ اور جہاں وہ وہاں میرا ساتھ بھی پکا۔ ہم ہر جگہ ساتھ ساتھ ہی نظر آتے۔ گلی میں، مسجد میں، اسکول میں، کھیل کے میدان میں، دُکان میں ہر جگہ۔ لیکن وہ زیادہ چمکتا تھا چودھویں کے چاند کی طرح اور میں چھوٹے سے مدھم ستارے کی طرح اس کے آس پاس گھومتا رہتا۔

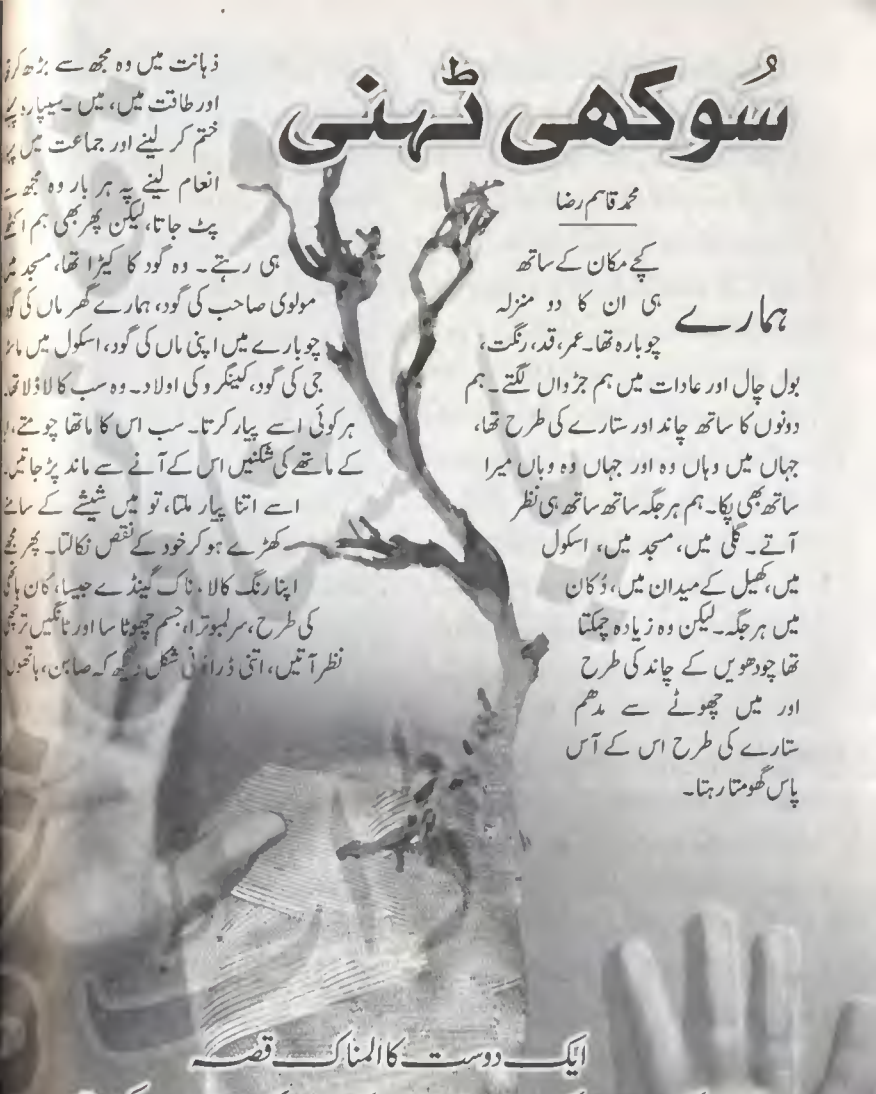

ذہانت میں وہ مجھ سے بڑھ کر تھا اور طاقت میں، میں۔ سیپارہ پڑھ ختم کر لینے اور جماعت میں پہلا انعام لینے پہ ہر بار وہ مجھ سے پٹ جاتا، لیکن پھر بھی ہم اکٹھے ہی رہتے۔ وہ گود کا کیڑا تھا، مسجد میں مولوی صاحب کی گود، ہمارے گھر ماں کی گود، چوبارے میں اپنی ماں کی گود، اسکول میں ماسٹر جی کی گود، کینگرو کی اولاد۔ وہ سب کا لاڈلا تھا۔ ہر کوئی اسے پیار کرتا۔ سب اس کا ماتھا چومتے، ابا کے ماتھے کی شکنیں اس کے آنے سے ماند پڑ جاتیں۔ اسے اتنا پیار ملتا، تو میں شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کے نقص نکالتا۔ پھر مجھے اپنا رنگ کالا۔ ناک گینڈے جیسا، کان ہاتھی کی طرح، سر لمبوترا، جسم چھوٹا سا اور ٹانگیں ترچھی نظر آتیں، اتنی ڈراؤنی شکل دیکھ کہ صابن، ہاتھوں، بازوؤں اور چہرے پر ملے جاتا تب ماں کا جوتا اُڑتا ہوا آتا اور شیشے میں نظر آنے والا جن دروازے سے باہر جا رکتا۔

اکثر وہ بھی باہر نکل رہا ہوتا، اس کی دلکش مسکراہٹ سے میری حسد کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی اور ہم بانہوں میں بانہیں ڈالے چل پڑتے۔ گلی کی نکڑ سے پیچھے دیکھتا، تو اس کی ماں دروازے کی اوٹ سے کچھ پڑھ کر پھونک رہی ہوتی۔ چوپال کے پاس گزرتے ہوئے جب لوگ ہمیں بلو اور بلی کہہ کر چھیڑتے، تو میں سوچتا کہ یہ مجھے بلو اور اسے بلی کیوں کہتے ہیں، میں یہ سن کر غصے سے سرخ ہو جاتا، لیکن وہ پھر بھی ہنستا رہتا۔ توندوالا رحیما کئی بار میرے پتھر سے بچا اور ہر بار مجھے پکڑ نہ پاتا۔ پھر زیدی اس کے ہاتھ آجاتا اور وہ کھڑے ہو کر گالیاں دیتا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ جان بوجھ کر مجھے پکڑنے کے بجائے اسے پکڑتا تھا۔ وہ بڑے عجیب طریقے سے اسے بانہوں میں جکڑ لیتا اور کہتا آجا بلو چھڑا لے اپنی بلی۔ اور میری نفرت کی شدت میں اور تیزی آجاتی۔

سارے گاؤں کی گلیاں گھوم پھر کر جب ہم شام کو واپس آتے، تو اس کی ماں ہمیشہ دروازے ہی میں کھڑی ملتی، وہ اُسے اٹھا کر ایسے چومنے لگتی جیسے کوئی گم شدہ بچہ مل گیا ہو۔ میں دل ہی دل میں کہتا، بلی کا بچہ۔ دل کرتا کہ میری ماں بھی کسی دن دروازے میں کھڑی ہو اور آتے ہی مجھے بانہوں میں اٹھا کر چومنا شروع کر دے لیکن ایسا کبھی نہ ہوا، کئی بار میں گھنٹوں گلی میں بیٹھا رہتا پھر اندھیرے سے ڈر کر خود ہی اندر چلا جاتا۔ ہوتا تو گھر میں بھی اندھیرا ہی تھا لیکن ماں کے چہرے کی روشنی سے سارے خوف دور بھاگ جاتے۔ ماں کی مسکراہٹ کی ٹھنڈک سے حسد کی تپش ختم ہو جاتی۔ ماں چولھے کے پاس ہی بٹھا لیتی اور پیار سے مکھن اور دودھ کی بالائی سے کھانا کھلاتی۔

جب زیدی کی چھوٹی سی سائیکل آئی، تو میں اس سے بھی زیادہ خوش تھا، اس نے پہلے ہی دن سائیکل چلانا سیکھ لی اور میں پورا مہینا اوپر بیٹھنے ہی سے ڈرتا رہا۔ وہ خود مجھے سائیکل پہ بٹھاتا اور ساتھ ساتھ سائیکل پکڑے سارا گاؤں گھما دیتا۔ پھر وہ مجھے پیچھے بٹھا لیتا اور ہم گاؤں کی نہر تک سیر کر آتے۔ نہر پہ جانے سے ہر کوئی ڈرتا تھا، میں پیچھے بیٹھا آیت الکرسی پڑھتا اور وہ بڑے اطمینان سے پل کی دوسری طرف جا کر برگد کا چکر لگا کر واپس ہو جاتا۔ ایک دن ماں کو پتا چلا، تو اس نے ابا کو بتا دیا۔ ابا نے عورت کی آدھی گواہی کو سب کچھ مانا اور پلنگ کے نیچے سے بید نکال کے بغیر بولے ہی سب کچھ سمجھا دیا۔ میرا خیال تھا میری چیخ پکار کے بعد چوبارے سے بھی کوئی ملتی جلتی آواز آئے گی، لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

صبح میں مار بھول چکا تھا لیکن زیدی جوہڑ سے آگے سائیکل نہیں لے کر گیا۔ پھر جوہڑ ہی ہماری سرحد تھی۔ اس کے پار جاتے ہوئے ٹانگوں میں جان ہی نہ رہتی، سائیکل جیسے رک ہی جاتی۔ اب تک مجھے بھی سائیکل چلانی آگئی تھی، جوہڑ پہ ہم باری بدل لیتے۔ مجھے بڑا غصہ آتا کہ میں تو پیچھے بیٹھ کر سارے گاؤں کی رنگا رنگ کہانیاں سناتا ہوں لیکن زیدی کی چُپ ہی ختم نہیں ہوتی۔ پھر سائیکل گر جاتی، میں اسے اٹھانے کے بجائے سائیکل اٹھا کے بھگا لیتا اور وہ پیچھے پیچھے دوڑتا۔ ایک دن پتے سے واپسی پر جہاں سائیکل خود نیچے کو اترتی تھی، میں نے چلتی سائیکل سے چھلانگ لگا دی وہ پیچھے بیٹھا تھا نہ اتر سکا، نہ رُوک سکا۔ کافی دور جا کے گرا تو اس کا سر پھٹ گیا۔ تب پہلی بار مجھے اُس پہ بہت ترس آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر سائیکل اٹھائی، وہ خاموشی سے پیچھے بیٹھا اور ہم حکیم نذیر کی دُکان پہ پہنچ

ایک دوست کا المناک قصہ

ایک روز ایک جانا پہچانا چہرہ اس کے دروازے پر کھڑا تھا

مگر اس کے ہونٹ سلے اور قدم رکے ہوئے تھے

گئے۔ وہ بوسیدہ سے برآمدے میں بیٹھے سرخ ڈاڑھی میں کنگھی کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی بولے، چوٹ تو زیدی کو لگی ہے، تو کیوں روتا ہے گلزار؟ تب مجھے پتا چلا کہ میں رو بھی رہا ہوں۔ زیدی کی پٹی ہوئی اور وہ قمیص سے میرے آنسو صاف کرنے لگا۔ آج خالہ زبیدہ اور بھی شدت سے زیدی کو چوم رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ خالہ زبیدہ ایسے ہی بید کی چھڑی سے مجھے سمجھائیں جیسے ابا اکثر سمجھاتے تھے، لیکن مجھے روتا دیکھ کر انھوں نے مجھے بھی چُپ کروانا شروع کر دیا اور میں گھر چلا آیا۔

اسکول میں ہم دونوں پہلی صف میں بیٹھتے تھے، وہ کونے پر بیٹھا ہوتا لیکن میں اسے گھسیٹ کر دوسرے نمبر پہ کر دیتا اور خود اس کی جگہ بیٹھ جاتا۔ میرا خیال تھا وہ پہلے نمبر پہ بیٹھتا ہے اس لیے ہر دفعہ پہلا انعام لیتا ہے اور اگر میں اُس کی جگہ بیٹھوں گا، تو میرا پہلا نمبر پکا۔ میں پہلے نمبر پہ آنے کے کئی منصوبے بناتا لیکن اکتیس مارچ کو یہی سوچتا کہ کاش زیدی ہوتا ہی نہ۔

ماسٹر جی اس سے بڑا پیار کرتے، اسکول جاتے ہوئے اس کی انگلی پکڑ لیتے اور میں بکری کے بچے کی طرح پیچھے پیچھے چلتا۔ سوال سمجھا کر سب سے پہلے اُسی سے پوچھتے اور ساتھ میں بھی سر ہلا دیتا۔ تفریح کے وقت اسے پاس ہی بٹھا لیتے۔ وہ زیادہ ہی معصوم تھا، شروع میں لڑکے اسے بہت تنگ کرتے لیکن پھر ماسٹر جی کے ڈر سے ہر کوئی زیدی بھائی کہتا پھرتا۔ مجھے کہیں نہ کہیں سے بلو اور بلی کی آواز آ ہی جاتی۔

ایک بار زیدی کو بخار ہو گیا۔ ماسٹر جی، حکیم صاحب کو لے کر گھر آئے اور خود دروازے پر کھڑے رہے، میں پاس کھڑا سہا سہا انھیں ایسے دیکھتا جیسے بجلی کے گیلے کھمبے کے پاس کھڑا ہوں اور چھو لیا تو جان سے گیا۔

زیدی کا گھر گاؤں کے اچھے گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ زمینیں تھیں، پنشن تھی، گھر میں خوب پیسے کی ریل پیل تھی۔ اس کے ابا کو سب لوگ چچا کہتے تھے۔ وہ ایک دن کھیتوں میں کام کرتے سانپ کے ڈسنے سے چل بسے۔ ہنستے بستے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کفن دفن سے فارغ ہوتے ہی خالہ ہر چیز سے فارغ ہو گئی۔ زمینیں دیور لے گئے۔ مکان نندیں لینے کو تھیں لیکن رو دھو کر کچھ نہ کچھ بچ ہی گیا اور پنشن۔

خالہ زبیدہ سمجھدار خاتون تھیں عدت پوری ہوتے ہی انھوں نے جمع پونجی سے دونوں بیٹیوں کی شادی کا انتظام کر دیا، بہنیں رخصت ہوئیں، تو پہلی بار میں نے زیدی کو روتے دیکھا، اسے لپٹ لپٹ کر روتے دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

شادیاں بڑی خوش اسلوبی سے ہو گئیں۔ شادی کے تیسرے دن ہم اسکول کے لیے نکلے، تو گلی کے موڑ سے گھنگھروؤں کی آوازیں آنے لگیں، چندا اپنے گروہ کے ساتھ ناچتے ہوئے گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ ماسٹر جی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے منہ سے کان لگائے ان کے گھنگھروؤں کی طرف اشارے کرتے کھڑے ہو گئے۔ وہ خالہ زبیدہ کے گھر کے آگے ناچنے لگے۔ شادی والے گھر سے یہ لوگ وداعی لینے آتے تھے اور تب تک ناچتے رہتے جب تک گھر والے کچھ دے نہ دیتے۔ ہم انھیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے کہ خالہ نے فوراً کچھ پھل، پیسے اور کپڑے دروازے کی اوٹ سے چندا کو پکڑا دیے۔ وہ واپس جانے لگے، تو ہمارے پاس رُکے۔ وہ بڑی عجیب نظروں سے زیدی کو دیکھنے لگی تو اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا ”اوئے کاکا، ہیجڑوں کے پاس کھڑے ہو کے کھسر پھسر کرنا اچھا نہیں ہوتا۔“ اس کی بات مجھے اتنی بُری لگی کہ میں نے پتھر اٹھا

لیا وہ ہمارے اردگرد جمع ہو گئے، میں نے زیدی کو کھینچا اور اسکول کی طرف دوڑ لگا دی۔ تب پہلے دن پتا چلا کہ ہم ماسٹر جی کے بغیر بھی اسکول پہنچ سکتے ہیں۔

صبح اتوار کی چھٹی تھی۔ تالیوں کی آواز سے میری آنکھ کھلی، گلی میں بہت شور تھا، باہر دیکھا، تو ہر طرف عجیب و غریب لوگ کھڑے تھے، وہ ہر بات پہ تالی ضرور بجاتے۔ پتا نہیں چلتا تھا، یہ مرد ہیں یا عورتیں۔ اچانک میری نظر چندا پہ پڑی وہ خالہ زبیدہ کے دروازے کے آگے جھولی پھیلائے بیٹھی تھی اور اس طرح کے کچھ لوگ گھنگرو باندھے ناچ رہے تھے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہ کل وداعی لے گئے تھے، آج اتنے زیادہ کیوں آ گئے۔ عورتیں چھتوں پہ منہ پہ انگلیاں رکھے پتا نہیں کیا باتیں کر رہی تھیں۔ ساری گلی میں ایسے ہی لوگ تھے، جیسے پورا محلّہ ہی ان کا ہے اور پوری دنیا پہ ان کا قبضہ ہے اور مزید ایک گھر پہ اپنا جھنڈا گاڑنے آئے ہیں۔

میں سر کھجاتا ان کے درمیان سے گزر کر گلی کے موڑ پہ گیا، تو کچھ لوگوں کے جھرمٹ میں رحیما کھڑا تھا۔ وہ تو جیسے میرا ہی منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ”بلو بچا لے اپنی بلی کو، یہ لینے آئے ہیں اسے تیسری دنیا کے لوگ۔ تو بھی چلا جا ان کے ساتھ۔ نہ وہ مرد نہ عورت۔“ وہ بیہودہ طریقے سے قہقہے لگانے لگا۔ اس کی باتوں سے میں غصے میں پاگل ہو گیا اور ہاتھ میں پکڑا پتھر، پتھر کے انسانوں سے ٹکرائے بغیر زمین پہ جا گرا۔ شاید میں بزدل تھا، زیدی کی ڈھال میں بہادر بنا پھرتا تھا۔

پہلی بار میں اکیلا ہی اسکول گیا۔ نہ زیدی، نہ ماسٹر جی۔

اسکول پہنچتے ہی آواز آئی۔

گلزار ہے..... ہیجڑے کا یار ہے۔

گلزار ہے..... ہیجڑے کا یار ہے۔

سارے لڑکے نعرے لگا رہے تھے جیسے دُونی کا پہاڑا پڑھ رہے ہوں۔ ایک پاؤں پہ وزن ڈال کر آگے کو جھکتے، میری طرف اشارہ کرتے نعرہ لگاتے اور پھر اکٹھے ہنسنے لگتے۔ ایسے لگتا جیسے کئی رحیمے اکٹھے ہو گئے ہوں۔ اور پتھر انسان سے ٹکرانے سے گھبراتا ہو۔

آج ماسٹر جی کچھ زیادہ ہی خاموش تھے، بیٹھے بیٹھے ان کی آنکھوں کی جھیل بھر جاتی۔ پھر جھیل سے رومال بھگو کر عینک کے شیشے رگڑے جاتے، بالکل ایسے ہی جیسے زیدی گلاس سے کپڑا بھگو کر سائیکل کے شیشے صاف کرتا۔

تفریح کے وقت ماسٹر جی اکیلے ہی بیٹھے رہے۔ آج ان کے پاس کوئی بھی سلیٹ، سلیٹی پکڑے نہیں بیٹھا تھا۔ میرا بڑا دل چاہا کہ وہ مجھے بلا کر پاس بٹھا لیں لیکن وہ آنکھوں کی جھیل سے کپڑا بھگوئے شیشے رگڑ رہے تھے۔

گراؤنڈ میں گیا، تو ایک لڑکا مجھے دیکھتے ہی اونچی آواز میں بولا۔

گلزار ہے......

لیکن ماسٹر جی کے ڈر سے کسی نے اس کا نعرہ مکمل نہ کیا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ یہ نعرہ پورا سنوں، دونی کا پہاڑا پھر شروع ہو جائے۔ لیکن کوئی نہیں بولا۔

اگلی صبح اسکول جانے کے لیے نکلا، تو خالہ زبیدہ کا دروازہ بند تھا، ماسٹر جی بھی دور دور تک نہیں تھے، پاس ہی شہتوت کی ایک سوکھی ٹہنی پڑی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں بھی کسی درخت کی سوکھی ٹہنی ہوں، بے کار، فضول، صرف ایندھن۔ پھر ٹہنی اٹھائی اور مٹی پہ لکیر بناتا چل دیا۔

نکڑ پہ توند والا رحیما کھڑا تھا، شاید اسے مجھ سے یا زیدی سے کوئی بیر تھا، دیکھتے ہی گردن ٹیڑھی کرتے

ہوئے بولا۔ لے جائیں گے آج تیری بلی کو بچالے اسے ورنہ اکیلا رہ جائے گا۔ میں نے پاس پڑا پتھر اٹھانا چاہا لیکن چاہتے ہوئے بھی نہ اٹھا سکا۔ میں بڑے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا کہ اچانک کسی بدبو کے پہاڑ سے ٹکرا گیا، جیسے کوڑے کے ڈھیر میں سر آ گیا ہو۔ وہ چندا تھی، تالی بجاتے ہوئے کہنے لگی اندھے ہو اور اس کے سارے چیلے کچھ بڑبڑانے لگے، میں منہ اُٹھائے اسے دیکھتا رہا، اس نے سوکھی ٹہنی میرے ہاتھ سے چھینی اور ایک طرف دھکا دے کے چل پڑی۔

گلزار ہے..... ہیجڑے کا یار ہے

اسکول پہنچتے ہی دونوں طرف لڑکوں کی قطار بن گئی۔ جیسے میرا استقبال ہو رہا ہو، جیسے سب مجھ پہ پھول پھینک رہے ہوں۔ دونی کا پہاڑا شروع ہو گیا اور میں قمیص کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، گردن جھکائے کمرے تک پہنچ گیا۔

پتا نہیں کب ماسٹر جی آئے۔

گلزار آج پیچھے کیوں بیٹھے ہو؟

میں نے بڑی حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں سب سے پیچھے دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔

اپنی جگہ پہ آؤ۔ ماسٹر جی نے رومال سے عینک رگڑتے ہوئے کہا۔

میں زیدی کی جگہ چھوڑ کر بیٹھ گیا۔

پھر ماسٹر جی جھیل کنارے بیٹھ گئے اور میں بھیگے صفحے بدلتا رہا، ماسٹر جی شیشے رگڑتے اور مجھے کوئی دیکھتا، تو میں کتاب میں منہ چھپالیتا۔

تفریح ہوئی، تو میں نان نکی والے جھونپڑے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اندر کوئی بات ہو رہی تھی۔

شروع ہی سے ایسے ہو رہا ہے، وہ ہیجڑے کو لے جاتے ہیں۔ نہیں چھوڑتے۔

دوسرا شخص بولا۔ تو جس ماں نے جنا، پالا پوسا، اس کا کوئی حق نہیں؟

کیا کرے گی وہ گھر میں رکھ کے، ناچنا تو سکھا نہیں سکتی، کب تک رکھے گی وہ سوکھی ٹہنی۔

پھر دوسرا بولا۔ لیکن یار انھیں پتا کیسے چلا کہ ان جیسا یہاں بھی رہتا ہے۔

اس کی بہنوں کی شادی تھی نا، اور یہ لوگ بھی آئے تھے، بس دیکھ لیا انھوں نے۔ یہ پہچان لیتے ہیں اپنی برادری کو دور ہی سے۔

ویسے بڑا ظلم کیا چودھری نے، اپنا ہی بھتیجا ہیجڑوں کو دے دیا۔ چچا زندہ ہوتا، تو کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی اس گھر کی طرف آنکھ بھی اٹھانے کی۔ ماں بچارا روتی رہ گئی اور سارے محلے کی عورتیں ایسے رو رہی تھیں جیسے کسی نے ان کا اپنا بیٹا چھین لیا ہو اور زیدی تو بے ہوش ہی ہو گیا تھا۔

میں کتاب میں منہ چھپائے کلاس کی طرف چلا گیا اور ماسٹر جی کے پاس جھیل کنارے بیٹھ گیا۔

کیا کوئی ناچنے کے لیے بھی دنیا میں آتا ہے، یہ کیا بات ہوئی کہ ساری عمر ناچتے ہی رہو۔ شاید یہاں ہر کوئی ناچ رہا ہے، کوئی پیسے کے لیے، کوئی شہرت کے لیے، کوئی نام بنانے کے لیے، کوئی نوکری کے لیے، کوئی ترقی کے لیے اور جسے سب کچھ مل گیا وہ خوشی سے ناچے جا رہا ہے۔ بس طریقے جدا جدا ہیں اور بدنام گھنگھرو والے۔

خالہ زبیدہ کو تیز بخار تھا۔ ماسٹر جی، حکیم صاحب کو لے آئے۔ آج حکیم صاحب کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئیں تھیں۔ جیسے خوب روئے ہوں۔ آج ماسٹر جی اندر آ گئے۔ گیلا رومال آنکھوں کی آبشار روکنے کی کوشش میں تھا لیکن جو پانی دل میں بنے دکھوں کے ذخیرے سے آتا ہو اسے کپڑے کا ٹکڑا کیسے روک سکتا ہے۔

گلزار بیٹا یہ تین پُڑیاں دو دو گھنٹے بعد کھلا دینا اور ... کی پٹیاں کرتے رہنا۔ یہ کہتے کہتے رومال حکیم ... کی آنکھوں تک چلا گیا۔ خالہ زبیدہ کا ماتھا آگ ... طرح تپ رہا تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ۔ ... کی ٹھنڈی پٹی، آگ میں پڑے لوہے کی طرح گرم ... جاتی۔ میں پٹیاں بدلتا رہا لیکن آگ بڑھتی گئی۔

مجھے ایسے لگا جیسے خالہ زبیدہ ہی میری ماں ہے اور ... شروع سے چوبارے میں رہتا ہوں اور ٹھنڈی ... کرنا میرا ہی کام ہے۔

وہ کچھ بول رہی تھیں۔

ظالموں کو خود ہی میرا اللہ پوچھے گا۔ ماں کو بیٹے ... جدا کر دیا۔ کیسے رہے گا وہ میرے بغیر۔ پتا نہیں ... کھایا بھی ہوگا اس نے۔ پتا نہیں سویا بھی ہوگا کہ ...

تو کیوں روتا ہے گلزار! انھوں نے ہاتھ اٹھانے کی ... کی۔

میں نے بازو سے اپنے آنسو صاف کیے اور ... سے بہتی آبشار روکنے لگا۔ گرم پانی، اُبلتا ہوا۔ ... تھا ماں میں تجھے حج کراؤں گا۔ کہتا تھا جب ... کہ بڑا افسر بن جاؤں گا، تو شہر میں کوٹھی ہوگی ... شہر کی طرح اپنے گاؤں کی گلیاں بھی پکی کرا ... گا۔ ماں کتنا کیچڑ ہوتا ہے نا برسات میں۔ گاڑی ... میں گے اور بہنوں کے پاس بھی اپنی گاڑی پہ ... گے۔ گلزار بڑی مشکل سے گاڑی چلانا سیکھے گا۔ ... تمام مجھے یہ ستارے ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ... جہاز پہ جاؤں گا انھیں دیکھنے۔ وہ آنسوؤں میں ... لفاظ کہتی گئیں۔

یوں روتا ہے گلزار۔ کانپتے ہوئے گرم ہاتھ ... آنسو صاف کرنے لگے۔

ٹھنڈی پٹیوں سے دل کے پھوڑے پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ غم کی تپش برف سے کم نہ ہوئی۔ کہنے لگیں سو جاؤ بیٹا کچھ نہیں ہوتا۔

ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ اذان کے ساتھ اٹھتے ہی میں نے خالہ کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔ برف کی طرح ٹھنڈا۔ بخار چلا گیا، لیکن جاتے جاتے سانس بھی ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے ہاتھوں سے ان کی آنکھیں بند کیں اور اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں پھوٹ پڑیں۔ اب کوئی گرم ہاتھ آنسو صاف کرنے نہ آیا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے خالہ زبیدہ نہیں بلکہ میری ماں ہی دنیا چھوڑ گئی۔

ماں اپنے بیٹے سے ایک رات بھی جدا نہ رہ سکی۔ میں نے چوبارے سے ماں کو بلانا چاہا، منہ سے صرف یہی نکلا ماں! اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اونچی آواز میں۔ جیسے ابا نے بانس پکڑا ہو اور میں بچنے کے لیے آہ و بکا کر رہا ہوں۔ پھر پوری گلی میں بین شروع ہو گیا۔

امتحان نزدیک تھے اب سارا دن اسکول میں گزر جاتا۔ آتے ہوئے شام ہو جاتی اور ماں کھانا کھلا کر سلا دیتی۔ پرچے ہوئے اور اکتیس مارچ بھی آ گئی۔ اس دن میں اور زیدی عید کے کپڑے پہن کر گھر سے نکلتے، بھاگتے، رکتے، چلتے، گرتے میں بانہیں ڈالے اسکول پہنچ جاتے۔ لیکن اس بار میں اور شہتوت کی سوکھی ٹہنی، مٹی پہ لکیر بناتے اسکول پہنچ گئے۔

مجھے پہلا اِنعام دیتے ہوئے ماسٹر جی کے ہاتھ کانپے اور پھر وہ عینک رگڑنے لگے، لیکن کانپتے ہاتھ عینک نہ سنبھال سکے اور وہ گر کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ بالکل ان کے دل کی طرح۔

میرا بڑا دل کرتا تھا کہ پہلے نمبر پر آؤں لیکن آج مجھے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ ہر سال دوسرا انعام ملتا، تو اسکول ہی میں کھول لیتا لیکن اس بار چمکتے کاغذ کو ہاتھ لگانے کو

بھی دل نہ کیا۔ ماسٹر جی کی عینک ٹوٹ گئی تھی۔ انھوں نے ایک ہاتھ میں سوکھی ٹہنی پکڑی اور دوسرا ہاتھ مجھے دیا۔ وہ بار بار رُک کر اپنی جھیل جیسی آنکھوں میں رومال بھگوتے لیکن عینک رگڑ کے ڈر سے ٹوٹ چکی تھی۔ رکنے سے ٹہنی کی لکیر ٹوٹ جاتی، تب ان کی باتیں دل کی لکیر جوڑنے کی کوشش کرتیں۔ رومال بھگوتے ہوئے کہنے لگتے، اگر کسی میں خامی ہو تو اسے گندگی کے ڈھیر پہ پھینک دیتے ہیں! اگر اس میں کوئی کمی تھی تو اللہ نے خوبیاں بھی بے شمار رکھی تھیں، کیوں ہم اسے وہاں پہنچنے سے روک نہ سکے؟ اتنے قابل بچے کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ پڑھ لکھ کے دنیا کا قابل ترین انسان بن سکتا تھا، لیکن ہم نے اسے آگ میں جھونک دیا۔ کیوں نہیں ہم اس قابل ہوئے کہ اسے لے آئیں پھر کتابوں والی، خوشبوؤں والی، اپنوں والی زندگی میں۔

میرا بڑا دل کرتا تھا کہ زیدی کی طرح کبھی میں بھی ماسٹر جی کی انگلی پکڑ کے جاؤں لیکن آج میں دور بھاگنا چاہتا تھا، بہت دور۔

ماسٹر جی کو گھر چھوڑ کر میں سیدھا چندا کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ جوہڑ کے پاس تھا، گاؤں کے باہر۔ چندا مجھے اندر ہی لے گئی، صحن میں کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔ ببلی۔ دیکھ باہر کون آیا ہے اس کے منہ سے زیدی کا اُلٹا نام سن کے میں پتھر ڈھونڈ رہا تھا کہ زیدی مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ کیوں آیا یہاں، گندی جگہ ہے یہ۔ اور وہ رونے لگا۔

میں نے چمکتے کاغذ میں بند پہلا انعام اسے تھمایا اور چپکے سے واپس چل دیا۔

گلزار رُک۔ ایک مانوس سی آواز آئی۔

وہ سرخ امرود کی ٹوکری پکڑا کر کہنے لگا۔ جاتے جاتے ہی کھا لینا۔

سرخ امرود صرف چندا کے گھر ہی لگتے تھے، گاؤں میں کوئی نہیں کھاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے جس نے چندا کے سرخ امرود کھا لیے وہ نامکمل ہو جائے گا۔ اس کے امرود فقیر کھاتے تھے یا اجنبی۔ گاؤں پہنچا تو چوپال کے آگے رحیما بیٹھا تھا۔ وہ بولے بنا نہ رہ سکا۔

لے آیا اپنی ببلی کے امرود۔ اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک امرود پکڑ کر پورے زور سے مارا، وہ آنکھ پکڑ کے بیٹھ گیا۔ آج نہ میں بھاگا اور نہ اس نے کسی کو پکڑا۔

چوبارہ خالی ہو گیا۔ ابا نے بانس نکالنا چھوڑ دیا۔ زیدی کی سائیکل ہمارے جامن کے نیچے کھڑی تھی زنگ آلود، مٹی سے بھری۔ جب کبھی ماں اسے اِدھر اُدھر کرتی وہ چیخنے لگتی، کراہتے ہوئے بیمار کی طرح، شاید بچھڑے ہوئے اپنوں کی یاد میں۔

ماسٹر جی دیر سے اسکول آنے لگے، دونی کے پہاڑے کے بعد۔ عینک رگڑنے سے دھیان ہٹتا، تو کبھی کبھی مجھے اگلی صف میں بیٹھنے کا کہہ دیتے۔ عینک ریزہ ریزہ ہوتی ہی رہتی، پھر میں اور شہتوت کی سوکھی ٹہنی ماسٹر جی کو پکڑے گھر چھوڑ آتے۔ جہاں ٹہنی کی لکیر ٹوٹتی وہاں ماسٹر جی کی باتیں ایک اور لکیر بنا دیتیں۔

ہر اکتیس مارچ کو چمکیلے کاغذ میں لپٹی کوئی چیز زیدی کو مل جاتی اور واپسی پہ میرے ہاتھ میں سرخ امرود کی ٹوکری ہوتی۔ رحیما چھت سے گر کر اپنی زبان کھو بیٹھا تھا، وہ چوپال کے آگے بیٹھا ہوتا۔ جاتے جاتے کچھ امرود میں اس کی جھولی میں ڈال دیتا اور وہ ہر بار کچھ کہنے کی ناکام کوشش کرتا۔

دسویں کے بعد ماسٹر جی شہر جا کر مجھے کالج میں داخل کروا آئے۔ ابا جی ریٹائر ہو گئے لیکن سائیکل کو دوسری سواری مل گئی۔ باپ کے بعد بیٹا۔ یہ ابا کا رازدار تھا سارے راستے مجھے ان کی کہانیاں سناتا اور میں کالج

پہنچ جاتا۔ کالج میں کوئی دونی کے پہاڑے والا نہ تھا، لیکن مجھے ایسا ہی لگتا جیسے یہاں سب مجھے جانتے ہیں۔ سب سے پچھلی کرسی میری ہوتی، چاہے سارا کمرا خالی ہو۔

شاید میں صرف زیدی ہی کو دوست بنانا جانتا تھا یا زیدی نے مجھے دوست بنایا تھا، اس کے بعد میرا کوئی دوست نہ بنا۔ چار سال پچھلی کرسی ہی پہ گزر گئے۔ ایم۔اے میں تو لڑکیاں بھی ساتھ آگئیں۔ پھر ساری جماعت دو، دو ہو گئی لیکن میں پھر بھی اکیلا ہی رہا۔

گاؤں کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر بن کر گیا، تو پہلے دن مجھے اسمبلی میں اسٹیج پر بلایا گیا۔ سامنے بچوں کی قطاریں تھیں اور چاروں طرف خزاں رسیدہ درخت۔ میرے ہاتھ میں عینک تھی جو آنکھوں کی جھیل میں بھیگے رومال سے رگڑ کھا رہی تھی، پھر وہ میرے پاؤں پڑی اور ریزہ ریزہ ہو گئی۔ کسی نے شہتوت کی سوکھی ٹہنی میرے ہاتھ میں دی اور میں مٹی پہ لکیر بناتا دفتر پہنچ گیا۔ اسی طرح ایک دن میں گھر پہنچا، تو ماں نے میرا ہاتھ کسی کے آگے کر دیا، انگوٹھی نے مجھے جکڑ لیا، ماں کو مبارک، خیر مبارک ہونے لگی۔

کئی سال بعد بھی میں گھر سے نکلتا، تو زبیدہ خالہ کے گھر کی طرف نگاہ ضرور جاتی، لیکن اب زیدی نہ نکلتا۔ وہاں چودھری بیٹھا دونوں ہاتھ سر پہ رکھے دیمک زدہ دروازے کو دیکھتا رہتا۔ لوگ کہتے تھے جوان بیٹے کی موت نے اسے پاگل کر دیا ہے۔

چوبارہ تب سے خالی پڑا تھا، لوگ جھگی میں رہنا منظور کر لیتے تھے لیکن چوبارے میں کوئی رات بھی گزارنے کو تیار نہ تھا۔ کسی نے مشہور کر دیا تھا، جو یہاں رہے گا اس کی اولاد نامکمل ہو گی۔ جیسے زیدی۔

برسات کے دن تھے۔ بارش جم کے برس رہی تھی، جیسے گاؤں سے برسوں پرانا کوئی انتقام لینے آئی ہو۔ گلی میں بکھری اپنی دیوار کی اینٹیں اکٹھی کر رہا تھا کہ گاؤں کا پٹواری آ گیا۔ اس نے چمکیلے کاغذ میں لپٹی کوئی چیز دی اور چلا گیا۔ یہ چوبارے کی رجسٹری تھی اور ساتھ ایک صفحے پر یہ الفاظ۔

گلزار! ماں تجھے بھی اپنا بیٹا سمجھتی تھی۔ اگر ایک بیٹا وہاں رہنے کے قابل نہیں، تو دوسرا تو ہے نا۔ ماں کا گھر اجڑنے نہ دینا۔ مجھے پتا ہے تیری دیوار گر گئی ہے اور مکان کی حالت بھی نازک ہے۔ تیز بارشوں میں کچے مکان سے یونہی ہوتا ہے۔ اگر تو مجھے اپنا بھائی نہیں تو دوست ہی سمجھ لے اور آج ہی سامان اٹھا کہ چوبارے میں چلا جا۔

چوبارے کا دروازہ کھلتے ہی چودھری چیخنے لگا۔ وہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا بھاگا اور بکھری اینٹوں میں گر گیا۔

چوبارہ بالکل ویسا ہی تھا، ایسے جیسے یہاں سے ابھی ابھی کوئی گیا ہو۔ یہاں باہر کی برسات کا کوئی ڈر نہیں تھا، لیکن اندر کی برسات رکنے کا نام نہ لیتی۔ کئی بار میری بیوی پوچھتی کہ آپ رو کیوں رہے ہیں۔ پھر میں بہتے آنسو روکنے کی کوشش کرتا۔ عینک رگڑ کے ڈر سے گرتی اور ریزہ ریزہ ہو جاتی۔

ایک دن میں اسکول سے آیا، تو ماں نے سینے سے لگا لیا۔ تو باپ بنا ہے۔ ماں نے گول مٹول، سرخ رخساروں والا نرم و نازک سا احساس میری بانہوں میں بھر دیا۔ وہ بالکل اس کی طرح تھا، آنکھیں چھلک پڑیں اور اچانک منہ سے نکلا۔ زیدی۔ اور میں نے اسے چوم لیا۔

دروازے پہ گھنگھروؤں کی چھن چھن اور تالیوں کی گونج کا شور اُٹھا۔ پھر دروازہ کھلا کوئی پہچانا سا چہرہ تھا لیکن بدلا ہوا، آنکھوں کی جھیل بھر گئی، عینک کے شیشے رگڑ کے ڈر سے گرے اور شکستہ دل کی طرح بکھر گئے۔ زبان کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہونٹ سل گئے۔ میں اس کی بانہوں میں بانہیں ڈالنا چاہتا تھا لیکن اٹھے ہوئے ہاتھ آنکھوں پہ جا ٹھہرے، آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر چلتے قدم رُک گئے۔ لیکن بہتے آنسو نہ رُکے۔

○○○

جاسوسی کہانی

نارنگی کے پانچ بیج

بیجوں والے ایک خط کا حیران کن ماجرا
وہ جسے ملتا، زندگی اس سے روٹھ جاتی شرلاک ہومز اور
ڈاکٹر واٹسن کا واسطہ تین بے رحم قاتلوں سے پڑ گیا تھا

سر آرتھر کانن ڈائل

سردی شروع ہوتے ہی لندن میں جھکڑ چلنے لگے۔ چونکہ میری بیگم اپنے والدین کے پاس گئی ہوئی تھی لہٰذا میں اپنے پرانے دوست شرلاک ہومز کے پاس چلا آیا۔ ہم رات کو اکٹھے کھانا کھاتے اور گپ شپ لگاتے۔

اس دن بھی شام کو تیز ہوا چلنے لگی۔ جلد ہی سیاہ بادل گھر آئے اور بارش ہونے لگی۔ میں اور ہومز موسم کا مزہ لینے لگے۔ اچانک گھر کی بیل بجی اور ہم چونک گئے۔ میں نے ہومز سے کہا: ''ایسے خراب موسم میں کون آسکتا ہے؟ شاید تمھارا کوئی دوست؟''

ارے ڈاکٹر، تمھارے سوا میرا کوئی دوست نہیں۔ میں مہمانوں کی اِتنی حوصلہ افزائی نہیں کرتا کہ وہ میرے گھر چلے آئیں۔ لگتا ہے، مالکہ مکان کا کوئی مہمان ہے۔''

مگر ہومز کا اندازہ غلط نکلا۔ آنے والا ہمارا ہی مہمان تھا۔ وہ بیس بائیس سالہ خوش پوش نوجوان تھا۔ انداز و اطوار سے مہذب پن اور شائستگی عیاں تھی۔ اس نے برساتی اُتاری تو نیچے سے نفیس لباس برآمد ہوا۔ ہاتھ میں چھتری تھی۔

نوجوان کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔ وہ ہم سے معذرت کرتے ہوئے بولا ''مجھے اعتراف ہے کہ آپ کے آرام میں مخل ہوا اور مجھے فکر ہے کہ میرے جوتوں کے ذریعے بارش کی کچھ نشانیاں یہاں بھی چلی آئی ہیں۔''

ہومز نے کہا ''اپنی برساتی اور چھتری مجھے دو۔ میں انھیں ٹانگ دیتا ہوں تاکہ جلد سوکھ جائیں۔ کیا تم جنوبی علاقے سے آرہے ہو؟''

''جی ہاں، میرا تعلق ہورشام قصبے سے ہے۔'' نوجوان حیرت سے بولا

''دراصل تمھارے جوتوں پہ چاک اور مٹی لگی ہے۔ اسی باعث میں جان گیا۔ بتائیے، آپ کیوں تشریف لائے؟''

''مسٹر ہومز! میں آپ سے مدد لینے آیا ہوں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ فن سراغ رسانی میں طاق ہیں۔''

''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ مجھے ناکامی بھی ملتی ہے، بس اس کی شرح کم ہے۔ آپ تشریف رکھیے اور اپنا مسئلہ بتائیے۔''

نوجوان قریب پڑی کرسی پہ بیٹھ گیا اور بولنے لگا ''میرا نام جان اوپن شا ہے۔ میں ایک خاندانی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اس کے متعلق تفصیل سے بتاتا ہوں۔

''میرے دادا کے دو بیٹے تھے، چچا الیس اور میرے والد جوزف۔ میرے والد نوجوان ہوئے، تو انھوں نے سائیکل بنانے کی فیکٹری کھول لی۔ خدا نے انھیں ترقی دی اور ان کا کاروبار پھیل گیا۔ پانچ سال قبل انھوں نے اپنی فیکٹری بیچ ڈالی۔ جو رقم ملی اسی کے ذریعے اطمینان سے فراغت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

''میرے چچا جوانی میں امریکا چلے گئے تھے۔ وہاں ریاست فلوریڈا میں زمین لی، فارم کھولا اور خوشحال زندگی گزارنے لگے۔ جب امریکی خانہ جنگی کا آغاز ہوا، تو وہ کنفڈریٹ فوج کی طرف سے لڑے اور کرنل کے عہدے تک پہنچے۔

1869ء میں انھوں نے اپنی زمینیں فروخت کیں اور واپس انگلستان چلے آئے۔ یہاں ہورشام میں بھی انھوں نے زمینیں خریدیں اور چھوٹے زمیندار کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگے۔

''چچا الیس درشت مزاج اور غصہ ور آدمی تھے۔ اسی لیے قصبے میں ان کی کسی سے نہ بن سکی۔ فارم میں کام کرنے والے کسان بھی اپنے کام سے کام رکھتے۔ میرے والد بھی ان سے گھل مل نہ سکے، بس خیریت دریافت کرکے اپنی راہ لیتے۔

''لیکن چچا مجھ سے جلد مانوس ہوگئے۔ والد کے ساتھ جب بھی ان کے گھر جاتا، تو وہ مجھے مٹھائی، بسکٹ یا بچوں کی دیگر پسندیدہ اشیا کھلاتے۔ اس باعث میں بھی انھیں پسند کرنے لگا۔ جب گیارہ بارہ سال کا ہوا، تو والد کی اجازت سے ان کے پاس رہنے آجاتا۔ ہم پھر تاش، لڈو اور شطرنج کھیل کر دل بہلاتے۔

''رفتہ رفتہ میں گھر اور فارم میں ان کا نائب بن گیا۔ تاہم مجھ سمیت تمام ملازموں کا ایک کمرے میں جانا منع تھا۔ وہ کمرا طویل عرصے سے بند تھا اور وہاں کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ میں نے دو تین بار چابی والے سوراخ سے اندر جھانک کر دیکھا، تو مجھے کاغذات کے ڈھیر ہی نظر آئے۔

ایک دن چچا کو پونڈیچری، ہندوستان سے ایک خط موصول ہوا۔ انھیں غیر ممالک سے خطوط آتے رہتے تھے۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان سے خط آیا تھا۔ انھوں نے بے تابی سے خط کھولا۔ میں بھی ان کی میز کے قریب کھڑا تھا۔

''خط کے اندر سے کاغذ نہیں مالٹے کے پانچ بیج برآمد ہوئے۔ یہ دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن جب چچا کے چہرے پہ نگاہ ڈالی، تو اس پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ مجھے بہت پریشان اور خوفزدہ نظر آئے۔ انھوں نے لفافے کی پشت دیکھی، تو پکار اُٹھے ''کک۔ کے۔ کے...... اُف اب مجھے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔''

''میں نے گھبرا کر ان سے پوچھا ''چچا! یہ کیا ہے؟''

''موت!'' وہ میز پر سے اٹھتے ہوئے بولے اور مردہ قدموں سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے خط اٹھا کر دیکھا، پشت پر سرخ قلم سے ''کے۔کے۔کے'' درج تھا۔ پانچ بیجوں کے علاوہ خط خالی تھا۔ نجانے کیوں چچا اتنے خوفزدہ ہوگئے تھے؟

''کچھ دیر بعد میں نے چچا کو سیڑھیوں سے نیچے آتے دیکھا۔ انھوں نے ہاتھ میں پرانی سی چابی تھام رکھی تھی۔ یقیناً اسی بند کمرے کی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ایک خاصا بڑا چوبی منقش ڈبا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے ''میری سنو، میرے کمرے کا آتش دان جلا دے اور میرے وکیل، فورڈ ہیم کو پیغام بھجواؤ کہ وہ مجھ سے مل لے۔''

''میں نے حکم کی تعمیل کی۔ جلد ہی فورڈ ہیم آپہنچا۔ میں اسے لیے چچا کے کمرے میں پہنچا۔ آتش دان میں آگ خوب بھڑک رہی تھی۔ بڑی تعداد میں سیاہ وسفید راکھ دیکھ کر احساس ہوا کہ اس میں سیکڑوں کاغذ جلائے گئے ہیں۔ خالی چوبی ڈبا کھلا پڑا تھا۔ تبھی مجھے اس پر ''کے۔کے۔کے'' کے لفظ کھدے نظر آئے اور میں چونک گیا۔

''چچا مجھے مخاطب کرکے بولے ''جان! میں تمھیں اپنی وصیت کا گواہ بنا رہا ہوں۔ میں نے اپنی ساری جائداد اپنے بھائی یعنی تمھارے والد کے نام کردی ہے۔ وہ پھر لامحالہ تمھیں ہی ملے گی۔ لیکن اس جائداد کے ساتھ خطرہ بھی وابستہ ہے۔ اگر تم خطرے کا مقابلہ نہ کرسکے، تو جائداد دشمن کے حوالے کردینا۔ اب وصیت پر دستخط کردو۔''

''میں نے کاغذات پر دستخط کردیے۔ وکیل فورڈ ہیم انھیں لے کر چلا گیا۔ اس انوکھے واقعے نے مجھے حیرت اور تشویش میں مبتلا کردیا۔ میں کئی دن اس پر غور کرتا رہا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکال سکا۔ اُدھر چچا کچھ بتانے کو تیار نہ تھے، میں کرید کرید کر تھک گیا۔

''چچا پہ البتہ یہ اثر ہوا کہ وہ مزید تنہائی پسند ہوگئے اور شراب پینے لگے۔ کبھی کبھی نشے کی حالت میں کمرے سے برآمد ہوتے اور واہی تباہی بکنے لگتے۔ اگر میں نہ ہوتا، تو یقیناً فارم کا سارا کام تباہ ہوجاتا۔ ایک بار وہ ریوالور تھامے گھر سے نکل گئے۔ میں بڑی مشکل سے انھیں قابو کرکے واپس لایا۔ مگر جب وہ ہوش و حواس میں ہوتے، تو بہت خوفزدہ رہتے۔ ان کا نیم مردہ چہرہ دیکھ کر لگتا جیسے موت سامنے کھڑی ہے۔

''خیر مسٹر ہومز، میں اختتام کی طرف آتا ہوں۔ ایک رات وہ نشے کے عالم میں گھر سے نکلے، تو زندہ واپس نہ آئے۔ تلاش پر ان کی نعش ایک تالاب میں پائی گئی۔ چونکہ بدن پہ تشدد کے آثار نہ تھے، لہٰذا پولیس نے اِسے خودکشی کا کیس قرار دے کر بند کردیا۔ لیکن مجھے شک تھا کہ یہ خودکشی کا معاملہ نہیں، بلکہ شاید وہ ڈوب کر ہلاک ہوئے۔

''بہرحال چند دن میں واقعے پر وقت کی گرد جم گئی۔ والد نے بھائی کی جائداد کا انتظام بھی سنبھال لیا اور میں ان کا نائب بن گیا۔''

اچانک ہومز بولا: ''ایک لحظہ رکیے۔ اب تک آپ کا بیان دلچسپ اور حیران کن ہے۔ یہ بتائیے آپ کے چچا کو خط کب موصول ہوا؟''

نوجوان نے بتایا ''انھیں خط 10 مارچ 1883ء کو ملا۔ اسی کے سات ہفتے بعد 2 مئی کی رات وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔''

''شکریہ! اپنا بیان جاری رکھیے۔''

جائداد ہمیں ملی، تو میں نے بند کمرا کھلوایا۔ اس میں سے چوبی منقش ڈبا برآمد ہوا۔ اب اُسے غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اندرونی حصے پر مجھے قلم سے ''خطوط، یادداشتیں اور رجسٹر'' کے الفاظ کھدے نظر آئے۔ گویا ڈبے میں یہ اشیا موجود تھیں۔

''کمرے میں مختلف اقسام کے کاغذات بکھرے تھے۔ ایک ورق کے سوا ان سے کوئی کام کی شے نہ ملی۔ بہرحال کچھ عرصے بعد میرے والد بھی اپنے بھائی کے گھر چلے آئے جو زیادہ آرام دہ اور قصباتی شور غل سے دور آباد تھا۔

''ہمیں سکون سے رہتے ہوئے ایک سال ہی گزرا تھا کہ 4 جنوری 1885ء کو ایک دھماکا ہوگیا۔ ہوا یہ کہ والد صاحب کھانے سے فارغ ہوئے، تو اس دن آئے خط کھولنے لگے۔ میں اپنے کمرے میں تھا۔ اچانک مجھے والد کی چیخ سنائی دی۔ میں بھاگ کر ان کے پاس پہنچا۔ دیکھا کہ ایک ہاتھ میں کھلا خط موجود ہے، تو دوسرے کی ہتھیلی پر مالٹے کے پانچ بیج پڑے تھے۔ وہ حیرت سے انھیں گھور رہے تھے۔

''میں نے انھیں بتایا تھا کہ چچا کو بھی مالٹے کے پانچ بیج ملے تھے۔ اس پہ انھوں نے مجھے ہنسی ٹھٹھے کا نشانہ بنایا۔ اب وہ خود بیج پاکر متعجب اور کچھ خوفزدہ تھے۔

''انھوں نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا ''جان! یہ کیا ہے؟''

''میں نے پوچھا اندر دیکھیے، کیا کسی کاغذ پر کے۔کے۔کے درج ہے؟''

''خط کے اندر سے ایک پرچہ برآمد ہوا جس پر واقعی کے۔کے۔کے لکھا تھا۔ مگر نیچے یہ بھی درج تھا کاغذات شمسی گھڑی (Sundial) کے اوپر رکھ دو۔

''والد نے دریافت کیا'' کون سے کاغذات اور شمسی گھڑی، یہ کیا ہے؟

''میں نے بتایا: شمسی گھڑی باغ کے پچھواڑے میں موجود ہے۔ جبکہ کاغذات وہی ہوں گے جو چچا نے جلا ڈالے تھے۔ وہ تو نابود ہوچکے۔''

''کہنے لگے: لگتا ہے، کسی نے مذاق کیا ہے۔ ورنہ میرا اُن دیکھے کاغذات اور شمسی گھڑی سے کیا تعلق؟ یہ بتاؤ، خط کہاں سے آیا ہے؟''

''خط پرڈینڈی (شہر) کی مہر لگی ہے۔''

''میں نے بتایا اور پوچھا ''اچھا اس معاملے کی خبر پولیس کو دی جائے؟''

''نہیں نہیں، میں پولیس کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تم اس خط کو مذاق سمجھ کر بھول جاؤ۔''

''ناچار مجھے سرِتسلیم خم کرنا پڑا۔ چار دن بعد وہ اپنے ایک دوست سے ملنے گئے جو پہاڑی قصبے میں رہتا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وہاں جاکر ان کا دھیان پانچ بیجوں سے بٹ جائے گا۔ لیکن میں غلطی پر تھا۔

''تیسرے دن مجھے ان کے دوست، میجر فریبون کا تار ملا۔ معلوم ہوا کہ والد پہاڑ پر سیر کرنے گئے تھے کہ پھسل کر کھائی میں جا گرے اور شدید زخمی ہوگئے۔ میں فوراً پہاڑی قصبے پہنچا لیکن اس سے قبل ہی والد دنیا چھوڑ چکے تھے، مجھے بڑا صدمہ پہنچا۔

''میں نے بہت کوشش کی کہ والد کی موت کو قتل قرار دے سکوں، مگر کوئی ٹھوس ثبوت حاصل نہ کرسکا۔ پولیس نے پھر اسے حادثاتی موت قرار دے کر کیس بند کردیا۔ وجہ یہی ہے کہ جائے حادثہ پر کسی قسم کی دھینگا مشتی، تشدد، چوری وغیرہ کے آثار نہ تھے۔ پھر بھی میرا دل یہی کہتا رہا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

یوں اس المیے کے بعد میں نہ صرف والد بلکہ چچا کی جائداد کا بھی مالک بن گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چچا اور والد کی اموات غیر فطری ہیں۔ میں ان کے پیچھے چھپا بھید جاننا چاہتا تھا۔ اسی لیے ہورشام ہی میں مقیم رہا۔

''جنوری 1885ء میں والد کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کے بعد اڑھائی سال گزر گئے اور میں ہورشام میں خیر و عافیت سے مقیم رہا۔ میں نے یہ عرصہ سکون سے گزارا حتیٰ کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے خاندان سے چمٹی لعنت دور ہو چکی۔ لیکن گزشتہ دن ایک اور دھماکا ہوا جس سے میں ہل کر رہ گیا۔''

یہ کہہ کر پراگندہ حال نوجوان نے اپنے کوٹ میں ہاتھ ڈالا، خط نکالا اور اُسے میز پر کھول دیا۔ اندر سے پانچ بیج میز پر آ رہے۔ انھیں دیکھتے وہ بولا: ''خط میں ایک سے پرچہ برآمد ہوا، اسی پہ وہی پرانا جملہ درج تھا۔ کے۔ کے۔ کے..... کاغذات شمسی گھڑی پہ ڈال دو۔ یہ خط مشرقی لندن سے آیا ہے۔''

ہومز نے پوچھا: ''تم نے کیا قدم اُٹھایا؟''

''کچھ نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

نوجوان نے پریشانی کے عالم میں سر تھام لیا اور بولا ''سچی بات یہ ہے کہ میں خود کو مجبور و بے کس محسوس کرتا ہوں۔ لگتا ہے میں کمزور خرگوش ہوں جو قوی سانپوں کے نرغے میں آ چکا۔ اب کوئی شیطانی قوت آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہی ہے اور میں بدنصیب اسی کا چارہ بن کر رہوں گا۔''

''ارے جناب، حوصلہ مت ہاریئے۔ آپ کو فوری اقدام کرنا چاہیے ورنہ بچنے کی اُمید جاتی رہے گی۔ یہ ماتم نہیں جوش و جذبہ دکھانے کا وقت ہے۔'' ہومز تیزی سے بولا

''میں تھانے بھی گیا تھا۔''

''پھر؟''

''پولیس والوں نے مُسکراتے ہوئے میری کہانی سُنی۔ انسپکٹر کو یقین تھا کہ کوئی میرے ساتھ عملی مذاق کر رہا ہے اور یہ کہ میرے والد و چچا حادثاتی موت مرے۔''

ہومز نے بے بسی سے ہوا میں مکہ مارا اور بولا ''مہا بے وقوفی''

''البتہ تھانے دار نے ایک سپاہی میرے ساتھ کر دیا۔ وہ میرے ساتھ ہی گھر میں رہتا ہے۔''

''کیا وہ تمھارے ساتھ آیا ہے؟''

''جی نہیں، اُسے صرف گھر میں رہنے کا حکم ہے۔''

ہومز نے دوبارہ ہوا میں مکہ گھمایا اور خاصی تیز آواز میں بولا: ''آپ اس کے بغیر میرے پاس کیوں آئے ہو اور پھر اتنی دیر بعد؟''

نوجوان نے بے چارگی سے کہا ''مجھے آج دوپہر ہی کو آپ کی بابت علم ہوا۔''

''آپ کو خط ملے دو دن بیت چکے۔ ہمیں کل ہی حرکت میں آنا چاہیے تھا۔ بہرحال، کیا آپ اپنا بیان مکمل کر چکے؟ یا کوئی اور ثبوت بھی موجود ہے؟''

جان اوپن شا بولا: ''میں نے بند کمرے سے ملنے والے ایک کاغذ کا ذکر کیا تھا۔ یہ کاغذ کسی نوٹ بک سے پھاڑا گیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کا تعلق ان کاغذات سے ہے جو چچا نے جلا ڈالے تھے۔ شاید یہ دیگر کاغذوں میں شامل ہونے کے باعث جلنے سے رہ گیا۔ کاغذ کے اوپر مارچ 1869ء درج ہے اور اس کے نیچے یہ جملے درج ہیں:

''4 مارچ..... ہڈسن کی آمد۔ پلیٹ فارم وہی ہے۔

7 مارچ..... میکالے، پارامور اور سینٹ آگسٹائن کے جان سوین کو بیج بھجوائے۔

9 مارچ..... میکالے کا صفایا۔

10 مارچ..... جان سوین سے بھی نمٹا گیا۔

12 مارچ..... پارامور سے بھی بات ہوئی۔''

ہومز نے کاغذ لیا، بغور پڑھا، واپس کیا اور تیزی سے بولا ''اب آپ ایک لمحہ ضائع نہ کریں اور گھر روانہ ہو جائیں۔

''لیکن اگلے لائحہ عمل کے متعلق تو کچھ بتایئے؟'' نوجوان کچھ تشویش سے بولا۔

''آپ بس ایک کام کیجیے۔ ابھی جو کاغذ آپ نے دکھایا، گھر پہنچتے ہی اُسے چوبی ڈبے میں ڈالیے۔ پھر یہ نوٹ لکھ کر ڈبے میں رکھیے: سارے کاغذات چچا نے جلا دیے تھے۔ بس یہ اکلوتا کاغذ بچا ہے۔ اس کے بعد ڈبا شمسی گھڑی کے اوپر رکھ دیجیے۔ آپ ساری بات سمجھ گئے؟'' ہومز نے پوچھا۔

''جی سمجھ گیا۔''

ابھی بدلہ لینے کا خیال دل میں نہ لائیے۔ میرا خیال ہے، انھیں قانون کے شکنجے میں کسنا ممکن ہے۔ مگر اس کے لیے ہمیں جال بننا ہے، جبکہ وہ پہلے ہی بن چکے۔ لہٰذا پہلی ترجیح یہ ہے کہ آپ کو درپیش خطرہ ٹالا جائے۔ پھر معمّہ حل کر کے گناہ گاروں کو سزا دی جائے گی۔''

جان اوپن شا اٹھتے ہوئے بولا ''بہت شکریہ مسٹر ہومز! آپ کا مشورہ بہت صائب ہے۔ اس نے حقیقتاً مجھے نئی زندگی عطا کر دی۔ میں چلتا ہوں۔''

''دوران سفر اپنی حفاظت کیجیے گا۔ آپ ایک بڑے خطرے میں گرفتار ہیں۔ آپ کیسے واپس جائیں گے؟''

''واٹرلو اسٹیشن سے ریل پکڑوں گا۔''

''ابھی نو بھی نہیں بجے۔ گلیوں میں خاصا ہجوم ہوگا۔ لہٰذا شاید ہی کوئی آپ پر حملہ کرنے کی جرأت کرے۔ کیا آپ اپنا دفاع کر سکیں گے؟''

''میرے پاس پستول موجود ہے۔''

''بہت خوب۔ میں کل صبح ہی آپ کے کیس پہ لگ جاؤں گا۔''

نوجوان نے پوچھا ''تب میں ہورشام میں آپ کا انتظار کروں۔''

''نہیں نہیں، آپ کا راز لندن میں پوشیدہ ہے۔ میں یہیں اُسے تلاش کروں گا۔''

نوجوان رخصت ہوا، تو ہومز نے پائپ سُلگایا، آرام کرسی سے ٹیک لگائی اور اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔ میں نے اس کی سوچ میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا اور خاموش رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد آخر وہ خود ہی بولا ''واٹسن! ہم نے اب تک جتنے کیس لیے ہیں، شاید ان میں یہ سب سے زیادہ انوکھا ہے۔''

''ہاں، مگر تم نے کچھ نتیجہ تو نکالا ہوگا۔'' میں نے دریافت کیا۔

''حالات کا بغور جائزہ لینے سے بعض حقائق ضرور سامنے آئے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ، کرنل اوپن شا تنہائی پسند آدمی تھا۔ لیکن کسی کے شدید خوف نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ امریکا سے فرار ہو جائے۔ وہ خوف کیا تھا؟ اس کا اندازہ ان خطوط سے لگانا ممکن ہے، جو کرنل اور دیگر افراد خانہ کو موصول ہوئے۔ کیا تم نے نوٹ کیا کہ ان خطوط پہ کن شہروں کی مہریں ثبت تھیں؟''

میں نے بتایا ''پہلا خط پونڈ بیچری سے بھیجا گیا۔ دوسرا ڈینڈی جبکہ تیسرا لندن سے سپرد ڈاک ہوا۔''

ہومز! ان ثبوتوں سے تم نے کوئی نتیجہ نکالا؟''

''یہ تمام بندرگاہیں ہیں۔ گویا خطوط کا مصنف کسی جہاز پہ سوار ہے۔''

''بہت خوب! گویا ہمارے ہاتھ ایک اہم سراغ لگ گیا۔ یہ تقریباً یقینی ہے کہ مصنف کسی جہاز میں سوار ہے۔ اب ایک نکتہ اور دیکھو۔ پونڈیچری کے معاملے میں خط ملنے اور کرنل کے مرنے تک سات ہفتے گزر گئے۔ جبکہ ڈینڈی والے خط اور جان کے والد کی موت میں تین چار دن کا فاصلہ ہے۔ حقیقت کیا بتاتی ہے؟

''یہی کہ جہاز نے طویل فاصلہ طے کیا۔

''مگر خط کو بھی تو لمبا فاصلہ طے کرنا پڑا۔''

''تو پھر؟ تمھارا مطلب کیا ہے؟

''مطلب یہ کہ وہ آدمی بادبانی کشتی میں سفر کر رہا ہے۔ لگتا ہے کہ اس نے ہر بار آغازِ سفر میں دھمکی آمیز خط لکھا۔ چونکہ پونڈیچری سے بادبانی کشتی سات ہفتے میں لندن پہنچی، لہٰذا کرنل بھی اتنے عرصے زندہ رہا۔ ڈینڈی قریب ہے، لہٰذا جان کا باپ خط ملنے اور مرنے تک تین چار دن ہی زندہ رہا۔ گویا مصنف ڈاک لانے والی بھاپ کشتی میں سوار ہوتا، تو بھی خط کے ساتھ ہی برطانیہ پہنچتا۔ لیکن حقیقت برعکس ہے۔''

تمھاری بات میں وزن ہے۔'' میں نے ہومز کو سراہتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ یہی بات ہے اور یہ حقیقت آشکار کرتی ہے کہ جان سخت خطرے میں ہے۔ کیونکہ مصنف اس شہر میں آچکا اور وہ کسی بھی وقت وار کرسکتا ہے۔''

''اُف میرے خدا! آخر یہ دھمکی آمیز خطوط لکھنے کا مقصد کیا ہے؟''

''کرنل اوپن شا کے ڈبے میں موجود کاغذات یقیناً بادبانی کشتی میں سوار شخص یا اشخاص کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں ایک سے زیادہ افراد شریک ہیں۔ کیونکہ تنہا آدمی اس انداز میں دو انسانوں کو قتل نہیں کرسکتا کہ ان کا مرنا حادثاتی لگے۔ یہ ایسے گروہ کی کارروائی ہے جو وسائل اور مصمم ارادہ بھی رکھتا ہے۔ گویا کے۔ کے۔ کے کسی فرد نہیں ایک گروہ کی مہر بن جاتا ہے۔''

''مگر کون سا گروہ؟'' میں نے دریافت کیا۔

ہومز نے کچھ توقف کیا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا ''تم نے کبھی کوکلکس کلان کا نام سنا ہے؟''

''نہیں تو۔''

''اچھا میں بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ہومز امریکن انسائیکلو پیڈیا اٹھالایا اور ورق گردانی کے بعد ایک مخصوص صفحہ پڑھنے لگا: ''کوکلکس کلان کا عجیب و غریب نام رائفل کا گھوڑا چڑھانے کی آواز سے ماخوذ ہے۔ یہ خطرناک خفیہ سوسائٹی ان امریکی راہنماؤں نے 1865ء میں قائم کی جو خانہ جنگی میں ہار گئے تھے۔ سوسائٹی کے ارکان لوزیانا، فلوریڈا، جارجیا اور ٹینیسی کی ریاستوں میں سرگرم عمل رہے۔

''شروع میں سوسائٹی نے سیاہ فام باشندوں کو دہشت زدہ کیا۔ پھر ان سفید فاموں کو بھی تنگ کرنے لگی جن کے فارموں میں سیاہ فام کسان کام کرتے تھے۔ فارموں کے مالکوں سے بھتہ طلب کیا جاتا۔ اگر کوئی انکار کرتا، تو اُسے عجیب طریقے سے قتل کی دھمکی دی جاتی۔ مثلاً کبھی خط میں خشک پتے بھجوائے جاتے اور کبھی مالٹے کے بیج یا تربوز کے بیج۔

''دھمکی ملنے پر مالک بھتہ ادا کرتا یا پھر ناچار ملک سے فرار ہو جاتا۔ جو مزاحمت کرتا، سوسائٹی کے

ان اُسے یوں ٹھکانے لگاتے کہ وہ سراغ رسانوں کی نظر میں بھی قتل قرار نہ پاتا۔ امریکی حکومت نے کوکلکس کلان کو ختم کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ آخر 1869ء میں اچانک سوسائٹی کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور اب کبھی کبھار ہی اس کے متعلق سننے کو ملتا ہے۔''

ہومز پھر انسائیکلو پیڈیا تپائی پر رکھتے ہوئے گویا ہوا: واٹسن! نوٹ کرو، جس سال کرنل اوپن شا ان کے جرائم افشا کرنے والے کاغذات لے اُڑا، تبھی سوسائٹی کی سرگرمی ختم ہوگئی۔ یقیناً ان کاغذات میں ایسی شخصیات کے اصلی نام درج تھے جو جعلی ناموں سے سوسائٹی کی مجرمانہ کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے اور جب کاغذات کرنل لے اُڑا، تو ان کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ انھوں نے پھر کرنل کے پیچھے آدمی لگا دیے تاکہ کاغذات حاصل کرسکیں۔''

''گویا ہم نے جو کاغذ دیکھا وہ ان کا حصہ تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں'' اور اسی میں درج تھا کہ کن اشخاص کو نشانہ بنایا گیا۔ یہ کاغذات دو انسانوں کی جانیں لے چکے، اب تیسرے کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔ واٹسن! بہت کافی ہوچکی۔ سونے کا وقت آپہنچا۔ اب خدا سے دعا ہے کہ وہ جان کو اپنی امان میں رکھے۔ میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی۔''

صبح میں اُٹھا، تو دھوپ چمک رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کی میز پر پہنچا، تو ہومز کو وہاں بیٹھے پایا۔ وہ ناشتہ کر چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ''واٹسن! معاف کرنا جلدی تھی، اس لیے انتظار نہیں کیا۔ ایک مصروف دن میرا منتظر ہے۔''

وہ چائے کی آخری چسکیاں لے رہا تھا کہ میں اخبار پڑھنے لگا۔ جلد ہی میری نظر سرخی ''واٹرلو پُل پر المناک واقعہ'' پر ٹھہر گئی۔ اس میں جان اوپن شا کا نام پڑھ کر میں چونکا ہوا اور ہومز کی توجہ بھی خبر کی جانب مبذول کرائی۔ لکھا تھا:

''رات سوا نو بجے سپاہی کک واٹرلو پُل کے نزدیک ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اچانک اُسے ایک چیخ اور پھر چھپاکے کی آواز سنائی دی۔ پھر کوئی ''بچاؤ، بچاؤ'' پکارنے لگا۔ لیکن تاریکی اتنی زیادہ تھی کہ سپاہی گزرنے والوں کی مدد کے باوجود ڈوبنے والے تک نہ پہنچ سکا۔ مگر الارم بج چکا تھا۔ لہٰذا پولیس کے غوطہ خور آپہنچے۔ انھوں نے ڈوبنے والے کی لاش تلاش کرلی۔ مقتول کے کوٹ سے ایک خط برآمد ہوا۔ اس سے پتا چلا کہ نوجوان کا نام جان اوپن شا ہے۔ شاید وہ ریلوے اسٹیشن جارہا تھا لیکن پھسل کر دریائے ٹیمز میں جا گرا۔ پولیس مزید چھان بین کررہی ہے۔''

ہم پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ جان دنیا میں نہیں رہا۔ ہومز اداسی اور غصے کے ملے جلے جذبات میں کہنے لگا ''واٹسن! انھوں نے مجھے نیچا دکھا دیا۔ اب یہ میرا ذاتی معاملہ بن چکا۔ میں اس گینگ کو نہیں چھوڑوں گا۔ انھوں نے مجھ سے مدد لینے والے کو مار کر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔''

''تم پولیس کے پاس جارہے ہو؟''

''نہیں، میں پہلے ان کے گرد جالا بُن دوں، پھر پولیس ''مکھیاں'' پکڑ لے گی۔''

میں حسبِ معمول اپنے کلینک چلا گیا اور شام کو واپس آیا۔ ہومز گھر پر موجود نہ تھا۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ رات دس بجے آیا۔ تھکن اس کے انگ انگ سے ظاہر تھی۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے کھانا کھایا۔

مجھے بتایا کہ مصروفیت میں وہ کھانا کھانا ہی بھول گیا۔

جب اس کے اوسان بحال ہوئے، تو میں نے سارے دن کی سرگزشت کے متعلق دریافت کیا۔ وہ بولا 'باجی کہیں کے، میرے پھندے میں پھنس چکے۔ وہ اب زیادہ عرصہ آزاد نہیں گھوم سکتے۔ واٹسن! کیوں نہ انھیں انھی کے شیطانی طریقے سے جواب دیا جائے؟

یہ کہہ کر ہومز نے سامنے طشتری میں پڑا ایک مالٹا اُٹھایا، اُسے کاٹا اور پانچ بیج نکال لیے۔ انھیں پھر ایک لفافے میں ڈالا اور ساتھ یہ نوٹ لکھ کر رکھا: ایس۔ ایچ کی طرف سے جے او کے لیے۔ لفافے پر یہ پتا لکھا: ''کیپٹن جیمز کالون، لون سٹار، سوانا، جارجیا، امریکا۔''

یہ سرگرمی تمام کرکے ہومز بولا: ''جیسے ہی بادبانی کشتی سوانا بندرگاہ میں داخل ہوگی، یہ خط اُسے مل جائے گا۔ اس کی کم از کم ایک رات تو شدید پریشانی کے عالم میں کروٹیں بدلتے گزرے گی۔

''یہ کیپٹن جیمز کون ہے؟''

''کرنل، اس کے بھائی اور جان کو قتل کرنے والے گینگ کا لیڈر۔ میں دوسروں پر بھی ہاتھ ڈالوں گا، مگر پہلے اسے پکڑلوں۔''

''تم اس گینگ تک کیسے پہنچے؟''

ہومز نے جیب سے ایک لمبا کاغذ نکال کر دکھایا جس پر نام اور تاریخیں درج تھیں۔ کہنے لگا ''میں صبح سیدھا رائڈرز رجسٹر آف شپنگ پہنچ گیا۔ وہاں سارا دن جہازوں کے اندراج والے رجسٹر اور فائلیں دیکھتا رہا۔ سب سے پہلے دیکھا کہ جنوری اور فروری 1883ء میں پونڈیچری کون سی بادبانی کشتیاں آئیں۔ معلوم ہوا کہ 36 کشتیاں آئی تھیں۔ ان میں سے ''لون سٹار'' نے فوراً میری توجہ حاصل کرلی۔ کیونکہ امریکی ریاست ٹیکساس کو اس نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''میں نے پھر ڈینڈی کے ریکارڈ دیکھے۔ ان سے افشا ہوا کہ جنوری 1885ء میں لون سٹار وہاں موجود تھی۔ یوں میرا شک یقین میں بدلنے لگا۔ میں نے پھر یہ معلوم کیا کہ لندن میں کون سی بادبانی کشتیاں کھڑی ہیں اور ...... اور پتا چلا، لون سٹار پچھلے ہفتے لندن پہنچی تھی۔ میں فوراً بندرگاہ پہنچا، لیکن وہ پہلے ہی روانہ ہوچکی تھی۔''

''تم نے پھر کیا قدم اٹھایا؟''

میں نے فوراً یہ معلومات لیں کہ کشتی میں کون لوگ سوار تھے۔ بیشتر جرمنی یا فن لینڈ سے تعلق رکھتے تھے۔ کپتان سمیت صرف تین آدمی امریکی نکلے اور مجھے ایک قلی سے معلوم ہوا کہ تینوں رات کو باہر گئے تھے۔ واٹسن! ہمیں یہی تینوں مطلوب ہیں۔ جب ان کی کشتی سوانا پہنچے گی، تو کیپٹن جیمز کو خط مل جائے گا۔ جبکہ اگلے دن یہ تار سوانا پولیس کو ملے گا کہ تینوں جینٹل مین قتل کے سلسلے میں لندن پولیس کو مطلوب ہیں۔''

انسان جس بات کا عزم کرے، وہ کبھی کبھی پوری نہیں ہوتی۔ ہمارے بھجوائے گئے مالٹے کے بیج مجرموں تک نہ پہنچ سکے کیونکہ دنیا ہی میں انھیں اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ اس سال سمندروں میں طوفانوں کی کثرت تھی۔ لون سٹار جیسے ہی کھلے سمندر میں پہنچی، کسی زبردست طوفان کا نشانہ بن گئی۔

ادھر ہم انتظار کرتے رہے کہ کشتی کب سوانا کی بندرگاہ پہنچتی ہے، مگر کوئی خبر نہ آئی۔ کئی ہفتے بعد یہ اطلاع ملی کہ ایک بہتا مستول دیکھا گیا جس پر لون سٹار درج تھا۔

ooo

محبت کا نیلا رنگ

نیلے رنگ کو اپنا سمجھنے والے ایک رنگریز کا حیرت افزا ماجرا
اُس کے ہاتھ نیلے رنگ سے کھیلتے ہی نہیں باتیں بھی کرتے تھے

عمار مسعود

اُس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ رنگ تھے۔ وہ رنگ رنگ کے لوگوں کی اس دنیا میں ہر وقت کچھ اس طرح کھویا رہتا کہ اس کو رنگوں کی شناخت کے سوا کسی کی کوئی نشانی نہیں رہتی تھی۔ اس کی تمام عمر رنگوں اور ان کے گرد گھومتی تھی۔ اس کو سب ہی رنگ عزیز تھے۔ وہ لوگوں، عمارتوں، چہروں سے نہیں بلکہ رنگوں سے محبت کرتا تھا۔ اُس کی ہر کہانی کسی ایک رنگ سے شروع ہوکر کسی اور رنگ پر ختم ہوجاتی تھی۔ وہ لوگوں کو بھی رنگوں کے پیمانے پر پرکھتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے جذبوں کو بھی رنگوں کے نام دے رکھے تھے۔ وہ ہنستے کہتا تھا کہ محبت کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔ یہ کہتے سمے اس کی آنکھوں میں ایسی گہری اداسی کا رنگ چھا جاتا جو ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

چھوٹے سے اس شہر کے سب سے بڑے اور مصروف چوک کے کونے پر برسوں سے صدیق رنگریز کی دکان اسی رنگ ڈھنگ سے چل رہی تھی۔ ٹھیلے والوں کی آوازیں، رکشوں کا شور، ٹریفک کے سپاہی کی گالیاں، تانگے والوں کی صدائیں اور فقیروں کے ہجوم سے بے خبر، وہ برسوں سے کپڑے رنگنے کا کام بڑی لگن سے کررہا تھا۔ دکان کے باہر دو بڑی کڑاہیوں میں تیز آگ پر ہر روز کوئی نیا رنگ چڑھا ہوتا تھا۔ ایک طویل الگنی پر تازہ رنگے ہوئے دوپٹے چوک کے باقی ماحول سے بالکل مختلف نظر آتے تھے۔ دکان میں اس کے سوا کوئی اور کاریگر نہیں تھا۔ وہی تمام رنگوں کا راز داں اور وہی مختار تھا۔ گاہک سے کپڑا

سے لے کر، رنگنے کے آخری مراحل تک وہ ہر کام خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا ''کاکا! رنگ چڑھانا تو بڑی نیکی کا کام ہے۔ کسی اور کا ہاتھ لگے، تو رنگوں میں برکت نہیں رہتی اور برکت نہ ہو تو رنگ کبھی نہیں چڑھتا۔''

رنگوں کی دنیا میں اتنے برس سے رہتے رہتے اس نے ہر رنگ کو اپنا ہی مفہوم دے رکھا تھا۔ اسے پتا تھا کہ ہر رنگ کی تاثیر مختلف ہوتی ہے۔ جیسے وہ سرخ رنگ سے بہت گھبراتا تھا۔ اس بے باک رنگ کو رنگتے ہوئے ہمیشہ اس کی آنکھیں جھکی جھکی اور گال تمتمائے سے رہتے تھے۔ وہ شرم سے لال ہو جاتا تھا۔ جب یہ سرخ رنگ کسی کپڑے پر غالب آجاتا، تو وہ جلدی سے اسے نچوڑ کر الگنی پر سوکھنے کے لیے لٹکا دیتا اور دیر تک ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوتا تھا۔ کہیں یہ رنگ اس کے ہاتھوں پر نہ رہ جائے۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ رنگ اس کا رنگ نہیں ہے۔ یہ رنگ اگر اس کے ہاتھ پہ رہ گیا تو داغ بن جائے گا۔ درد دے جائے گا۔

صدیق کو جب میں نے پہلی دفعہ دیکھا تو وہ تقریباً چالیس، بیالیس برس کا تھا۔ تگڑا جسم، سانولی رنگت اور بھوری آنکھیں۔ چہرے، ہاتھوں اور لباس پر رنگ ہی رنگ تھے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ ہر کام کو بڑے نپے تلے انداز سے کرنے کا عادی تھا۔ اسے کبھی کسی چیز کی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ کپڑے رنگتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب محرومی کا سا تاثر ہوتا تھا۔ خالی خالی آنکھوں سے دھیرے دھیرے وہ سارے کام بڑے انہماک سے کرتا اور یہی کرتے ہوئے اسے کئی برس گزر گئے تھے۔ ہاں البتہ اپنے رنگ بھرے ہاتھوں سے جب وہ کڑاہی میں آخری بار کپڑا بھگو کر نکالتا، تو اس کی آنکھوں میں بس لمحہ بھر کے لیے ایک چمک ضرور آتی تھی۔ جسے وہ فوراً ہی اپنے آپ سے چھپا لیتا۔ وہ کہتا ''کاکا! کسی بھی ہنر کے غرور کا رنگ بہت کچا ہوتا ہے۔ ایک ہی دھلائی میں اتر جاتا ہے۔''

رنگوں کے متعلق اس کے اپنے ہی اصول تھے۔ جب کوئی گاہک اسے اس کے اصول توڑنے کو کہتا تو اس کا کام تو کر دیتا مگر کبھی بھی وہ رنگوں کو خراب کر کے خوش نہیں ہوتا تھا۔ وہ خالص رنگوں کا قائل تھا۔ وہ سبز اور پیلے کو پیلا رنگ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ شہر کی سیاست سے لے کر سماج کے رذیوں تک ہر چیز کو وہ رنگوں سے شناخت کرتا تھا۔ جب شہر میں زیادہ لوگ سبز پگے رنگوانے لگتے، تو وہ ہمیشہ خوفزدہ ہو جایا کرتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اس کو سبز رنگ سے محبت نہیں تھی مگر وہ کہتا تھا کہ ''کاکا کچے کپڑے پر پکا رنگ چڑھا بھی دو تو کپڑا تو کچا ہی رہتا ہے نا۔''

بسنت کے دنوں میں جب پیلا رنگ اپنی پوری بہار پر ہوتا، تو صدیق بھی اس رنگ میں رنگ جاتا۔ ان دنوں میں ہر کپڑا رنگتے ہوئے اس کے دل میں بھی دھمال پڑتی اور سرسوں کی فصل کٹتی۔ وہ دنوں میں جانے کتنی ہی بسنتی چنریاں رنگ کر سارے شہر میں بانٹ دیتا۔ پھر جامن کی رُت آتی، تو اس رنگ کا ذائقہ اس کو دنوں تک اپنے ہاتھوں پر محسوس ہوتا۔ مگر وہ کوئی بھی رنگ رنگتا، اس کی آنکھوں سے اداسی کا رنگ کبھی نہیں اترتا تھا۔

اس کی چھوٹی سی دکان کے اندر چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں، بوتلوں میں، رنگ ہی رنگ بھرے تھے وہ جب ان ڈبوں یا پھر درازوں میں رکھی پڑیوں میں سے کوئی رنگ نکال کر کڑاہی میں ڈالتا، تو اس کا انہماک کسی بڑے تخلیق کار کا ہوتا۔ جو خود سے ایک نیا رنگ تخلیق

کرنے پر قادر ہو۔ سارا شہر اس کے ہنر کو مانتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس کا رنگا ہوا کپڑا کبھی رنگ نہیں چھوڑتا۔ لین دین کے معاملات میں بھی وہ یک رنگی کا قائل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا مقصد پیسے کمانا تو ہے ہی نہیں۔ وہ تو بس رنگ بھرنا چاہتا ہے۔ نئے نئے، اُجلے اُجلے۔ میں نے اس سے کئی دفعہ کہا کہ ''تم کوئی بڑی دکان لے لو، بڑا سا بورڈ لگواؤ، چار چھ ملازم رکھو، پیسے کماؤ۔'' تو وہ بغیر کسی تامل کے بولتا ''کاکا! رنگ کاروبار نہیں ہوتا یہ تو محبت کی طرح ہوتا ہے، کسی لالچ کے بغیر کرو تبھی پکا چڑھتا ہے۔''

یوں تو صدیق رنگ ریز کو ہر رنگ سے محبت تھی مگر نیلا رنگ اس کو بہت عزیز تھا۔ یہ واحد رنگ تھا جسے رنگتے ہوئے اس پر عجیب سرخوشی اور مستی کی کیفیت ہوتی تھی۔ نیلے رنگ کو ہاتھ لگاتے ہی اس پر ایک سُرور کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس کے ہاتھ دیر تک اس رنگ سے باتیں کرتے اور اس کی انگلیاں اس رنگ سے کھیلتے کھیلتے نیلی ہو جاتی تھیں۔ اس کا جی چاہتا کہ ہر کپڑے کو نیلے رنگ میں رنگ دے۔ نیلے رنگ سے کپڑے رنگنے کے بعد وہ کبھی ہاتھ نہیں دھوتا تھا بلکہ جان بوجھ کر اپنے ہاتھ کی لکیروں کو نیلے رنگ میں چھپا دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا ''کاکا! ہر آدمی کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے، ہر رنگ ہر کسی کو راس نہیں آتا، نیلا رنگ میرا رنگ ہے۔ پانیوں کا، آسمانوں کا رنگ ہے۔ پرندوں کے پروں کا رنگ ہے، محبت کا رنگ ہے۔''

صدیق نے تو مجھے نہیں بتایا مگر ارد گرد کے دکاندار بتاتے تھے کہ بہت سال پہلے ایک بڑی نیلی گاڑی میں نیلے رنگ کی عینک لگائے، لاجوردی ساڑھی میں ملبوس، کانوں میں آسمانی رنگ کے آویزے سجائے، نازک سی انگلی میں فیروزے کی انگوٹھی پہنے، بہت ہی لمبے بالوں والی میڈم اس کی دکان پر آئی تھی۔ صدیق جو کبھی کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا، سحر زدہ سا اس کو دیر تک دیکھتا رہا۔ اُس نے کچھ کپڑے رنگنے کے لیے دیے اور دو ہفتے کے بعد آنے کا کہہ کر چل دی۔ جب اُس نے پورے احترام سے وہ کپڑے تھامے تو اس کی انگلی کی پور اس نیل پری کی سفید کلائی سے ٹکرا گئی۔ لمس کے اس ایک لمحے نے صدیق کا رنگ ہی بدل دیا تھا۔ کپڑے تو اس نے دو دن ہی میں رنگ دیے پھر باقی دن اس نے بڑی بے چینی میں گزارے۔ دو ہفتے گزر گئے لیکن کپڑے لینے کوئی نہ آیا۔ اس بات کو کئی برس گزر گئے وہ کپڑے آج بھی اُس کی دکان پر اُسی طرح تہ کیے نیلے رنگ میں رنگے پڑے ہیں۔ دن میں جب بھی کبھی اس کی نظر ان کپڑوں پر پڑتی تو ضبط کے مارے اس کا سیاہی مائل رنگ سفید پڑ جاتا۔ آج بھی وہ چوک میں سب سے پہلے دکان کھولتا اور چوک کے خاموش ہونے تک اس میں بیٹھا رہتا ہے۔ تب سے آج تک وہ محبت کے رنگ کو نیلا رنگ کہتا ہے۔

میں وہ شہر چھوڑ کر کئی سال کے لیے ملک سے باہر چلا گیا مگر ان برسوں میں بارہا مجھے اس رنگ ریز کا خیال آتا رہا جو محبت کے رنگ کو نیلا رنگ کہتا تھا۔ وطن واپس آکر جب میں چوک میں گیا تو پتا چلا کہ وہ رنگ ریز تو پارسال سانپ کے کاٹے سے مر گیا ہے۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ مرنے سے پہلے صدیق کا سارا بدن نیلا ہو گیا تھا۔

انکل سام کے ہاتھوں

اُسامہ بن لادن کا گرم تعاقب

پروفیسر محمد فاروق قریشی

☆اسامہ بن لادن ایبٹ آباد میں انکل سام کے وحشیانہ انتقام کا نشانہ کیسے بنا؟

☆کیا پاکستانی حکومت، مسلح افواج اور آئی ایس آئی ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کے قیام سے واقعی لاعلم تھے؟

☆کیا ایبٹ آباد آپریشن پاکستان کے دفاعی اداروں کی اہلیت پر سوالیہ نشان نہیں؟

☆اسامہ بن لادن کی تجہیز و تکفین کو دنیا کی نظروں سے اب تک خفیہ کیوں رکھا گیا ہے؟

''اسامہ بن لادن کا گرم تعاقب'' سی این این کے قومی سیکیورٹی تجزیہ کار پیٹر برگن کی کتاب Manhunt سے ماخوذ ہے۔ مصنف نے 9/11 کے حملوں سے لے کر ایبٹ آباد آپریشن میں اسامہ کی ہلاکت تک اس کی نقل و حرکت، القاعدہ کی کارروائیوں اور سی آئی اے کے تعاقب کی کہانی کی آخری قسط پیش خدمت ہے۔

اُسامہ بن لادن کی تلاش

اسامہ کے قول کے مطابق محافظ ابو جندل نے بھی القدس العربی اخبار میں شیخ اسامہ کے اسی مضمون کی اہمیت کا ذکر کیا۔ 19 اپریل کو صدر اوباما نے میک ریون کو آپریشن کی تیاری کا اشارہ دے دیا۔ وہائٹ ہاؤس میں اس آپریشن کے سلسلے میں مکمل رازداری کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ صرف ایک درجن افسران کو اس کا علم تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ آپریشن کے لیے بغیر چاند کے تاریک رات زیادہ مناسب رہے گی تاکہ پاکستانی ہمارے ہیلی کاپٹروں کو نہ دیکھ سکیں۔ نیز سیلز اندھیرے میں دیکھنے والی عینکیں (NVG) پہنے ہوئے ہوں گے جن کے لیے مکمل اندھیرا زیادہ سازگار ہوگا۔ 30 اپریل ہفتے کی رات پاکستان میں چاند نظر نہیں آنا تھا اور سی آئی اے کی معلومات کے مطابق ہفتے کے دن پاکستانی فوج کی بہت کم سرگرمیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ چناں چہ 26 اپریل کو سیلز (SEALS) کی تمام ٹیمیں افغانستان کے مگرام ایئربیس کے لیے پرواز کر چکی تھیں۔ عین اس وقت ایبٹ آباد میں موجود سی آئی اے کے سراغ رسانوں نے ورجینیا میں اپنے افسران کو اطلاع دی کہ ویتی اور اس کی بیوی مریم اپنے چار بچوں سمیت پاکستان کے اندر اپنے کسی سفر سے ایبٹ آباد حویلی میں واپس پہنچ چکے ہیں۔ سی آئی اے کے کچھ افسران حیران تھے کہ اگر اسامہ بن لادن وہاں موجود ہے تو وہ اپنے فون کو موبائل فونوں کے ساتھ سفر کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔ قومی انسدادِ دہشت گردی مرکز (NCTC) کے ڈائریکٹر مائیک لیٹر نے غیر جانبدار تجزیہ کاروں کی ریڈ ٹیم (Red Team) کا تصور پیش کیا تاکہ ایبٹ آباد حویلی اور اس کے مکین کے بارے میں دستیاب معلومات کی مدد سے تمام ممکن تجزیاتی نتائج سامنے لائے جا سکیں۔ تاہم ریڈ ٹیم کوئی نیا تجزیہ پیش نہ کر سکی سوائے اس کے کہ ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی موجودگی کا امکان چالیس سے ساٹھ فیصد تک ہے۔ صدر کا خیال تھا کہ یہ ففٹی ففٹی کی گیم ہے۔

28 اپریل 2011ء کو مائیک لیٹر نے حتمی طور پر ریڈ ٹیم تجزیے کے بارے میں بتا دیا کہ اس میں کوئی نئی دریافت یا پیش رفت نہیں۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر لیون پینیٹا کی رائے تھی کہ تورا بورا کے بعد ایبٹ آباد کے بارے میں ہمارے پاس بہترین شہادتیں موجود ہیں جو ہم جمع کر سکتے ہیں۔ اس لیے آپریشن برپا کرنا ہمارا پیشہ ورانہ فرض ہے اور امریکی عوام ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں۔ ڈیفنس سیکرٹری رابرٹ گیٹس اور ڈائریکٹر انٹیلی جنس جیمز کلیپر نے اپنے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ صدر نے میٹنگ کے شرکا سے فرداً فرداً بھی رائے لی اور بیشتر نے اس آپریشن کو ضروری قرار دیا۔ نائب صدر جو بائیڈن نے اس آپریشن کے پاکستان کے ساتھ تعلقات پر منفی اثرات اور پاکستان میں امریکی سفارتکاروں کی زندگیوں کو لاحق خطرات پر تحفظات کا اظہار کیا اور کہا کہ اسامہ بن لادن کی موجودگی کا یقین ہونے تک آپریشن ملتوی کر دیا جائے۔ اس نے ایران میں امریکی سفارتکاروں کی رہائی کے لیے کیے جانے والے ناکام آپریشن کا حوالہ بھی دیا۔ صدر کے اعلیٰ ترین فوجی مشیر ایڈمرل مائیک مولن نے زور شور کے ساتھ آپریشن کی حمایت کی۔ جنرل کارٹ رائٹ نے ایک چھوٹا بم گرانے کا مشورہ دیا۔ اگرچہ 1998ء میں اسامہ کے خلاف ایک ایسا ہی کروز میزائل حملہ ناکام ہو چکا تھا۔ ہیلری کلنٹن نے اپنی طویل تجزیاتی تقریر کے آخر میں آپریشن کے حق میں رائے دی۔ مائیک لیٹر نے مجوزہ آپریشن کے بجائے ڈرون حملے کو ترجیح دی

کیونکہ اس میں نقصانات اور خطرات کے اندیشے کم تھے۔ اوباما کے انسداد دہشت گردی کے مشیر اعلیٰ جان برینن نے کہا کہ اسے سی آئی اے افسران کے طویل تجربے اور فراہم کردہ معلومات پر زبردست اعتماد ہے اس لیے اس حملے پر عمل درآمد کیا جانا چاہیے۔ ان کے علاوہ ڈینس مکڈونو، ٹام ڈنی لان، مین رہوڈز، مشل فلورنائے، ٹونی بلنکن، مائیک وکرز، رابرٹ کارڈیلو اور نک راسمسن اِن سب نے آپریشن کی تائید کی۔

صدر اوباما نے سب کے مشورے پوری توجہ سے سنے اور اجلاس کے اختتام پر کہا ''یہ ایک مشکل فیصلہ ہے مجھے اس پر مزید سوچنے کی ضرورت ہے۔ میں کل کوئی حکم جاری کروں گا۔'' اوباما کو پورا احساس تھا کہ اس فیصلے کی ذمہ داری ہمیشہ اس کے کندھوں پر رہے گی۔ اس نے آپریشن کی دو مجوزہ صورتوں پر گہرا غور وخوض کیا اور ڈرون حملے کے بجائے ہیلی کاپٹرز کے ذریعے سیلز (SEALS) کے حملے کے حق میں فیصلہ کر لیا۔ اس میں ناکامی کا بھی احتمال تھا۔ لیکن اوباما ہمیشہ جچا تلا خطرہ مول لینے کا عادی رہا ہے۔ اس نے 2009ء میں صدارتی نامزدگی کے لیے ہیلری کلنٹن کا مقابلہ کیا۔ افغانستان میں فوجیوں کی تعداد کو تین گنا کر دیا۔ مصری ڈکٹیٹر حسنی مبارک کو فون کیا اور کہا اس کے لیے اقتدار سے علیحدہ ہو جانے کا یہ اچھا وقت ہے۔ مارچ 2011ء میں جب لیبیا کے حکمران معمر قذافی نے اپنے خلاف عوام کی تحریک کو کچلنے کی کوشش شروع کی تو اوباما نے چند دنوں کے اندر اقوام متحدہ اور نیٹو کے ساتھ مل کر باغیوں کو فوجی امداد کا سلسلہ شروع کر دیا جس کے نتیجے میں لیبیا کے آمر کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اس کارروائی پر اوباما کو شدید تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔

ایبٹ آباد آپریشن کے سلسلے میں اوباما نے نائب صدر جو بائیڈن کی پاک امریکا تعلقات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کی وارننگ کو نظر انداز کر دیا۔ نیز مزید معلومات اکٹھی کرنے کے لیے مزید انتظار کے بجائے فوری طور پر اسامہ بن لادن کو قابو کرنے کے اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

29 اپریل بروز جمعہ آٹھ بج کر بیس منٹ پر اوباما نے اپنی جنگی کابینہ کو وہائٹ ہاؤس میں جمع کیا اور آخری بار ان کی رائے جاننا چاہی۔ انھوں نے آپریشن کی حمایت کی۔ اوباما نے کہا کہ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد ایبٹ آباد آپریشن کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس نے نیشنل سیکیورٹی ایڈوائزر ٹام ڈنی لان کو آپریشن شروع کرنے کے احکامات جاری کرنے کی ہدایت کی اور خود اپنی فیملی کے ساتھ الاباما اسٹیٹ میں لسکہ لوسا کے لیے روانہ ہو گیا۔ جہاں ایک ہفتے کے دوران طوفانوں نے تباہی مچادی تھی۔

ڈنی لان نے حکم نامہ جاری کر دیا۔ پشاور میں امریکی قونصل خانے کے عملے کو کہا گیا کہ وہ قونصل خانے کو خالی کر دیں۔ صدر اوباما نے اپنی معمول کی سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن ہفتے کے دن گرام ائیر بیس پر JSOC ہیڈ کوارٹر میک ریون کو فون کر کے آپریشن کی تیاری کے متعلق پوچھا۔ میک ریون نے موسم کی پیشگوئی کی وجہ سے ایبٹ آباد آپریشن کو 24 گھنٹے کے لیے اتوار کی رات تک ملتوی کیا تھا۔ لیکن اب نئے نام آپریشن نپٹیون سپیئر (Operation Neptune Spear) کے ساتھ عمل درآمد کے لیے تیار تھا۔

روشنی مت جلاؤ

یکم مئی اتوار کے دن آٹھ بجے اوباما کے قومی سیکیورٹی افسران وہائٹ ہاؤس پہنچنا شروع ہو گئے۔ اس دن وہائٹ ہاؤس میں بیرونی افراد کے تمام دورے

منسوخ کر دیے گئے تھے۔ دوپہر کے وقت اوباما کابینہ کے ''بڑے'' آنا شروع ہو گئے۔ پریس کی نظروں سے بچنے کے لیے گاڑیوں کو دوسری جگہ پارک کیا گیا۔ وہائٹ ہاؤس میں سیکیورٹی ٹیم نے سچوایشن روم (Situation Room) کا مواصلاتی رابطہ مشرقی افغانستان کے شہر جلال آباد میں موجود ایڈمرل میک ریون کے ساتھ قائم کر دیا تھا۔ اسی طرح نشست گاہ (SittingRoom) کا مواصلاتی رابطہ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر اور آپریشن سنٹر کے ساتھ استوار کیا گیا تھا۔ سہ پہر ایک بج کر بائیس منٹ پر پینیٹا نے میک ریون کو حملہ شروع کرنے کا حکم دیا۔ دو بجے صدر اوباما بھی نشست گاہ میں پہنچ گئے۔ اس وقت ایبٹ آباد میں رات کے گیارہ بجے تھے اور بن لادن فیملی کے افراد اپنے بستروں میں آرام کی نیند سو رہے تھے۔ افغانستان کے مقامی وقت کے مطابق ٹھیک گیارہ بجے دو بلیک ہاک ہیلی کاپٹرز تئیس سیلز فوجیوں اور کائرو نامی لڑاکا کتے کو لے کر جلال آباد کے ہوائی اڈے سے پاکستان کی سرحد کی طرف محو پرواز ہوئے۔ یہ ایم ایچ 60 ہیلی کاپٹرز تھے جن میں پاکستان کے راڈار اسٹیشنوں سے بچنے کے لیے خصوصی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ خصوصی رنگ کیا گیا تھا اور شور کو کم کیا گیا تھا اور انھوں نے پہاڑیوں اور وادیوں میں سطح زمین سے صرف چند فٹ کی بلندی پر تیز رفتاری سے پرواز کی اور مقررہ وقت سے اندر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ اس آپریشن کی سخت رازداری کا عالم یہ تھا کہ افغانستان میں موجود ڈیڑھ ہزار امریکی اور نیٹو افواج میں سے صرف ان کے کمانڈر جنرل ڈیوڈ پیٹریاس کو تین دن پہلے اعتماد میں لیا گیا اور پاکستانی سول اور فوجی قیادت کو مکمل طور پر بے خبر رکھا گیا۔ جنرل پیٹریاس بھی اپنے کمپیوٹر پر اس آپریشن کی نگرانی کر رہا تھا اور پاکستانی ائیر فورس کی طرف سے امریکی ہیلی کاپٹروں کی مزاحمت یا حملے کی صورت میں جوابی کارروائی کے لیے افغانستان میں موجود امریکی ہوائی جہازوں کو حکم دینے کے لیے بالکل تیار تھا۔ پندرہ منٹ کی پرواز کے بعد جب ہیلی کاپٹر پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہو گئے تو جلال آباد ائیر پورٹ سے تین چنوک ہیلی کاپٹروں نے پرواز کی۔ ان میں ایک پاکستان کی سرحد کے اندر قریب ہی اتر گیا۔ دوسرے دونوں سوات کے پہاڑی علاقے کالا ڈھاکہ میں دریائے سندھ کے چوڑے ریتلے کنارے پر اتر گئے۔ ان پر سریع الحرکت فوج کے دو درجن سیلز سوار تھے جو ایبٹ آباد میں کسی سنگین صورت حال سے نمٹنے کے لیے وہاں چلے جائیں گے۔ نیز ان پر اضافی ایندھن لے جایا گیا تھا جس کی بلیک ہاک ہیلی کاپٹرز کو افغانستان واپسی کی پرواز میں ضرورت ہو گی۔

سچوایشن روم کے ساتھ ملحق ایک چھوٹا کانفرنس روم تھا جس میں ٹیلی فون اور ویڈیو لنک کی سہولت موجود تھی۔ جلد ہی تمام سینیئر افسران کانفرنس روم میں آ گئے۔ صدر اوباما نے بھی ایک نشست سنبھال لی۔ کانفرنس روم فوراً ہی بھر گیا جب کہ بہت سے اعلیٰ افسران دیواروں کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ ہر کوئی اس ڈرامے کا پردہ اٹھنے کا منتظر تھا۔ ایبٹ آباد میں آدھی رات کے تھوڑی دیر بعد حویلی کے مکینوں نے دھماکا خیز آوازیں سنیں اور ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے۔ اسامہ بن لادن کی بیس سالہ بیٹی مریم گھبرا کر سب سے اوپر کی منزل پر اپنے باپ سے پوچھنے گئی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اس نے جواب دیا ''نیچے جاؤ اور دوبارہ سو جاؤ۔'' پھر اسامہ بن لادن نے اپنی بیوی امل سے کہا ''روشنی مت جلاؤ۔'' یہ اس کے آخری الفاظ تھے جو اس نے کہے۔ کیونکہ کسی نامعلوم شخص نے

بڑی ہوشیاری سے اس محلے کی بجلی بند کردی تھی جس سے حملہ آور سیلز ٹیم کو بہت فائدہ پہنچا۔

وہائٹ ہاؤس کے کانفرنس روم میں سب آپریشن کی ویڈیو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ جب دونوں بلیک ہاک ہیلی کاپٹر اپنے ہدف پر پہنچ گئے تو منصوبے کے مطابق ایک ہیلی کاپٹر نے حویلی کی چار دیواری کے اندر اترنے کی کوشش کی۔ لیکن غالباً اپنے زائد وزن اور ایبٹ آباد میں توقع سے زیادہ درجہ حرارت کی وجہ سے اس کی بلندی اچانک کم ہوگئی اور یہ دیوار سے ٹکرا کر حویلی کے اندر زمین سے جاٹکرایا۔ اگرچہ ہیلی کاپٹر کو نقصان پہنچا لیکن سیلز ٹیم کسی خاص وقت کے بغیر نیچے اتر گئی۔ ہیلی کاپٹر کے اس نقصان پر اوباما کے ماہرین اور مشیران تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ دوسرے پائلٹ نے اس حادثے کو دیکھتے ہوئے منصوبے کے مطابق عمارت کی چھت پر منڈلانے اور سیلز کو اتارنے کا ارادہ تبدیل کردیا اور چار دیواری سے باہر کھیتوں میں ہیلی کاپٹر اتار دیا۔ حادثہ شدہ ہیلی کاپٹر کے تین سیلز کمانڈوز نے بھاگ کر عمارت کا اندرونی دروازہ کھولا تو اندر گیراج میں سوزوکی جیپ اور وین کو کھڑے پایا۔ یہ ایک منزلہ چھوٹی سی عمارت تھی جس میں کویتی اور اس کا بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اچانک کویتی نے فائرنگ شروع کردی۔ گھپ اندھیرے میں سیلز کو اندھیرے میں دیکھنے والی عینکوں (NVG) کا بہت فائدہ ہوا۔ انھوں نے کویتی کو گولیوں سے بھون ڈالا اور اس کی بیوی مریم کو دائیں کندھے میں گولی مار کر زخمی کردیا۔ دوسرے ہیلی کاپٹر سے اترنے والے چار سیلز نے ایک ترجمان اور لڑاکا کتے کائرو کے ہمراہ حویلی کی چار دیواری کی نگرانی شروع کردی۔ باقی ماندہ آٹھ سیلز نے دھماکا خیز مواد سے بیرونی گیٹ اڑا دیا لیکن ان کے سامنے کوئی صحن نہیں بلکہ ایک دیوار تھی۔ تاہم اندر والے سیلز نے ان کے لیے مین گیٹ کھول دیا۔

تیسری منزل پر بن لادن رات کے اندھیرے میں جب کہ بجلی بھی بند تھی اپنے کمرے میں پریشان تھا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہ ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ شلوار قمیص میں ملبوس القاعدہ راہنما نے گھپ اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ پندرہ منٹ انتظار کیا جب کہ امریکی اس کی آخری پناہ گاہ پر طوفانی حملہ کر چکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاس حملے کی صورت میں بچ نکلنے کا کوئی خفیہ منصوبہ نہیں تھا۔ اس کے لباس کی اندرونی جیبوں میں کئی سو یورو اور دونوں نمبر سلے ہوئے تھے اور بس۔ تین سیلز کمانڈو کویتی کے ایک منزلہ گھر سے ایک اہنی گیٹ کو پار کر کے اندر گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو بڑی عمارت کے سامنے ایک سبزہ زار میں پایا۔ سیلز زمینی منزل کے اندر داخل ہوگئے۔ ان کے بائیں طرف ایک خوابگاہ تھی جہاں انھوں نے کویتی کے بھائی ابرار اور اس کی بیوی بشریٰ دونوں کو قتل کردیا جو غیر مسلح تھے۔ آگے ایک باورچی خانہ اور دو بڑے اسٹور روم تھے۔ آخر میں ایک بھاری مقفل آہنی گیٹ تھا جو اوپر والی منزلوں کو جانے والی سیڑھیوں پر نصب تھا۔ سیلز نے دھماکا خیز مواد سے گیٹ کو اڑا دیا اور اوپر چلے گئے۔ وہاں سیڑھیوں پر ان کا سامنا بن لادن کے تیئیس سالہ بیٹے خالد کے ساتھ ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی AK-47 رائفل استعمال کرتا، سیلز نے اس کو گولیاں مار دیں۔ خوفزدہ چھوٹے بچے سیڑھیوں پر جمع ہو رہے تھے۔ تیسری منزل پر بن لادن کے کمرے میں شیلف پر AK-47 اور میگاروف پسٹل موجود تھے لیکن اس نے ان کو اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے آہنی

دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا کہ یہ نقل و حرکت کیسی ہے۔ سیلز نے اس کو دیکھ لیا اور وہ چھلانگیں لگاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں داخل ہوگئے کیونکہ دروازہ بند نہیں تھا۔ پہلے سیلز کا سامنا دو عورتوں سے ہوا انھوں نے ان دونوں پر قابو پالیا۔

تیسری عورت اسامہ بن لادن کی بیوی امل تھی اس نے عربی میں چیخ کر کچھ کہا اور اپنے شوہر کے سامنے گر گئی۔ سیلز نے اس کی ٹانگ پر گولی ماردی اور وہ وہیں بے ہوش ہوگئی۔ اب سیلز کے سامنے ایک طویل القامت شخص کھڑا تھا جو بن لادن جیسا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے پاس دو ہتھیار پڑے تھے لیکن اس نے ان کو استعمال کرنے کی کوشش کی، نہ ہی کسی قسم کی مزاحمت کی۔ سیلز نے اس کے سر میں گولیاں ماردیں۔ اس کا بھیجا اڑ کر چھت سے جالگا اور فرش پر اس کا خون پھیل گیا۔

اس سارے آپریشن کے دوران اوباما اور اس کے ساتھی سکرین پر دیکھ نہیں پا رہے تھے جو کچھ عمارت کے اندر ہو رہا تھا۔ اوپر فضا میں موجود ڈرون کے ذریعے وہ صرف عمارت کا بیرونی منظر دیکھ سکتے تھے یا دھماکوں کی آوازیں سن رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں کمانڈر میک رین کی طرف سے وہائٹ ہاؤس کو سگنل موصول ہوگیا Geronimo EKIA جس کا مطلب تھا ''بن لادن آپریشن میں مارا گیا۔'' اوباما نے کہا ''بالآخر ہم نے اس کو پکڑ لیا۔'' اس آپریشن کے دوران کل چار مردوں اور ایک عورت کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور دو عورتوں کو زخمی کیا گیا۔ اس کے بعد سیلز نے حادثہ شدہ ہیلی کاپٹر کے ساتھ دھماکا خیز مواد باندھ کر اس کو اڑا دیا تاکہ اس کے اندر قیمتی ٹیکنالوجی پاکستانیوں کے ہاتھ نہ لگ سکے۔ بلیک سیل نے مردہ بن لادن کے چہرے کی بہت سی تصویریں لیں اور ان کو کمپیوٹر پر اپ لوڈ کر کے واشنگٹن بھیج دیا۔ وہاں ماہرین نے مردہ بن لادن کی تصویروں کا زندہ بن لادن کی تصویروں کے ساتھ بغور موازنہ کیا اور چہرے کے خدوخال اور ان کی پیمائش سے تصدیق کردی کہ یہ اسامہ بن لادن ہی ہے۔ کانفرنس روم میں زبردست خوشی کا اظہار کیا گیا۔ سیلز بن لادن کی لاش گھسیٹ کر سیڑھیوں سے نیچے لائے جب کہ بن لادن کی بارہ سالہ بیٹی صفیہ یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ پھر بن لادن کی لاش کو ہیلی کاپٹر میں لوڈ کردیا گیا۔

اس اثنا میں ایک چنوک ہیلی کاپٹر امدادی کمانڈوز کو لے کر موقع پر پہنچ گیا تھا۔ سیلز نے ایبٹ آباد حویلی سے پانچ کمپیوٹر، بے شمار ہی ڈیز، ڈی وی ڈیز اور بہت سے موبائل فون اکٹھے کر کے ہیلی کاپٹروں پر لوڈ کیے پھر خود سوار ہوگئے اور دونوں ہیلی کاپٹر وہاں سے واپس افغانستان کے لیے روانہ ہوگئے۔ مختصر راستہ اختیار کرتے ہوئے اور نہایت تیز رفتاری سے پرواز کرتے ہوئے دونوں ہیلی کاپٹر مقامی وقت کے مطابق دو بجے صبح جلال آباد کے ہوائی اڈے پہنچ گئے۔ افغانستان میں سی آئی اے اسٹیشن چیف اور میک ریون نے اسامہ بن لادن کی لاش کا معائنہ کیا اور اطمینان کیا کہ یہ اسامہ بن لادن ہی کی لاش ہے۔ آپریشن نپٹیون سپیئر مکمل ہو چکا تھا۔

پاکستان کے سیکیورٹی اداروں کی طرف سے بے خبری، غفلت اور سست ردعمل حیران کن تھا۔ تاخیر کے ساتھ دو F-16 لڑاکا طیاروں نے پرواز کی لیکن کوئی ہدف نہ پاکر واپس چلے گئے۔ پاکستان کے پاس کوئی فضائی نگرانی کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے زمین کے قریب اڑنے والے ہیلی کاپٹروں کو پکڑنا مشکل تھا۔ دوسرے پی اے ایف کے ہوا باز رات کے وقت پرواز کرنے اور آپریشن کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایبٹ آباد سے ہیلی کاپٹروں کے پرواز کر جانے کے

کچھ دیر بعد پاکستانی سیکیورٹی کے افسران وہاں پہنچے۔ انھوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا اور جلتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی حکام کو اطلاع دی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید کوئی تربیتی ہیلی کاپٹر گر کر تباہ ہو گیا ہے۔ حویلی کے اندر انھوں نے بہت سی عورتوں اور بچوں کو روتے اور چیختے چلاتے ہوئے دیکھا۔ جن کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ عمارت کے اندر چار لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ نیچے کویتی کی بیوی زخمی تھی اور اوپر بن لادن کی بیوی زخمی اور بے ہوش پڑی تھی۔ ایک عورت نے ان کو بتایا کہ حملہ آور اسامہ بن لادن کو قتل کر کے ساتھ لے گئے ہیں۔ پاکستانیوں نے بن لادن کی تین بیویوں اور بچوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

صدر اوباما نے صدر آصف علی زرداری کو فون کر کے اسامہ بن لادن کی موت کی خبر سنائی۔ زرداری نے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انہی لوگوں نے ان کی بیوی سابق وزیر اعظم بینظیر بھٹو کو قتل کیا تھا۔ ایڈمرل مائیک مولن نے جنرل اشفاق پرویز کیانی کو فون پر یہی خبر دی۔ کیانی نے مولن کو مبارک باد دی اور کہا کہ اس حملے سے پاکستان کی خودمختاری کی خلاف ورزی ہوئی ہے اور پاکستانی میڈیا اس معاملے کو اچھالے گا۔ اس لیے صدر اوباما کو چاہیے کہ فوری طور پر پریس سے بات کریں اور اس آپریشن کی وضاحت کریں۔ امریکی وقت کے مطابق رات گیارہ بج کر پینتیس منٹ پر صدر اوباما نے وہائٹ ہاؤس میں پریس کے نمایندوں سے خطاب کیا اور بتایا کہ ہم نے القاعدہ کے راہنما اور دہشت گرد اسامہ بن لادن کے خلاف آپریشن کیا ہے اور اس کو ہلاک کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ امریکا اور پاکستان میں ہزاروں معصوم مردوں، عورتوں اور بچوں کے قتل کا ذمہ دار تھا۔

اسامہ بن لادن کی تجہیز و تکفین کا مسئلہ اوباما انتظامیہ کے لیے پریشان کن تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کی کوئی ایسی قبر نہیں بننی چاہیے جو اس کے پرستاروں اور فدائین کے لیے مقدس مرکز کی حیثیت اختیار کر لے۔ چونکہ اسامہ سعودی شہری تھا اس لیے سب سے پہلے سعودی عرب میں سی آئی اے کے سابق اسٹیشن چیف جان برینن نے سعودی نائب وزیر داخلہ شہزادہ محمد بن نائف کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا سعودی حکومت اسامہ بن لادن کی میت کو واپس لینے کے لیے آمادہ ہے۔ اور اگر وہ تیار نہیں تو پھر امریکا اس کی تدفین سمندر میں کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ نائف نے جواب دیا کہ ان کو اس منصوبے پر کوئی اعتراض نہیں۔ امریکی افسران نے اسلامی تدفین کے طریقہ کار پر علما سے مشورہ کیا اور اس کی میت کو ہوائی جہاز کے ذریعے بحری جہاز یو ایس ایس کارل وِنسن پر لے جایا گیا جو پاکستان کے ساحل سے پرے بحیرۂ عرب میں موجود تھا۔ چون سالہ اسامہ بن لادن کے مردہ جسم کو غسل دے کر سفید چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ پھر کفن پوش میت کو ایک بیگ (بوری) میں رکھا گیا اور اس کا وزن بڑھا دیا گیا۔ ایک افسر نے کچھ مذہبی کلمات پڑھے جن کا عربی زبان میں ترجمہ کر دیا گیا پھر میت کو ایک ہموار چپٹے تختے پر رکھ کر سمندر میں گرا دیا گیا۔ یوں مرحوم کو بحیرۂ عرب کی ایک آبی قبر میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔ یہ 2 مئی 2011ء کی صبح گیارہ بجے کا وقت تھا۔

انا اللہ وانا الیہ راجعون

(تصحیح و اعتذار: مضمون کی گزشتہ اقساط میں 9/11 کو نو/9 ستمبر لکھا گیا جب کہ درست تاریخ 11 ستمبر ہے۔ ادارہ اس غلطی

امریکی کالا پانی..... گوانتاناموبے

گوانتاناموبے میں قیدی بھوک ہڑتالیں اور خودکشیاں کیوں کر رہے ہیں؟

ایک بھارتی صحافی کے انکشافات

ترجمہ: پروفیسر محمد فاروق قریشی

(1) گیارہ سال سے قائم انتہائی متنازعہ اور بدنامِ زمانہ امریکی جیل گوانتاناموبے (GTMO) اور اس کے عقوبت خانوں میں قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا ہے۔ (2) مرد قیدیوں سے خواتین کی تفتیش کے جنسی حربے۔ آخر کیوں؟ (3) معصوم اور بے گناہ قیدیوں کو جلد رہا کیوں نہیں کیا جاتا؟ (4) گوانتاناموبے کے قیدیوں پر مادرائے عدالت کارروائیاں عالمی ضمیر پر سوالیہ نشان؟ (5) کیا امن کا نوبل انعام یافتہ صدر گوانتاناموبے جیل کو بند کرنے کے اپنے وعدے پر عمل کرے گا؟

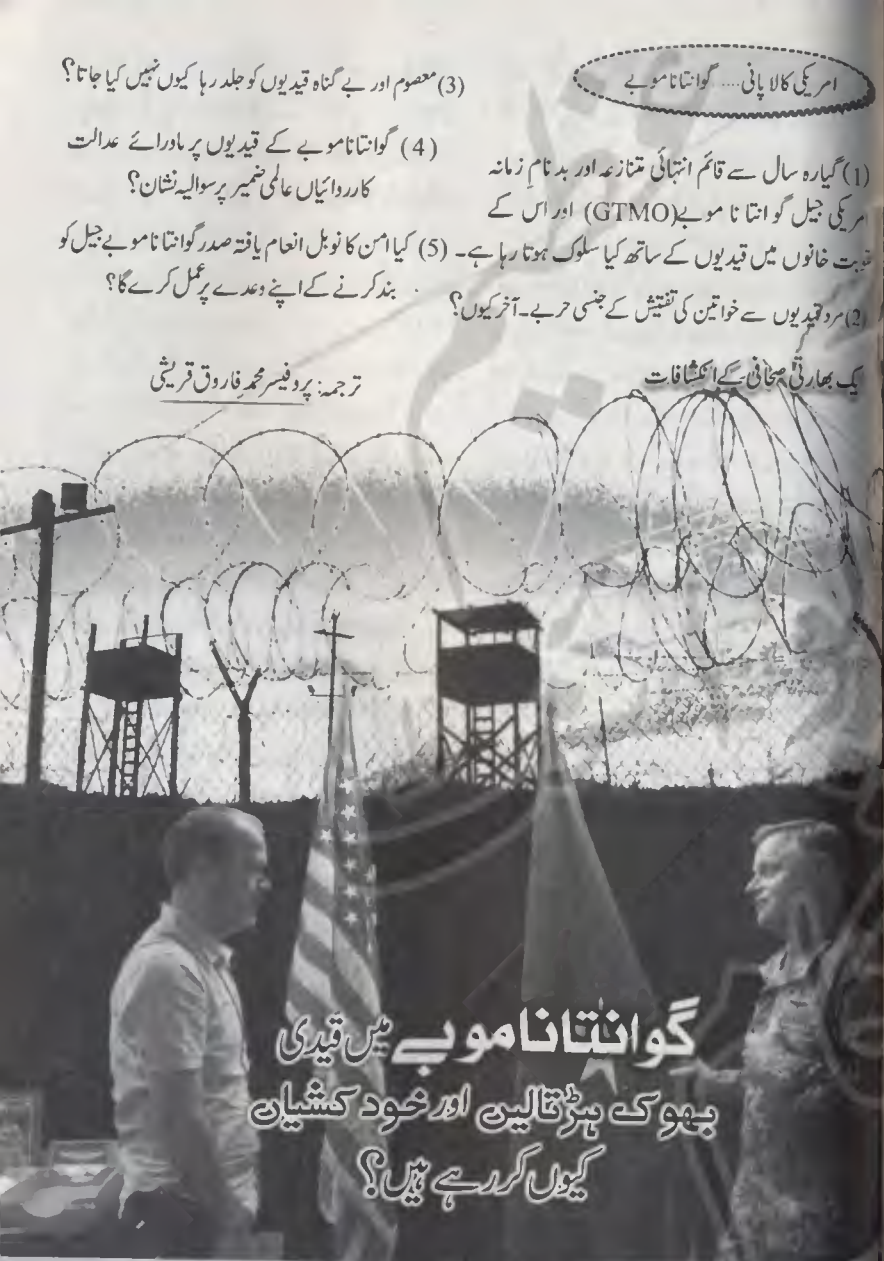

بھارتی

ہفتہ وار میگزین ''دی ویک'' (The Weak) کے خصوصی نامہ نگار سید نزاکت نے بدنام زمانہ امریکی خفیہ قید خانے گوانتانامو کا دورہ کیا اور اس کے کمانڈر اِیر ایڈمرل رچرڈ بٹلر کا انٹرویو بھی کیا۔ اُردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے ان کے مشاہدات اور انٹرویو کا ترجمہ شکریہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

''یہ ایک قلعہ نما قید خانہ ہے جس کے اِردگرد لوہے اور خاردار تاروں کی مضبوط باڑ تعمیر کی گئی ہے۔ جس میں نگرانی کے لیے بُرج بنائے گئے ہیں اور جاسوسی کے لیے کیمرے نصب کیے گئے ہیں۔ باہر سڑک پر اور ساحل کے ساتھ ساتھ مسلح فوجی گشت کرتے ہیں۔ مین حفاظتی چوکی سے چند گز دور محافظوں کا ایک دستہ نئی شفٹ کے لیے حاضر ہے۔ ہر ایک کی وردی پر نام کے بلّے کے بجائے صرف نمبر یعنی عدد لکھا ہوا ہے۔ میرے اور دنیا کے بدنام ترین قید خانے کے درمیان صرف ایک آہنی دروازہ حائل تھا۔ یہاں پہنچنے سے پہلے مجھے فلوریڈا کے قلعہ لاڈرڈیل پر سیکیورٹی چھان بین کے عمل سے گزرنا پڑا۔ اس کے بعد مجھے ایک ERJ-145 ہوائی جہاز پر سوار کروایا گیا۔ جب مین گوانتانامو بے کے لیورڈ فوجی اڈے پر اُترا تو دوبارہ سیکیورٹی کے عمل سے گزرا۔ پھر ایک کشتی میں سوار ہو کر خلیج کے پار وِنڈ ورڈ بیس پر پہنچا۔ اس کے بعد کئی جگہوں پر چھان بین سے گزرا۔ قید خانے کے اندر داخل ہونے کے لیے ہر ایک کو بشمول پینٹا گون افسران سیکیورٹی کلیئرنس اور ایک بلّا (بیج) حاصل کرنا پڑتا ہے۔

جب میں قید خانے کے آہنی گیٹ کے سامنے پہنچ گیا تو ایک محافظ نے اوپر حفاظتی بُرج کی طرف اور پھر مجھے دیکھا۔ اس آخری چھان بین کے بعد اس نے مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے اپنا بایاں بازو بلند کیا اور 'انگوٹھے نیچے' کا اشارہ دیا۔ میرے پیچھے گیٹ بند ہوگیا۔ اس جگہ کو خفیہ قید خانہ بنانے کے گیارہ سال بعد بھی کسی کو بہت کم معلوم تھا کہ اس کے اندر کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ قیدیوں کی فائلوں سے انکشاف ہوا ہے کہ 48 ممالک کے قیدیوں کو یہاں لا کر رکھا گیا۔ ان میں کچھ پختہ دہشت گرد تھے کچھ نہیں تھے۔ قیدیوں کی فہرست ایک افغانی چرواہے، ایک 70 سالہ مُلّا، ایک ٹی وی براڈ کاسٹر سے لے کر 14 سال تک کے بہت سے نوعمر لڑکوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اُن میں سے بہت سے قیدیوں کو بے گناہی اور رہائی تک پہنچنے سے پہلے یہاں وحشیانہ تشدد کے تفتیشی عمل سے گزرنا پڑا۔

گوانتانامو بے میں امریکیوں کی آمد 1898ء کی ہسپانوی جنگ کے دوران شروع ہوئی۔ 1903ء میں کیوبا نے اپنا جنوب مشرقی حصہ امریکا کو بحری جہازوں کے کوئلہ اسٹیشن کے طور پر پٹے پر دے دیا۔ 1934ء میں مستقل پٹے کے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد یہ ایک امریکی اڈا بن گیا۔

اب 120 مربع کلومیٹر کے اس اڈے کا نظم و نسق جوائنٹ ٹاسک فورس گوانتانامو کے ہاتھوں میں ہے۔ گِٹمو (GTMO) جیسا کہ اس کو مختصراً پکارا جاتا ہے فلوریڈا میں موجود امریکا کی جنوبی کمان کا حصہ ہے۔ مشترکہ کمان کے طور پر اس کا عملہ امریکی ایئر فورس، آرمی، نیوی، میرینز اور ساحلی محافظوں سے منتخب کیا گیا ہے۔ یہاں سے بچ نکلنا ممکن نہیں۔ ایک طرف سمندر اس کا محافظ ہے تو دوسری طرف کیوبا کی عمودی پہاڑیاں۔ 1996ء میں امریکی فوج نے صدر کلنٹن کے

کے حکم پر سرحد کے ساتھ ساتھ بارودی سرنگیں بچھا دیں۔ آج اگر کوئی حرکت اور آواز کے وارننگ سسٹم کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو بھی جائے تو وہ بارودی سرنگوں کا شکار ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کیوبا نے اپنی طرف تھور کے خاردار پودوں کی 13 کلومیٹر طویل باڑ کاشت کر رکھی ہے۔ رات کے وقت مجھے دُور فاصلے پر برقی باڑ روشن اور جگمگاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

قید خانے کے اندر مجھے بتایا گیا کہ کس چیز کی تصویر لی جا سکتی ہے اور کس کی نہیں۔ کسی فوجی کی تصویر اس کی رضامندی کے بغیر نہیں لی جا سکتی۔ جن چیزوں کی تصویر لینے کی اجازت نہیں تھی ان میں ساحلی پٹی، بُرج نگرانی، باڑیں، چھان بین کے مقامات، سیکیورٹی کیمرے، دھاتوں کی شناخت کے آلات، تالے، چابیاں، گیٹ، راڈار اور مواصلاتی ساز و سامان شامل تھے۔ گِٹمو کو مختلف قسم کے قیدیوں کے لیے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کے مخصوص نمبر تھے۔

کیمپ اِگوانا میں کسی وقت 12 سال کی عمر تک کے قیدی بچے رکھے جاتے تھے۔ اب یہاں صرف تین چینی قیدی بند ہیں۔ بیشتر قیدیوں یعنی 164 میں سے 146 کو کیمپ نمبر 5 اور نمبر 6 میں رکھا گیا ہے۔ کیمپ نمبر 7 کے محل وقوع کو خفیہ رکھا گیا ہے کیونکہ وہاں پندرہ انتہائی اہم قیدیوں کو رکھا گیا ہے۔ ہر کیمپ کا الگ گیٹ ہے اور اس کی چار دیواری کو خاردار تاروں سے محفوظ بنایا گیا ہے۔

بہت سے قیدیوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ ساحل کے کتنا قریب ہیں۔ ان کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہوائی جہاز کے ذریعے یہاں لایا گیا تھا اور صرف ڈاکٹر یا وکیل سے ملنے کے لیے باہر نکالا جاتا ہے۔ کیمپ سے خروج اور دخول کے وقت ان کی ذلت آمیز جسمانی تلاشی لی جاتی ہے۔ محافظ ان کے جسموں کے خفیہ حصوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھتے ہیں کہ کوئی خارجی چیز جسم کے ساتھ بندھی ہوئی تو نہیں۔

کیمپ نمبر 6 کی ایک کھلی کھڑکی سے میں نے تین قیدیوں کو دیکھا۔ دو خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ تیسرا لمبی ڈاڑھی والا پچاس سالہ دشمن ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور بلند آواز میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس نے موٹے شیشے کی کھڑکی میں سے جھانک کر مجھے دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ جب اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو محافظوں نے مجھے قیدیوں کے تحفظ کی خاطر وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ ڈاڑھی والا آدمی کون تھا؟ محافظ صرف یہ بتا سکا کہ وہ ایک ''دشمن جنگجو'' ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ کیمپ نمبر 6 کے قیدیوں کے حالات زندگی میں بتدریج بہتری آئی ہے۔ اطاعت شعاری کے درجوں کے مطابق قیدیوں کو دن میں نو گھنٹے تک صحن میں آزادانہ گزارنے کی اجازت ہے۔ ہر قیدی کے کمرے میں ایک بیڈ، ایک دھاتی بیت الخلا اور ہاتھ منہ دھونے کا تسلہ لگا ہوتا ہے۔ قیدیوں کو قرآن، کتابیں، قلم اور کاغذ میسر ہوتا ہے۔ کچھ قیدی خطوط اور نظمیں لکھتے ہیں۔ گِٹمو سے لکھی گئی ''نظم بنام سمندر'' کیرالا کی کالی کٹ یونیورسٹی کے انگریزی شاعری کے نصاب میں شامل کی گئی تھی۔ الربائش کے قلمی نام سے تحریر کردہ اس نظم کو بعد میں نصاب سے خارج کر دیا گیا۔ ابراہیم سلیمان محمد اربائش عرف الربائش ایک سعودی اور گِٹمو کا سابق قیدی ہے جس کو دسمبر 2006ء میں رہا کیا گیا تھا۔ وہ سعودی عرب سے فرار ہو گیا اور اب اغلباً یمن میں رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جزیرہ

نمائے عرب میں القاعدہ کا مفتی ہے۔

کیمپ نمبر 6 کے قیدیوں کو کسی بھی وقت اپنے کمروں سے باہر آنے اور دوسرے قیدیوں سے ملنے جلنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اپریل میں تشدد کی لہر پھوٹ پڑی تو اس آزادی کو سلب کر لیا گیا۔ پھر بھی محافظوں کے اندر یہ لطیفہ گردش کرتا ہے کہ کیمپ نمبر 6 کے قیدیوں کو پہلے سے زیادہ سہولتیں حاصل ہیں۔ محافظ گھروں میں رہتے ہیں بعض اوقات ایک کنٹینر پہلے سے تیار گھر میں چھ محافظ۔ افسروں کو بہتر رہائش گاہیں میسر ہیں۔ محافظوں کے لیے گٹمو محض خشک اور بور جگہ نہیں۔ یہاں ایک مفت سینما گھر، مکڈونلڈ اور جرک ہاؤس کے ریستوران، ایک جمیکن ریستوران، عمدہ شراب اور سستی بیئر کے کئی اڈے موجود ہیں۔

جب میں کیمپ نمبر 6 میں گھوم رہا تھا تو ابو فراج اللبی کو کیمپ ایکو میں اس کے وکلا سے ملوانے کے لیے ایک وین میں باہر لایا گیا۔ اللبی یعنی لیبیائی باشندے کو جب 2005ء میں پاکستان میں پکڑا گیا تو وہ القاعدہ کا نمبر 3 راہنما تھا۔ اس نے 9/11 کے منصوبہ ساز خالد شیخ محمد کی جگہ سنبھالی تھی جب اسے 2003ء میں پاکستان میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اللبی نے پاکستان کے سابق صدر پرویز مشرف کو قتل کرنے کی دو مرتبہ کوشش کی۔ اس کا منصوبہ تھا کہ القاعدہ کے جنگجوؤں کو بھارتی فوج سے لڑنے کے لیے کشمیر بھیجا جائے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ اس نے 2006ء میں برطانیہ سے پرواز کر کے امریکا اور کینیڈا جانے والے ہوائی جہازوں کو سیال دھما کا خیز مواد سے اڑانے کی ناکام منصوبہ بندی کی تھی۔

اللبی نے افغانسان میں الفاروق کیمپ میں القاعدہ کے بہت سے آدمیوں کو تربیت دی ان میں سے ایک آسٹریلوی ڈیوڈ ہکس تھا جس نے کنٹرول لائن پار کر کے کشمیر میں داخل ہونے کی تین ناکام کوششیں کیں۔ اسے 2001ء میں افغانستان میں گرفتار کر لیا گیا اور گٹمو بھیج دیا گیا جہاں وہ پانچ سال رہا۔ بعد میں اس کو آسٹریلیا منتقل کر کے رہا کر دیا گیا۔ 38 سالہ ہکس اب شادی شدہ ہے اور سڈنی میں رہتا ہے۔ 2010ء میں رینڈم ہاؤس آسٹریلیا نے اس کی خودنوشت سوانح حیات اس نام سے شائع کی۔ ''گوانتاناموبے: میرا سفر۔''

کیمپ نمبر 6 کے مقابلے میں کیمپ نمبر 5 کے قیدیوں کی زندگی کے حالات مایوس کن ہیں۔ یہ کیمپ انتہائی سخت حفاظتی حصار میں ہے۔ یہاں دس سالہ قیدی بھی 22 گھنٹے 12 x 8 کی کوٹھڑیوں میں گزارتے ہیں۔ ہر کوٹھڑی میں ایک نگران کیمرا لگا ہوا ہے اس کے علاوہ ہر تین منٹ بعد محافظ لوہے کے دروازوں میں نصب کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھتے ہیں۔ اس وقت یہاں 58 قیدی ہیں جن میں سے 46 کو ''دائمی قیدی'' قرار دیا گیا ہے۔ ممکن ہے ان پر کبھی مقدمہ چلے نہ رہائی ملے۔ عدنان لطیف نامی ایک نوجوان یمنی یہاں گزشتہ سال چل بسا۔ اس کی موت کو خودکشی قرار دیا گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتا چلا کہ نفسیاتی مرض کی زیادہ دوا موت کا سبب بنی۔ عدنان کو 2011ء میں پاک افغان سرحد پر پکڑا گیا تھا۔ اس کی خفیہ فائل کے مطابق فوج نے دسمبر 2006ء میں اس کی رہائی کی سفارش کی تھی۔ جنوری 2008ء میں رہائی کی سفارش کا اعادہ کیا گیا لیکن رہائی عمل میں نہ آسکی۔ اوباما انتظامیہ یمن کی کمزور سیکیورٹی کے پیش نظر یمنی قیدیوں کو وطن واپس بھیجنے کے لیے آمادہ نہ تھی۔ عدنان کے وکیل ڈیوڈ ریمس نے بتایا کہ عدنان اتنا پریشان تھا کہ ایک مرتبہ اس نے ملاقات کے دوران ڈیوڈ کی کلائی پر کاٹ لیا اور خون کے چھینٹے ہر طرف بکھر گئے۔ ریمس نے کہا ''میں نے گٹمو میں بہت سی ناخوشگوار چیزیں دیکھی ہیں لیکن اتنا تکلیف دہ واقعہ کوئی اور نہیں دیکھا۔''

کیمپ نمبر 5 میں تفتیشی کمروں کا رنگ نیلا ہے اور صوفے بھی اسی رنگ کے ہیں۔ کچھ تفتیش کنندگان خواتین ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے پیار بھرے لمس اور نیم برہنہ لباس کے ذریعے قیدیوں سے کچھ اگلوانے کی کوششیں کی ہیں۔ سابق امریکی سارجنٹ ایرک آرسار جس نے گٹمو میں خدمات انجام دیں تھیں کہا کہ ایک خاتون نے تفتیش کے دوران ایک سعودی قیدی کے چہرے پر حیض کا مصنوعی خون لگا دیا۔

پینٹا گون کی طرف سے تفتیش کنندگان کو راہنما اشارے دیے گئے ہیں کہ کن کن طریقوں سے قیدی ان کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ دستاویز کے مطابق سرکش باغیوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ایمان کو یاد کر کے تفتیش کی مزاحمت کر سکتے ہیں۔ اس لیے بہت سے قیدی سمجھتے ہیں کہ قید میں رہنا عظیم تر جہاد ہے۔ کچھ قیدی آپس میں تعاون کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی تائید کے لیے یا تفتیش کنندہ کو سچائی سے دور رکھنے کے لیے کہانیاں بنا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اللبی اسامہ بن لادن کی ہلاکت سے کم از کم چھ سال پہلے اس کی جائے رہائش کے بارے میں جانتا تھا۔ پھر بھی اس نے ہر موڑ پر تفتیش کنندگان کو گمراہ کیا۔ مجھے ایک چھوٹا سا کمرا دکھایا گیا جس میں ٹی وی موجود تھا اور بتایا گیا کہ جو قیدی احکام کی تعمیل کرتے ہیں وہ یہاں ٹی وی پروگرام دیکھ سکتے ہیں لیکن ان کو فرش کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا جاتا ہے اور ٹی وی صرف تفریح کا ذریعہ نہیں یہ معلومات اکٹھی کرنے کا آلہ بھی ہے۔ ''وہ تازہ بہ تازہ سیٹلائٹ ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں اس طرح وہ دنیا بھر میں پیش آنے والے واقعات سے باخبر ہو جاتے ہیں۔'' گوانتانامو کے ترجمان کیپٹن رابرٹ ڈیورنڈ نے کہا۔ ''جب آپ اہم واقعات کو دیکھتے ہیں تو یہ تعلق اور وابستگی کا معاملہ ہوتا ہے...... جن کے ساتھ آپ اسکول جاتے تھے، جن کے ساتھ آپ نے تربیت لی...... اس طرح قیدی کو ٹی وی تک رسائی کے فائدے ہیں۔''

2006ء میں 14 انتہائی اہم قیدی جو سب کے سب القاعدہ کی چوٹی کی قیادت سے تعلق رکھتے تھے سی آئی اے کی تحویل سے گوانتانامو منتقل کیے گئے۔ بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ ان کو کیمپ نمبر 5 میں رکھا گیا ہے لیکن وہ کیمپ نمبر 7 میں تھے۔ یہاں خالد شیخ محمد موجود ہے۔ اس کی حراست پر خبروں کی سرخیاں بنی تھیں جب یہ معلوم ہوا کہ اس کو ایک ماہ میں 183 مرتبہ پانی کی بوچھاڑ (واٹر بورڈنگ) کا نشانہ بنایا گیا۔ گٹمو میں بہت سے افسران یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کویت میں جنم لینے والے اور امریکا میں تعلیم حاصل کرنے والے مکینیکل انجینئر کو کس چیز نے دہشت گردی اختیار کرنے پر مائل کیا۔ حیران کن طور پر وہ نہایت فرمانبردار قیدی ہے اور بھوک ہڑتال سے اجتناب کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اسلام میں حرام سمجھتا ہے۔ اس کے وکلا کو پینٹا گون کی طرف سے منع کیا گیا ہے کہ وہ اس کی تفتیش اور عقوبت خانوں کی تفصیلات پر بحث کریں۔ کیونکہ یہ چیز امریکا کی قومی سلامتی کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔

ایک شام بحریہ کے افسران کے رہائشی کمروں کے قریب ایک چھوٹے سے کافی ہاؤس میں میری ملاقات ایک عرب مترجم سے ہوگئی۔ وہ 2005ء سے گٹمو میں آ رہا ہے اور عرب قیدیوں اور ان کے وکلا کے درمیان

ہونے والی گفتگو کا ترجمہ کرتا ہے۔ اس نے کہا ''بھارت میں آپ نے 26/11 کے ممبئی حملوں کے دوران زندہ پکڑے جانے والے واحد دہشت گرد اجمل قصاب کو ایک غیر جانبدارانہ مقدمے میں اپنا دفاع کرنے کا موقع دیا اس کے باوجود کہ وہ بے گناہ لوگوں کو ہلاک کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ گِٹمو میں بالکل بے گناہ افراد موجود ہیں لیکن غیر جانبدارانہ مقدمہ تو درکنار، ان پر کبھی مقدمہ چلایا ہی نہیں گیا۔'' جب ہم قیدیوں کی حالت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، دو آدمی سائڈ والے میز پر بیٹھ گئے۔ اچانک مترجم نے کہا کہ ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ وہ سی آئی اے کے آدمی تھے۔ میں نے گوانتانامو میں جن قیدیوں کو سب سے پہلے دیکھا وہ کیوبا کے روشن آفتاب کی دھوپ میں سپورٹس سوٹ پہنے ہوئے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے۔ وہ بیس افغانی 11 جنوری 2002ء کو کیمپ ایکس رے میں لائے گئے تھے۔ لیکن آج وہ کیمپ ویران ہے اور گدھوں اور چوہوں کی آماجگاہ ہے۔ کیمپ کے کنارے پر کے-9 یونٹ کا کمرا ہے جہاں قیدیوں کو ڈرانے والے خونخوار کتے رکھے گئے تھے۔ اس کیمپ کو عرصہ پہلے مسمار کر دیا جاتا اگر ایک وفاقی جج نے یہ فیصلہ نہ دیا ہوتا کہ اس کے ڈھانچے کو مستقبل میں قیدیوں کے ساتھ ممکنہ بدسلوکی کی تحقیق کے لیے محفوظ رکھا جائے۔

میرے راہنما نے جو کہ ایک خوش مزاج نوجوان تھا بتایا کہ یہ ایک عارضی کیمپ تھا جہاں تقریباً 300 قیدیوں کو رکھا گیا تھا۔ 12 سالہ اسمٰعیل آغا سب سے کم عمر افغانی قیدی تھا۔ اِسے 2002ء میں ایک افغان جنگجو سردار نے گرفتار کر کے پانچ ہزار ڈالر انعام کے لالچ میں امریکی فوجیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ 14 ماہ کی قید کے بعد 2004ء میں اُسے رہا کر دیا گیا۔ مقدمات کی فائلیں ظاہر کرتی ہیں کہ کم از کم سترہ قیدیوں کی عمر اٹھارہ سال سے کم تھی اور کم از کم دو کی عمر چودہ سال سے بھی کم تھی۔ قیدی بچوں کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے کیونکہ بہت سے قیدیوں کی عمر معلوم نہیں تھی یا مٹا دی گئی تھی۔ فائلوں پر دیے گئے نوٹ ظاہر کرتے ہیں کہ امریکی فوج جلد اس نتیجہ پر پہنچ گئی کہ یہ بچے معصوم ہیں۔ پھر بھی وہ کئی سال گِٹمو میں قید رہے۔ ان میں سے ایک 16 سالہ یاسر تھا جس نے خودکشی کر لی۔ ایک قیدی جس نے اپنے وکیل کے ذریعے ''دی ویک'' سے رابطہ کیا، بتایا کہ بہت سے قیدی مایوسی اور افسردگی کا شکار ہیں اور بہت سوں نے خودکشی کی کوششیں بھی کی ہیں۔

قید خانے کے ہسپتال میں اوسطاً ہر روز تین چار قیدی لائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈوناٹزہ کے مطابق ان میں سے بیشتر افسردگی، بے چینی، واہمے اور دوسرے نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

''ہم قیدیوں کو بہترین علاج فراہم کرتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہمارے لیے وہ بس مریض ہیں۔'' اس وقت کیمپ ڈیلٹا ہسپتال کا کام دے رہا ہے۔ تاہم ڈاکٹر نے مخصوص قیدیوں جیسے کہ عبیداللہ جو بارہ سال سے یہاں قید ہے، کی صحت کے بارے میں سوالات کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ عبیداللہ کی عمر انیس سال تھی جب اسے مشرقی افغانستان میں اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اسے نصف شب کے وقت پکڑا گیا جب قریب ہی ان کی خاندانی زمین سے ایک نوٹ بک اور کچھ بارودی سرنگیں امریکی فوجیوں کے ہاتھ لگیں۔ ان کو حویلی کے اندر ایک مستعار لی ہوئی وین

بھی ملی جس کی عقبی نشست پر خون کے دھبے تھے۔ فوجیوں کو شک ہوا کہ وین کو القاعدہ کے زخمی آدمیوں کو سرحد پار پاکستان لے جانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ عبیداللہ کے وکیل میجر ڈیرک پوٹیٹ جو ایک امریکی کمانڈو تھا، نے ثبوت جمع کرنے کے لیے تین مرتبہ افغانستان کا سفر کیا۔ ''میں اس کے کنبے کے افراد سے پوچھتا رہا کہ کیا یہ درست ہے کہ وہ القاعدہ کے زخمی جنگجوؤں کو گاڑی میں لے کر جاتا تھا۔'' اس نے کہا کسی نے خون آلود وین کے بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا۔ حتیٰ کہ ایک دن ایک عمر رسیدہ شخص آگے آیا جو کچھ اس نے کہا پریشان کن تھا۔''

امریکی فوجی افسران تسلیم کرتے ہیں کہ بعض قیدی محض غلط وقت پر غلط جگہ پر ہونے کی وجہ سے گرفتار ہوئے

پوٹیٹ نے بتایا کہ گرفتاری سے دو دن پہلے عبیداللہ نے اپنی بیوی کو زچگی کے لیے ہسپتال لے جانے کے لیے وین اُدھار لی۔ راستے ہی میں اس کو زچگی کا درد شروع ہو گیا اور اس نے وین کے اندر ہی ایک بچی کو جنم دیا۔ اسی وجہ سے نشست پر خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ افغانستان میں لوگ اپنی عورتوں کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے'' پورٹیٹ نے کہا۔ '' خاندان کی عورتوں کے بارے میں ویسے ہی بات کرنا ممنوع ہے ان کی صحت اور زچگی کے بارے میں گفتگو تو درکنار۔'' عبیداللہ کی گرفتاری سے دو دن پہلے جو بچی پیدا ہوئی تھی، قید ہونے کے بعد اس گیارہ سالہ بیٹی سے اس کا پہلا رابطہ گذشتہ برس وڈیو فون کے ذریعے ہوا۔ امریکی فوجی افسران تسلیم کرتے ہیں کہ بعض قیدی محض غلط وقت پر، غلط جگہ پر ہونے کی وجہ سے گرفتار ہوئے۔ کچھ کو افغان جنگجو سرداروں اور پاکستانی فوج نے انعام کے بدلے فروخت کر دیا۔ امریکی حکومت کی طرف سے قبائلی علاقوں میں ہوائی جہاز سے اشتہارات گرائے جاتے تھے جن میں ہر گرفتار دہشت گرد کے بدلے پانچ ہزار ڈالر کا وعدہ ہوتا تھا۔ جنگ کی اس دھند میں بہت سے بے گناہوں کو مشکوک اور دہشت گرد سمجھ لیا گیا۔ کچھ کو شاہراہوں پر فوجی کارروائیوں اور چھان بین کی چوکیوں پر بلا تحقیق پکڑ لیا گیا۔ کچھ اس لیے پکڑ لیے گئے کہ ان کے پاس کیسیو F-91W گھڑی تھی۔ سی آئی اے کو یقین تھا کہ بن لادن کے تربیت یافتگان اس سستی گھڑی کو بموں میں ٹائمر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ کم از کم پچاس ایسے قیدیوں کے پاس گرفتاری کے وقت یہ گھڑی موجود تھی۔

گِٹمو میں آنے والے بائیس چینی قیدی یگور کے مسلمان تھے جو تشدد سے بچنے کے لیے اپنے آبائی صوبے سنکیانگ سے فرار ہو گئے اور سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہو گئے جہاں ان کو پکڑ لیا گیا اور انعام کی خاطر فروخت کر دیا گیا۔ ان میں سے انیس کو رہا کر دیا گیا اور البانیہ، سویڈن سمیت مختلف ممالک نے ان کو پناہ دے دی۔ تین ابھی یہیں ہیں کیونکہ بہت سے ممالک چین کی ناراضی کے خوف سے ان کو لینے کے لیے تیار نہیں۔ ان میں ایک عبدالغفور دس

سال سے زائد عرصے سے گٹمو میں مقید ہے۔

164 قیدیوں میں سے کم از کم 84 کو الزامات سے بری کر کے رہائی کی اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ اپنے ملک یا کسی اور ملک جاسکتے ہیں۔ ان کی منتقلی میں سہولت پیدا کرنے کے لیے صدر اوباما نے واشنگٹن کے ایک سینئر وکیل اور میگزین ''سلیٹ'' کے پبلشر کلفورڈ سلون کو اپنا نمایندہ مقرر کیا ہے۔ ''تاہم یہاں پالیسی میں ایک اندرونی تضاد پایا جاتا ہے۔'' وکیل ریمس نے کہا'' وزارت خارجہ دوسرے ممالک کو قائل کر رہا ہے کہ رہاشدہ قیدیوں سے کس قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن وزارت انصاف عدالت میں یہ دلیل دے رہی ہے کہ امریکا ان قیدیوں کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے کیونکہ وہ القاعدہ کا حصہ ہیں۔''

صدر جارج بش نے گٹمو کو اس کی ماورائے عدالت حیثیت کی وجہ سے منتخب کیا تھا..... یہ امریکا اور اس کی دولتِ مشترکہ کی حدود سے باہر ہے۔ اس لیے کسی بھی شہری عدالت کی پہنچ سے دور ہے۔ نوبل امن انعام یافتہ ہونے کے باوجود صدر اوباما گٹمو قید خانے کو بند کرنے کے اپنے پانچ سال پرانے وعدے کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کئی لحاظ سے گٹمو امریکا کی ان تمام غلطیوں کی ایک مثال ہے جن کا وہ دہشت گردی کی جنگ میں ارتکاب کرتا رہا ہے۔ پانچ سال قبل 23 مئی کو قومی سیکیورٹی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اوباما نے کہا ''مستقبل کا تصور کریں جس میں اب سے دس سال یا بیس سال بعد امریکا نے ابھی تک ایسے لوگوں کو، جن پر کسی جرم کا الزام نہیں، ایک ایسی جگہ پر قید کر رکھا ہوگا جو ہمارے ملک کا حصہ نہیں۔ کیا ہم اس قسم کا کام کرنے والے لوگ ہیں؟ کیا ہمارے ملک کے بانیوں نے اس قسم کی چیزوں کی پیش بینی کی تھی؟''

امریکا نے گٹمو کے قیدیوں کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا ہے اس پر عالمی سطح پر احتجاج کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے گٹمو کو اس دور کا گولاگ (جبری تشدد اور مشقت کا روسی کیمپ) قرار دیا ہے۔ ''بیشتر قیدیوں کو بغیر کسی الزام یا مقدمے اور بیرونی دنیا سے رابطے کے غیر معینہ عرصے کے لیے قید رکھا جاتا ہے۔'' ایمنسٹی انٹرنیشنل کے راب فریر نے کہا ''اس قید خانے کو بند کر دینا چاہیے۔''

اگر ہر چیز منصوبے کے مطابق چلتی ہے تو اگلے سال گٹمو میں، پچھلے پچاس برسوں میں امریکا کی طرف سے قائم کیا جانے والا پہلا جنگی جرائم کا مقدمہ شروع ہوگا۔ ایک متروک رن وے پر کیمپ جسٹس قائم کرنے کے لیے ایک سو خیمے ایستادہ کیے گئے ہیں جہاں مقدمات چلائے جائیں گے۔

تاہم جوائنٹ ٹاسک فورس گٹمو کے کمانڈر ریئر ایڈمرل رچرڈ ڈبلیو بٹلر نے ''دی ویک'' کو بتایا کہ تمام قیدیوں کے ساتھ مربیانہ سلوک کیا جارہا ہے۔ چینی قیدیوں کو علیحدہ رکھنے کا دفاع کرتے ہوئے کمانڈر نے کہا کہ یہ اقدام ان کے تحفظ، سلامتی اور تعاون کے پیشِ نظر کیا گیا ہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ خطرناک قیدی کا نام بتانے سے احتراز کیا۔ ''کیا ایک دہشت گرد کو نارمل زندگی گزارنے پر مائل کیا جا سکتا ہے؟'' میں نے استفسار کیا اور ان کا جواب تھا ''یہ ممکن ہے لیکن ہم یہاں یہ کام نہیں کر رہے۔ ہم قیدیوں کو یہاں روک کر یہ یقینی بنا رہے ہیں کہ وہ میدانِ جنگ سے دور رہیں۔''

جس چیز نے گٹمو کو دوبارہ توجہ کا مرکز بنا دیا ہے وہ قیدیوں کی طرف سے وسیع پیمانے پر بھوک ہڑتال ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق یہ اس وقت شروع ہوئی جب سیکیورٹی گارڈز نے قرآن کو غیر قانونی طور پر سمگل کی ہوئی چیز سمجھا۔ قیدیوں نے اس کو قرآن کی بے حرمتی قرار دیا اور بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ فوج کا کہنا ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔ فوجی ترجمان نے کہا ہڑتال کے دوران قیدیوں نے 160 میں سے 147 سیکیورٹی کیمروں کو ڈھانپ دیا۔ 13 اپریل کو جب فوجی نفسادات کو روکنے والے ساز وسامان کے ساتھ کیمپ نمبر 6 میں داخل ہوئے، تو انھیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کے ایک فوٹو گراف سے پتا چلا کہ فوج نے قیدیوں کے قبضے سے لکڑی، پلاسٹک اور سٹیل کے ڈنڈے وغیرہ بھی پکڑے۔ ہڑتالی قیدیوں کی تعداد کم ہو کر اب 19 رہ گئی ہے۔

گٹمو کے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ جب ایک قیدی مسلسل نو مرتبہ کھانے سے انکار کرتا ہے، تو اسے بھوک ہڑتال پر سمجھا جاتا ہے۔ تب اس کو ہسپتال میں لا کر باندھ دیا جاتا ہے اور ناک کے راستے ٹیوب کے ذریعے خوراک دی جاتی ہے۔ قیدیوں کا کہنا ہے یہ عمل جو دن میں دو مرتبہ کیا جاتا ہے بہت تکلیف دہ ہے۔

''امریکی وزارت دفاع اپنی تحویل میں قیدیوں کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائیں۔ ہم ان کو بھوک ہڑتال سے یا کسی سمگل شدہ چیز سے خودکشی کی اجازت نہیں دیں گے۔'' پینٹاگون کے ترجمان لیفٹیننٹ کرنل ٹاڈ بریسیل نے کہا ''جن قیدیوں کی صحت کی حالت زندگی کے لیے خطرہ بن جاتی ہے ہم ان کو اس طریقے سے خوراک دیتے ہیں۔'' کم از کم ایک سعودی قیدی عبدالرحمٰن شیلابی 2005ء سے بھوک ہڑتال پر ہے۔ بیشتر قیدی مایوس ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ 2002ء سے کسی مقدمے کے بغیر قید تنہائی بھگت رہے ہیں۔ ان کو انٹرنیشنل ہلال احمر کے ذریعے

گٹمو کے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ جب ایک قیدی مسلسل نو مرتبہ کھانے سے انکار کرتا ہے، تو اسے بھوک ہڑتال پر سمجھا جاتا ہے۔

سال میں چار مرتبہ فون کرنے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن ان کے گھر والوں کو ملاقات کی اجازت بالکل نہیں۔ قیدیوں میں سے ایک کینسر سے اور ایک دل کے عارضے سے مرگیا اور سات نے خودکشی کرلی۔

لیکن محافظوں کا اصرار ہے کہ قیدیوں کا رویہ اکثر غیر اخلاقی اور جارحانہ ہوتا ہے۔ ''وہ اپنے کمروں سے چلاتے رہتے ہیں۔ وہ خواتین محافظوں کو گالیاں دیتے ہیں۔'' ایک سارجنٹ نے بتایا ''ہمارے لیے ڈیوٹی کے طویل اور تناؤ بھرے اوقات بڑی جانفشانی کا کام ہے۔'' اپنے دعویٰ کی تائید میں ایک فوجی افسر مجھے کیمپ نمبر 5 کے ایک خالی کمرے میں لے گیا۔ کمرے کی چھت پر فوم کی موٹی چادر لگی ہوئی تھی۔ مجھے فوم کا ایک داغدار ٹکڑا دکھایا گیا۔ افسر نے کہا کہ اس پر سوکھا ہوا پاخانہ لگا ہوا ہے۔ محافظوں کا کہنا تھا کہ قیدی ایک کپ میں پاخانہ، پیشاب، خون اور تھوک ملاتے ہیں اور اس کو محافظ کے چہرے پر پھینک دیتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے محافظوں کی وردیوں پر نام کے ٹیگ نہیں ہوتے۔ گمنامی تحفظ فراہم کرتی ہے اور یہ قیدیوں کو محافظوں کے ساتھ وابستگی قائم کرنے میں بھی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ کم از کم ایک محافظ ٹیری سی ہولڈ بُروکس جونیئر ایک قیدی کے ایمان سے متاثر ہوکر مسلمان ہو گیا۔ ہولڈ بروکس نے اپنا نام تبدیل کر کے مصطفیٰ عبداللہ رکھ لیا۔ اس وقت سے محافظوں اور قیدیوں کے درمیان گفتگو ممنوع ہے۔

گٹمو ایک اخلاقی سوال بھی اٹھاتا ہے اور یہ بہت زیادہ برمحل ہو جاتا ہے جب سینٹ جان چرچ واشنگٹن کا سابق پادری عزت مآب ڈاکٹر لُوئیس لیون اس پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیون گوانتاناموبے میں پیدا ہوا تھا اور 12 سال کی عمر میں اکیلا امریکا منتقل ہوگیا۔ جنوری میں اس نے اوباما کی دوسری مدت صدارت کی تقریب حلف وفاداری میں اختتامی دعا کروائی۔ ''ہمیں کسی قیدی پر تشدد نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ظالمانہ اور غیر اخلاقی ہے۔'' لیون نے کہا، ''خواہ کچھ بھی ہو جائے ہمیں گٹمو کے قیدیوں کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔'' سینٹ جان چرچ کو روایتی طور پر امریکی صدر کا چرچ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ صدر جیمز میڈیسن (1809-1817ء) سے لے کر اب تک ہر صدر کبھی نہ کبھی یہاں ضرور آتا ہے۔ چرچ کی نشست نمبر 54 کو مستقل طور پر صدارتی نشست کا درجہ دیا گیا ہے۔ جنگِ افغانستان تک زیادہ تر امریکی بحری فوج کی سنسنی خیز فلم 'A Few Good Men' کی بدولت گوانتاناموخلیج کے بحری اڈے کے بارے میں جانتے تھے۔ فلم کی طرح ان قیدیوں کے انجام کا تعین بھی عدالت کرے گی۔

میں شام کے اندھیرے میں اس بحری اڈے کے بلند ترین مقام جان پال جونز ہل پر کھڑا تھا۔ آفتاب سمندر میں غروب ہوگیا اور خاردار تاروں والی باڑھ تاریکی کے کمبل میں چھپ گئی۔ لیکن قید خانے کے کیمپوں کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ شاید وہاں کوئی سوتا نہیں۔ کم از کم محافظ تو نہیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے محافظوں کی نئی شفٹ نے فرائض سنبھال لیے۔ فارغ ہونے والے دن بھر کی تھکن اور گرد اتارنے کے لیے چل دیے..... کل تک کے لیے۔

انٹرویو

جوائنٹ ٹاسک فورس گوانتاناموکے کمانڈر ایئر ایڈمرل رچرڈ بٹلر گوانتاناموبے میں قید خانے اور قیدیوں کی سیکیورٹی کے انچارج ہیں۔ انھوں نے گٹمو کی کمان ایسے وقت سنبھالی ہے جب بہت سے قیدی بھوک

ہڑتال پر ہیں اور یہ مباحثہ بھی زوروں پر ہے کہ کیا ان قیدی کیمپوں کو بند کر دیا جائے۔ نمایندہ (دی ویک) کے ساتھ ایک انٹرویو میں ایڈمرل بٹلر نے بھوک ہڑتال، قرآن کی بے حرمتی کے الزامات اور قیدیوں کی تفتیش کے بارے میں گفتگو کی۔ بھارت کے بارے میں انھوں نے کہا کہ 26/11 کے ممبئی حملوں پر ان کو بہت دکھ ہوا۔ ''ان حملوں کے بعد جب میں ممبئی گیا تو میں تاج محل پیلس ہوٹل اور لیوپولڈ کیفے کو دیکھنے گیا۔ اس قسم کے المناک سانحات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم دہشت گردی کے خلاف اپنی جدوجہد کو کم نہیں کر سکتے۔'' انھوں نے کہا۔

ایڈمرل ٹیلر کے انٹرویو کے اقتباسات

سوال: گٹمو کو دنیا کا انتہائی متنازعہ، بدنام اور خطرناک قید خانہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ کیا کہیں گے؟

جواب: ایک قید خانے کے طور پر یہ واقعی متنازعہ ہے۔ لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کروں گا کہ یہ خطرناک ترین قید خانہ ہے۔ ہم موجودہ حالات میں جہاں تک ممکن ہے قیدیوں کے ساتھ مشفقانہ سلوک کرتے ہیں۔

سوال: قیدیوں کو مختلف کیمپوں میں کیوں رکھا جاتا ہے؟

جواب: مختلف قیدیوں کے لیے مختلف حالات ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کو گروہی جگہ پر رکھا جاتا ہے جہاں وہ سارا دن اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ ان کو رات کے وقت چند گھنٹوں کے لیے کمروں میں مقفل کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ ہمارے انتہائی سخت حفاظتی درجے ہیں جہاں ہم قیدیوں کو دن رات میں 22 گھنٹوں تک مقفل رکھتے ہیں۔

سوال: کیمپ نمبر 7 کا محل وقوع خفیہ کیوں رکھا گیا ہے؟

جواب: بہت سے لوگ کیمپ نمبر 7 میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن کیمپ نمبر 7 کے بارے میں پالیسی اعلیٰ حکام بناتے ہیں۔ ہم صرف اس کی پابندی کرتے ہیں۔ کیمپ نمبر 7 تک رسائی میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں۔

سوال: کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کیمپ میں 9/11 کے ملزمان کو رکھا گیا ہے؟

جواب: یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ 9/11 کے ملزمان کو وہاں رکھا گیا ہے اور ان پر فوجی تفتیش کا عمل جاری ہے۔

سوال: گٹمو کے قیدیوں کے معاملے میں قانونی محاذ پر کیا ہو رہا ہے؟

جواب: ہمارے پاس یہاں مختلف اقسام کے قیدی ہیں۔ جن کی بات آپ کر رہے ہیں ان پر 9/11 کے حملوں کے سلسلے میں الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ اس وقت گٹمو میں مقدمات کی ابتدائی سماعت ہو رہی ہے۔ ایک سماعت ہم نے پچھلے ہفتے مکمل کی۔ وہ اگلے سال تک جاری رہیں گی۔ یہ ایک طویل طریقہ کار ہے۔

سوال: کیا قیدیوں پر کبھی مقدمہ چلایا جائے گا؟

جواب: ہاں! ان پر جیوری مقدمہ چلائے گی اور فیصلہ کرے گی۔

سوال: 2002 میں جب سے یہ قید خانہ قائم کیا گیا، پہلی مرتبہ قیدیوں پر مقدمات چلائے جارہے ہیں۔

جواب: ہاں! یہ درست ہے۔ ماضی میں دوسری قسم کی قانونی کارروائیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں قانونی عمل کی رفتار واقعی تیز کی جارہی ہے۔

سوال: کیا اسامہ بن لادن کی ہلاکت کے بعد قیدیوں کے رویے میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے؟

جواب: آپ مجھ سے ایک مشکل سوال پوچھ رہے ہیں کیونکہ آپ مجھ سے قیدیوں کی سوچ کے عمل کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ جو کچھ وہ سوچتے ہیں میں اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ ہم نے مختلف وجوہات کی بنا پر محافظوں کے ساتھ ان کے رویے میں متواتر تبدیلی کا مشاہدہ کیا ہے۔

سوال: کچھ قیدیوں کو دس سال پہلے گرفتار کیا گیا تھا۔ کیا اب بھی ان سے کوئی معلومات ملنے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

جواب: ان کے پس منظر اور تاریخ کی بنیاد پر ان میں ہماری دلچسپی قائم ہے۔

سوال: آپ ان سے معلومات کس طرح حاصل کرتے ہیں؟

جواب: ہم قیدیوں سے بات چیت کرتے ہیں اور اگر وہ کوئی معلومات دینے پر آمادہ ہوں، تو ہم ان کی بات سنتے ہیں۔ تفتیش کے لیے ہم ان سے رضا کارانہ بنیاد پر بات چیت کرتے ہیں۔

سوال: لیکن ان میں سے بیشتر بات چیت پر آمادہ نہیں ہوتے ہوں گے؟

جواب: یہ کہنا کافی درست ہوگا۔

سوال: پھر آپ ان سے تفتیش کیسے کرتے ہیں؟

جواب: نہیں! میرا مطلب ہے کہ جب انٹرویو قسم کی تفتیش سے آگے جانے کی ضرورت پڑتی ہے، تو وہ کام ہم یہاں نہیں کرتے۔ وہ کام یہاں نہیں ہوتا۔

سوال: لیکن 2002ء میں گٹمو کے اندر قیدیوں سے تفتیش کی گئی تھی۔

جواب: میں 2002ء میں یہاں نہیں تھا۔ میں آپ کو موجودہ حالت کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔

سوال: کیا گٹمو میں سی آئی اے کے خفیہ عقوبت خانے موجود ہیں؟

جواب: اس وقت یہاں ایک بھی نہیں۔

سوال: یہاں قرآن کی بے حرمتی کے الزامات بھی لگتے رہے ہیں۔

جواب: قرآن کی توہین یا نامناسب رویے کے الزامات محض الزامات ہیں۔ ان میں کوئی سچائی نہیں۔ یہ قیدیوں کی طرف سے کی گئی غلط تاویلات ہیں۔ ہم قرآن کی توہین نہیں کرتے۔ ہم نے فوجیوں کے قرآن کو ہاتھ لگانے، پکڑنے کے عمل کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سارا حفاظتی عملہ قرآن اور مذہبی عبادات کے معاملے میں محتاط ہے۔

سوال: آپ بھوک ہڑتال سے کیسے نمٹ رہے ہیں؟

جواب: ہم اس امر کو یقینی بناتے ہیں کہ وزن کی کمی کے حوالے سے قیدیوں کا طبی معاینہ ہوتا رہے۔ جب ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو ہم صورت حال کے مطابق قدم اٹھاتے ہیں۔

سوال: بھوک ہڑتال شروع کیسے ہوئی؟

جواب: یہاں گزشتہ سالوں میں مختلف اسباب کی بنا پر بھوک ہڑتالیں ہوتی رہی ہیں۔ موجودہ ہڑتال اس سال کے آغاز میں شروع ہوئی۔ قیدیوں کی شدید خواہش تھی کہ ان کی حالت کے بارے میں ان کی آواز کو سنا جائے۔

سوال: کچھ قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پھر بھی وہ گٹمو میں مقید ہیں۔ کیوں؟

جواب: بہت سی وجوہات ہیں۔ ہم اس عمل میں سہولت فراہم کرتے ہیں لیکن ہم ان کی منتقلی کا حتمی فیصلہ نہیں کرتے۔ افراد کی چھان بین کی جاتی ہے۔ ہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ہم فیصلہ نہیں کرتے۔ ○○○

دنیا کی بلند ترین شرح آمدن رکھنے والے ملک کا 33 سالہ نیا امیر کیا واقعی دباؤ میں ہے؟

قطر میوزیم
کے شیشے کے فرش پر چلتے ہوئے
دل کیوں لرزتا ہے؟

☆ وہ بولے میں یہاں آتے ہوئے جیکٹ، بیلٹ تو ایک طرف وہ جوتا بھی نہیں پہنتا جو آواز کرے

☆ پاکستانی وزیر خارجہ کو عبایہ اور گاؤن پہنے دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی

☆ میلوں پر پھیلا دوحا ایئر پورٹ کئی حیرتیں لیے ہے

☆ خالد صاحب فرمائش سن کر جھینپ گئے

اختر عباس

میلوں پر پھیلا دوحا ائیر پورٹ ایک بار پھر ہمارے قدموں میں بچھا ہوا نئی نئی حیرتوں سے ہمکنار کر رہا تھا۔ جہاز سے ائیر پورٹ ٹرمینل لے جانے والی شاندار بسوں میں ہونے والے اعلانات ایک بار پھر کنفیوز کر رہے تھے کہ بتائے گئے دونوں ٹرمینلز میں سے اُترنا کس پر ہے۔ غلط جگہ اترنے کا مطلب اتنا آسان نہیں' مشکلوں اور پیچیدگیوں سے بھرا تھا۔ پہلی دفعہ آنے والوں کے چہرے پہ پریشانی صاف پڑھی جا رہی تھی کہ ان پر یہ بات واضح نہیں تھی۔ خود ہمیں دوسری بار دوحا آنے کے باعث یہ خبر تھی کہ جن مسافروں کے کوپنوں کا رنگ نیلا تھا وہ بس سے پہلے اتریں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں دوحا میں قیام کرنا تھا۔ پیلے رنگ کے کوپن والوں کے لیے میلوں دور الگ سے ٹرمینل تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ٹرانزٹ میں تھے اور انہیں کچھ توقف کے بعد دوسری فلائٹ پکڑ کر کسی دوسرے ملک سدھارنا تھا۔

چند ہفتے پہلے صبح پونے چھ بجے جب قطر ائیرویز کے جہاز نے ہمیں دوحا ائیر پورٹ کے حوالے کیا تو ہم اس مشکل سے گزر چکے تھے۔ دوسری مشکل جو زیادہ تکلیف دہ تھی۔ خنکی بھرے ماحول میں کوٹ اتار کر' پتلون کو اپنی بیلٹ سے بے نیاز کر کے جسمانی چھان پھٹک کے مراحل سے گزرنا تھا۔ مجھے لاہور سے چلتے ہوئے اس مرحلے کی بھنک پڑ گئی تھی اس لیے بیلٹ اتار کر پہلے ہی بیگ میں رکھی ہوئی تھی۔ کوٹ کے بجائے شرٹ بھی ایک موٹی سی پہن لی تھی۔ بٹ صاحب کا کہنا تھا ''میں یہاں آتے ہوئے جیکٹ تو ایک طرف بیلٹ اور وہ جوتا بھی نہیں پہنتا جو آواز کرے۔'' اس جملے کی بلاغت یہاں آنے کے بعد ہی سمجھ آئی جب ہم نسبتاً سکون سے گزر گئے اور لوگ بے چارے اپنے کوٹ' سوئیٹر' بیلٹس جوتے سنبھالتے پھرتے تھے۔ خوب صورت' دیدہ زیب اور جدید سہولتوں سے آراستہ بلڈنگ ایک بڑے شاپنگ مال کا پتا دے رہی تھی۔ شاید زندگی کا محور و مرکز ہی اب اشیا بن گئی ہیں۔ اسی لیے ہر جگہ اسی سوچ کی حکمرانی ہے۔ اسی کا اظہار ہے۔ ٹرانزٹ کا عرصہ یا وقفہ بالعموم محدود سا ہوتا ہے۔ وہاں بھی خرید و فروخت بلکہ صحیح لفظ شاپنگ ہے، کیونکہ خرید ہی خرید ہوتی ہے۔ فروخت کا تو نہ موقع ہوتا ہے نہ اجازت و معمول۔ بہرحال سامان سے بھری بلکہ لدی پھندی دکانوں سے بچ بچا کر ایک کوریڈور سے ہوتے ہوئے نماز فجر کی تلاش میں ایک مسجد تک جا پہنچے۔ وضو کر کے سرخ رنگ کے دیدہ زیب قالین پر کھڑے ڈاکٹر عمران کا انتظار کر رہے تھے جب وہ اپنا کوٹ' ویسٹ کوٹ اور جرسی لیے برآمد ہوئے۔ وہ بے حد پریشان تھے۔ ان کا آئی فون (ٹیلی فون) سیٹ تلاشی کے مراحل میں کہیں کھو گیا تھا۔ وہ باہر کو لپکے اور میں وضوگاہ کی طرف' کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی وضو کر رہے تھے۔ وہ فون بھول آئے تھے۔ بہت سال پہلے میں گورنمنٹ کالج لاہور، ایس ای کالج بہاول پور کے دورے کے بعد گورنمنٹ کالج ساہیوال میں سال اول کے داخلے کا جائزہ لینے کے لیے گیا تو ایک روز وضو کرتے ہوئے اپنی نئی نویلی گھڑی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی' نماز پڑھ کر ہوسٹل، جہاں میں ارشد علیم (بعد میں سرجن بنے' 6/73- آر سے ان کا تعلق تھا) کا مہمان تھا' آ گیا اور وہاں سے واپس بنگلہ یتیم والا چلا آیا' گھڑی وہیں لٹکی رہ گئی مگر ایک سبق دے گئی کہ پھر زندگی میں کبھی کوئی چیز وضو کرتے ہوئے نہ آس پاس رکھی نا ہی لٹکائی۔ اکثر ہم چیزیں اس لیے بھول جاتے ہیں کہ وہاں رکھنے کے عادی نہیں ہوتے' ہماری ذہنی ساخت اور دماغ کے اندر معمول کی ریکارڈنگ میں چونکہ واپسی پہ وہ چیز اٹھانا معمول اور عادت میں شامل نہیں ہوتا' اس لیے بھول جاتے ہیں۔ ورنہ ہم گھنٹوں بغیر سوچے سمجھے اپنی سوچوں میں کھوئے، اپنے معمول کے راستے پر ڈرائیو کرتے ہوئے دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر سکون سے پہنچ جاتے ہیں۔

قاہرہ سے آئے ہوئے جب سبھی لابی میں سامان لے جا رہے تھے تو میں جائزہ وزٹ کے لیے کمروں میں گیا تو صحاف صاحب باتھ روم میں سوٹ اور کمرے میں جرابیں بھول کر جا چکے تھے۔ بٹ صاحب نے ائیر پورٹ پر بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے موبائل فون وہیں پر چھوڑ دیا۔ میں بھی جلدی میں دو کنو اور ایک ٹوائلیٹ کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ (ویسے وہ انہی کے تھے) دورے کے آغاز میں جب ہم دوحا ائیر پورٹ پر تھے تو قاہرہ کے لیے فلائٹ میں کچھ وقت تھا۔ اس لیے سوچا نماز پڑھ کر ذرا کمر سیدھی کر لی جائے۔ جوں ہی ارادہ باندھا تو دیوار پر لگے ایک بورڈ نے آگے بڑھ کر ارادے کا راستہ ہی روک لیا۔ لکھا ہوا تھا، یہاں سونا منع ہے۔ بندہ پوچھے کہ سونے میں آپ کا بھلا کیا جاتا ہے۔ یہاں آنے اور رکنے والے تو ویسے ہی چند گھنٹوں کے مہمان ہوتے ہیں۔ میرا جسم بے آرامی سے دکھ رہا تھا۔ اس لیے نتائج سے بے پروا ہو کر وہیں لیٹ گیا۔ اس دوران کراچی سے فلائٹ آ گئی اور ڈاکٹر خالد غیور صاحب سے مسجد ہی میں پہلی ملاقات ہوئی جو ہمارے ہم سفر بننے والے تھے۔ دو ہفتے بعد وہ پھر اس ائیر پورٹ پر ہم سے جدا ہوئے۔

دوحا ائیر پورٹ سے طویل اور صبر آزما چیکنگ لائن سے دھیرے دھیرے چلتے باہر نکلے تو خالد بھٹی اور شیر علی صاحب استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہوٹل میں پہنچے۔ دوحا اس قدر خوب صورت اور دل آویز شہر ہوگا، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کھلی کھلی روشن سڑکیں پھولوں سے بھرے قطعات تو لاہور کی پھولوں بھری سڑکوں کی یاد دلا رہے تھے۔ پی ایچ اے نے لاہور کو بڑی خوبی اور خوب صورتی سے پھولوں بھرے شہر میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہوٹل پہنچے جہاں سارا عملہ ہی بھارت کے مختلف صوبوں سے آئے نوجوانوں پر مشتمل تھا جو اپنی شکلوں' کپڑوں اور گفتگو سے فوراً پہچانے جاتے ہیں۔ کاؤنٹر پہ تازہ اخبارات کا ڈھیر پڑا تھا۔ ان میں سے کچھ کا انتخاب کیا۔ نہ صرف ان تمام کے صفحات کافی زیادہ تھے بلکہ ساری چھپائی بھی رنگین تھی۔ دلچسپ بات یہ کہ عربی اور انگریزی کے تمام اخبارات میں آدھی سے زیادہ خبریں بھارت کی تھیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ زیادہ قارئین کا ہندوستانی ہونا ہو یا

اخباری عملے کا وہاں سے ہونا۔ کمرے میں پہنچے تو بے حد تھکے ہوئے تھے۔ خالد بھٹی صاحب بہت مروت والے آدمی ہیں۔ محبت سے پوچھنے لگے کوئی اور خدمت ہو تو بتائیے۔ بٹ صاحب نے بڑی معصومیت سے فرمائش کر دی۔ بولے ''تسی ساڈے تیناں دے حصے دی نماز عشا ای پڑھ دیو'' (آپ خدمت کے لیے پوچھ رہے ہیں تو پھر ہم تینوں کے حصے کی نماز عشا ہی پڑھ دیں) خالد صاحب باقاعدہ جھینپ گئے۔ وہ ایسی فرمائش کی توقع ہی نہیں کر رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہم لوگ سامان سیٹ کر کے سونے کے لیے لیٹ گئے۔

اگلے روز خالد صاحب صبح ناشتے کے بعد آگئے۔ پروگرام یہ تھا کہ دن بھر شہر گھوما جائے۔ شام کو پاکستان کے سفارت خانے میں پروگرام تھا۔ وہاں وقت پہ پہنچا جائے۔ دوپہر کو قطر کے ممتاز بزنس مین ادریس صاحب نے ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا جس میں قطر میں مقیم پاکستانی کمیونٹی کے نمایاں افراد مدعو تھے۔ ان سب سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ادریس صاحب کا دفتر ایک بے حد پر رونق چوک کے بالکل ساتھ واقع تھا۔ جونہی انھوں نے ریموٹ کنٹرول سے پوری دیوار پر آویزاں پردے کو لپیٹا، سامنے خوب صورت پھولوں سے سجے چوک کا ایک انتہائی دل فریب منظر تھا۔ ان کے بورڈ روم میں جہاں ہم مہمان تھے، قطر میں پاکستان کی بزنس مین کمیونٹی کے چیدہ چیدہ افراد جمع تھے۔ اُن سے متعارف ہونے کے بعد میزبان نے دورہ مصر و فلسطین کی رُوداد اور تاثرات بیان کرنے کے لیے مجھے دعوت دی۔ ہلکے پھلکے انداز میں باتیں اور مشاہدات پیش کیے گئے۔ کھانے کے بعد جب ہم خالد صاحب کے ساتھ قطر کا سب سے بڑا میوزیم جس کا ایک حصہ سمندر کے اندر بنایا گیا ہے، دیکھنے جارہے تھے تو بھٹی صاحب موقع کی تلاش میں رہے پھر بالآخر کہنے لگے، ہمارے ہاں پاکستان سے بڑے بڑے اہم مہمان آتے ہیں۔ دینی اور سیاسی پس منظر کے حامل۔ ان مہمانوں کی میزبانی کا شرف اکثر ہمیں میسر آتا ہے مگر اکثر سب لیے دیے رہتے ہیں۔ ایک قاضی حسین احمد تھے جن سے ہم آسانی سے بات کر لیتے تھے، مگر آپ لوگوں کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ کل رات سے اب تک کے ساتھ میں نہ صرف اپنائیت کا گہرا تعلق محسوس ہو رہا ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ باتیں بھی زندہ اور نارمل لوگوں جیسی ہیں۔ ہمیں پہلی بار یوں لگا کہ مہمان لوگ بھی ہنس بول سکتے ہیں۔ شیر علی صاحب نے مسکرا کر ان کی تائید کی یا تردید کی، اس کا پتا نہیں چل سکا۔

سڑکوں پر نئی نئی گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ ان میں سب سے خوش رنگ اور آنکھوں کو بھلی لگنے والی بسیں تھیں جن کا رنگ بہت ہی مختلف اور منفرد تھا۔ ہلکے گرین رنگ کے شیڈز سے ڈیزائن کی گئی یہ جدید، صاف ستھری اور خوب صورت بسیں، سچی بات ہے سڑکوں کی رونق اور شان بڑھا رہی تھیں۔ دونوں طرف تعمیر شدہ عمارتیں اپنے تعمیراتی حسن اور جدتِ فکر کا پتا دے رہی تھیں۔ پھولوں کے قطعات چوراہوں اور سڑکوں پر بکثرت نظر آتے اور دل کو بھاتے رہے۔ سڑک پر چار رویہ ٹریفک کا بہاؤ بے حد تیز تھا مگر افراتفری کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا۔

ایک چوراہے پر جہاں کافی اونچائی پر اشارے لگے تھے، ہم رکنے والے تھے کہ اچانک کہیں دور سے ایک فلیش لائٹ چمکی۔ میں نے خالد صاحب کی طرف استفسار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولے ''بس جی، وہ تو گیا'' کون، کہاں گیا۔ انھوں نے اشارہ کیا کہ سگنل بدلنے کے بعد ایک صاحب نے جلدی سے گاڑی آگے بڑھا دی تھی تاکہ روا روی میں نکل جائیں مگر اب ان کے موبائل فون پر ایک منٹ کے اندر اندر ایس ایم ایس آئے گا جو اشارہ توڑنے پر ایک لاکھ روپے کے جرمانے کی خبر سنائے گا۔ یہ جرمانہ اسے چند دنوں کے اندر بھرنا ہوگا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔ اس میں ''یہ نہیں ہوسکتا'' قسم کی کیفیت بے حد نمایاں تھیں۔ حلقہ احباب قطر کے جنرل سیکرٹری بولے تو ان کی آواز میں ایک درد کی لہر تھی۔ ''کل غلطی سے ایک شاہراہ پر میں سڑک پر لکھی ہوئی سپیڈ سے ذرا تیزی سے گزرا تو چند لمحوں میں ہی ایس ایم ایس آگیا۔ آج آپ کے پاس آنے سے پہلے پورے چھ ہزار روپے سرکاری خزانے میں بطور جرمانہ جمع کروا کے آیا ہوں۔

وہ بتا رہے تھے نظام بے شک عوامی سہولت اور خدمت کو ذہن میں رکھ کر کیا گیا ہے مگر خلاف ورزی کرنے والے کے لیے کوئی رورعایت نہیں ہے۔ سچ یہی ہے کہ آج کی دنیا میں ملک، چہروں سے زیادہ وہاں کے نظام پر عمل درآمد سے پہچانے جاتے ہیں۔ نظام بھی ایسا کہ چل رہا ہو اور لوگ اسے اپنا سمجھ کر

کیا یہ میوزیم قطر کی شہزادی کے خواب کی تعبیر ہے؟

اپنائے ہوئے ہوں۔ تخصی کوتاہی کی صورت میں جرمانہ اور سزا سے کسی کو مفر نہ ہو۔

سگنل پر جو لائٹ چمکی تھی۔ اصل میں وہ چار کیمروں کے فلیش اکٹھے چلنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ کار کے دائیں، بائیں آگے اور پیچھے سے چار تصویریں ایک ہی لمحے میں بنیں اور محفوظ ہوگئیں۔ ڈرائیور کی شکل، کار کا نمبر، اوور سپیڈ، غرض ہر اینگل سے ایسی تصاویر بن گئیں جن کی تردید ممکن ہی نہیں رہتی۔ اگر کوئی کہے کہ اس نے تو اشارہ نہیں توڑا تو تردید کے لیے چار تصاویر سامنے آجاتی ہیں جس میں اس کی اپنی تصویر بھی شامل ہوتی ہے۔ یہ سن کر میں نے خود سے سوال کیا کہ کیا ہمارے ہاں جرمانوں سے لوگوں کو سڑکوں پر تھوکنے، دوسروں کو دکھ پہنچانے، دھوکا دینے، حق دبانے، اذیت دینے اور دوسروں کے لیے برا سوچنے سے منع کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ قطر میں 30، 32 سال سے رہنے والے پاکستانی ہی بتا رہے تھے کہ یہاں کافی حد تک قانون نے یہ کام کرلیا ہے۔

خالد بھٹی ہمیں دوحا کی خوب صورتیاں دکھا اور

فلسطینی لڑکی عرب دُنیا کی سب سے کم عمر ڈاکٹر بن گئی

اخبار دیکھا تو ایک دلچسپ خبر سامنے تھی۔ چونکہ ابھی تازہ تازہ فلسطین سے جڑے تھے۔ اس لیے خبروں کے جھرمٹ میں بھی وہ خبر اہم لگی۔ فلسطینی دوشیزہ اقبال محمود الاسعد نے 20 سال کی عمر میں میڈیکل کی ڈگری حاصل کرکے عرب دنیا کی سب سے کم عمر پروفیشنل ڈاکٹر ہونے کا اعزاز حاصل کرلیا۔ اس حوالے سے ان کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں شامل کرلیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اقبال الاسعد کو اس سے قبل میڈیکل کالج میں داخلہ لینے والی سب سے کم عمر طالبہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا جو انھیں صرف 13 برس کی عمر میں ملا تھا۔ قطر کے میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے پر فلسطینی دوشیزہ کا کہنا تھا کہ وہ اپنی تمام صلاحیتیں فلسطینی اور لبنانی بچوں کے علاج پر صرف کریں گی کیونکہ لبنان میں ان کے اہل خانہ اور ہم وطنوں نے انھیں جس محبت سے اس مقام تک پہنچایا ہے اب ان کا احسان اتارنے کا وقت آگیا ہے۔ اقبال الاسعد کی والدہ نے بتایا کہ ان کی بیٹی شروع ہی سے انتہائی لائق اور ہونہار تھی اور اس نے نرسری اور پرائمری دونوں درجوں میں ڈبل پروموشنز لیے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اقبال نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان صرف 12 سال کی عمر میں پاس کرلیا تھا اور پھر وہ میڈیکل کی تعلیم کے لیے قطر کے مشہور وائل کرونیکل میڈیکل کالج میں داخل ہوگئیں۔

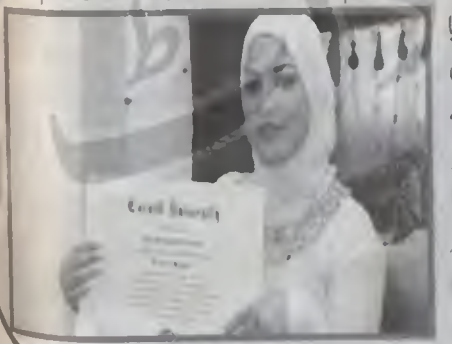

فضیلتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بتا رہے تھے۔ ہم نے بھی زیادہ مزاحمت نہیں کی اور ان کی باتیں سنتے اور مانتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک خوابناک قسم کی وسیع و عریض جگہ پر لے آئے۔ یہ قطر اسلامک ہیریٹیج میوزیم تھا۔ ہم ذعونوں کی باقیات کے لیے بنے قاہرہ میوزیم کی وسعت اور انتظام سے متاثر ہو کر آئے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ میں دل سے آرزومند تھا کہ کسی ملک میں اسلامی ہیریٹیج کی حفاظت کے لیے بھی ایسا ہی عظیم الشان انتظام و اہتمام ہو۔ یہ واقعی نظروں کو خیرہ کرنے والا میوزیم تھا۔ خوب صورتی، مہارت، اشیا کا عمدہ انتخاب، تمام اسلامی ممالک سے تاریخی زیورات سے لے کر ہتھیاروں تک اور لباس سے لے کر قالینوں تک نوادرات، مخطوطے، کتابیں، مسودے، یوں سمجھیں کہ جو جو چیزیں آپ سوچ سکتے ہیں وہ وہاں نہایت نفاست سے سجی ہیں۔ سب سے خاص بات یہ ہے کہ آدھا میوزیم سمندر کے اندر ہے۔ شیشے کا شفاف فرش کہ آپ اس پر چلتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ نیچے سمندر کا آبِ رواں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ اوپر کی چاروں منزلوں کی سیڑھیاں

چڑھتے اور شیشے کے فرش پہ چلتے ہوئے دل باقاعدہ خوف سے دھڑکتا ہے۔

میوزیم کے اندر عمدہ واش روم، نماز کی جگہ، بیٹھنے کی جگہ بہت بڑی بڑی لفٹیں، چاق چوبند خوش مزاج اور خدمت گزار عملہ جو لوگوں کے آنے پر باقاعدہ خوش ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے یہ قطر کی شہزادی کے خواب کی تعبیر ہے۔ کوریڈور میں پھرتے ہوئے اچانک خالد صاحب نے ایک صاحب سے بڑی گرم جوشی سے سلام کیا۔ تعارف ہوا تو پتا چلا کہ قطر میں پاکستان کے سفیر سرفراز خان زادہ ہیں۔ اکیلے ہی گھوم رہے تھے۔ کہنے لگے شام کو آپ سفارت خانے میں ہمارے مہمان ہیں۔ انتظامات مکمل ہیں۔ میں البتہ نہیں آسکوں گا۔ وجہ پوچھی تو بتایا کہ میڈم صاحبہ آئی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اشارہ کیا۔ ایک خاتون جنھوں نے بڑے بڑے گاگلز پہن رکھے تھے۔ ایک جاپانی نژاد گائیڈ کے ساتھ میوزیم میں پڑی چیزیں پوری دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ ہم آگے بڑھے تو حیرت ہوئی خاتون کوئی اور نہیں پاکستان کی تب کی وزیر خارجہ حنا ربانی کھر تھیں۔ سفیر صاحب اپنی باس کے لیے مہمان داری نبھانے کے لیے ساتھ تھے۔ حنا ربانی کھر ہمیشہ ایک ماڈ سکاڈ فیشن آئی کن اور برانڈ لَور کے طور پر جانی جاتی رہی ہیں۔ ان کے کپڑے، پرس اور گاگلز دورہ انڈیا میں بھی بہت مقبول ہوتے تھے، انھیں عبایہ اور روایتی عربی گاؤن میں دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ ہمیں سفارت خانے کی تقریب میں شرکت کے لیے نکلنا تھا۔ جہاں پاکستانی کمیونٹی کے تمام ممتاز لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا، ورنہ

کھر صاحبہ سے کچھ گفتگو تو ضرور ہو جاتی۔

شام کا سورج ڈوب رہا تھا جب سفارتی خانوں کی سوئی ہوئی بستی میں پہنچے۔ سڑکیں بھی خاموشی سے لیٹی تھیں اور مدھم مدھم روشنی والی سٹریٹ لائٹس بے دلی سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ کہیں کہیں گارڈ دروازہ کے اندر سے جھانکتے نظر آئے۔ باہر البتہ کوئی نہیں کھڑا تھا۔ پاکستانی سفارت خانے پہنچ کر تصویر لینا چاہی تو معلوم ہوا کہ باہر تصویریں نہیں بنائی جاسکتیں۔

پروگرام بیسمنٹ میں بنے ہال میں تھا۔ پاکستانی کمیونٹی کے تمام چیدہ چیدہ لوگ موجود تھے۔ بعض سے تو بیس بائیس سالوں بعد ملاقات ہوئی۔ وہ دو دہائیوں سے قطر کی فوج میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

......☆......

پروگرام میں اسٹیج سیکرٹری ایک متحرک نوجوان حافظ آصف تھے جو چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ مجھے دورہ مصر و فلسطین کے حوالے سے اظہار خیال کی دعوت دی گئی، ڈاکٹر انتظار نے آنکھوں کی بیماریوں، ان کے علاج اور بینائی چلے جانے کے حوالے سے اپنے ادارے ''پی او بی ٹرسٹ'' کی خدمات اور اہداف پر بڑے دلچسپ انداز میں تقریر کی۔ اگلے روز گلف نیوز اور دوسرے اخبارات نے پروگرام کو بڑی نمایاں جگہ دی۔ رات کا کھانا پاکستانی کمیونٹی کے ممتاز اراکین کے ساتھ تھا۔ میزبان احمد حسین تھے، بے حد دھیمے مزاج کے نفیس انسان ہیں۔ ''ذوق'' نام کے ایک ہوٹل میں سبھی جمع تھے جو احمد صاحب کے ذوق کا آئینہ دار تھا۔

رات دیر گئے ہوٹل پہنچے۔ دوحا کی خوب صورتی رات کو اور بڑھ جاتی ہے۔ منصوبہ بندی اور ڈسپلن شہری منصوبہ بندی کا حسن ہیں۔ فٹ بال کے اولمپکس 2022ء کے لیے تیاریاں زوروں پر ہیں۔ ہم وہ جگہ دیکھنے بھی گئے جہاں وہ اسٹیڈیم تیار کیے جارہے ہیں جو ائیر کنڈیشنڈ ہوں گے۔

ایک نئے ائیر پورٹ پر کام ہوتا بھی دیکھا کہ جس کے رن وے کا کچھ حصہ سمندر کے اندر بنایا جارہا ہے یعنی جہاز رکے گا تو سمندر کی لہریں اسے گدگدانے اور سہلانے کے لیے بے تابی سے آگے بڑھیں گی مگر چھونے سے محروم رہیں گی۔

ملک، لوگوں سے زیادہ اپنے نظام اور طرز حکومت سے پہچانے جاتے ہیں اور نظام میں اگر یہ خوبی ہو کہ ہر خاص و عام اسے دل سے قبول کیے ہوئے ہو۔ اسی میں اپنا فائدہ، سکھ اور آسودگی پاتا ہو تو اس کی عمر لمبی ہو جاتی ہے۔ کامیابی اور سرخروئی بے شک خواب دیکھنے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ شیخ حماد بن خلیفہ الثانی نے اس چھوٹے سے ملک کو نہ صرف مشرق وسطیٰ کے سیاسی منظر نامے کا اہم حصہ بنا دیا بلکہ اپنے اقدامات سے قطر کے لیے عالمی سطح پر کئی کامیابیاں اپنے نام کرلیں۔ قطر امریکا کا بے حد قریبی اتحادی ہے۔ امریکی فوج کو ایک مضبوط و محفوظ اڈے کے لیے یہاں وسیع جگہ دی گئی ہے۔

امریکی فوج کی تعداد مبالغہ آمیز حد تک بتائی جاتی ہے یہاں تک کہ ان کے لیے ائیر پورٹ اور کنٹونمنٹ تک الگ ہیں۔ اگلے روز ایک حیران کن مشاہدہ ہمارا منتظر تھا جب ہم شہر سے آٹھ دس کلو میٹر دور ایک بہت بڑے پاکستانی اسکول میں مدعو تھے۔ ''پاک شمع'' میں بہت بڑی تعداد میں پاکستانی بچے زیر تعلیم ہیں۔ اس سے بالکل متصل بھارت کی ٹاٹا کمپنی کے نام سے اسکول کی بلڈنگ تھی اور ان دونوں اسکولوں کے سامنے بالکل نئے بنے ہوئے 20 سے زیادہ بہت

بڑے بڑے چرچ ایستادہ تھے۔ بتایا گیا کہ امریکی فوج میں چونکہ عیسائیوں کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے سپاہی ہیں اس لیے ان کی روحانی تسکین کی تکمیل کے لیے یہ بنائے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ایک ہی قطار میں تعمیر کیے گئے ہیں۔

اسکول کے اساتذہ اور انتظامیہ نے بھرپور استقبال کیا۔ چائے کے بعد ہال میں گئے جہاں مختلف کلاسوں کے سیکڑوں بچے ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر عمران صحاف نے صحت کے حوالے سے بہت ہی بنیادی اور آسان، مفید گفتگو کی۔

اس دوران میں نے کچھ بچوں کو شرارتیں کرتے اور باتیں کرتے پایا تو اس عمر کی بے شمار یادیں سامنے آنے لگیں مگر ہر بات اور شرارت اپنے موقع محل کے لحاظ سے ہی اچھی لگتی اور دلآویز کہلاتی ہے۔ جب میری باری آئی تو میں جتنی باتیں سوچ کر آیا تھا وہ ساری کہیں پیچھے رہ گئیں اور ایک والد اور استاد سے زیادہ کونسلر اور Mentor بولنے لگا۔ مجھے ان کے مختلف کئی والدین یاد آئے جو دور دیس میں بھی اپنے بچوں کی تعلیم اور اچھی تربیت کے لیے فکر مند ہیں۔ کتنی دیر گفتگو جاری رہی یہ اب مجھے بھی یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ جب اسٹیج سے نیچے اترا، تو آدھے سے زیادہ بچے رو رہے تھے۔ ان کے اساتذہ اور ہمارے ساتھ گئے مہمان بھی اپنی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ میرا اپنا حال بھی ان سے مختلف نہیں تھا۔ درد ہی نہیں خواہشیں اور خواب بھی سانجھے ہو سکتے ہیں۔ اچھا بننے کی آرزو اور کمزور لمحوں سے بچ نکلنے کی طاقت بھی سبھی کے پاس کہیں خوابیدہ حالت میں ہوتی ہے۔ سوال یہ ضرور اٹھتا ہے کہ ہر گزرتے دن نئی بات، نئی کتاب، نیا علم سیکھنے، پڑھنے اور جانتے ہوئے زندگی کا وژن بڑا ہونا چاہیے یا سکڑنا، ویلیوز، اخلاقیات اور اقدار پر یقین بڑھنا چاہیے یا کمزور ہونا چاہیے اور ان پر مضبوط ہونے کا اقرار ہی کافی ہے یا عملاً اظہار بھی کرنا چاہیے۔ کورس کی یہ کتابیں پڑھنے اور پڑھانے سے بہت مختلف ہیں اور اسی کے لیے والدین بچوں کو بہتر سے بہتر، مہنگے سے مہنگے اداروں میں بھجواتے ہیں جہاں سے ان کو دو چار سالوں بعد نئی ڈگری تو ضرور مل جاتی ہے مگر ان کی سوچ اور ذات میں موجود خلا پُر نہیں ہوتا اور آنے والے دنوں میں یہ کمی ان کے کیریئر میں بھی رکاوٹ اور تباہی کا باعث بنتی ہے۔

پروگرام کے بعد پرنسپل صاحبہ کے آفس میں تبادلہ خیال کی نشست ہوئی۔ پھر ہم نے اجازت لی اور قطر کے صحرا میں جگہ جگہ اگتی زندگی، بچھتی سڑکوں اور بلند ہوتی عمارتوں کو دیکھتے آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔

واپسی پہ الجزیرہ کے ہیڈ آفس سے ہوتے ہوئے ''گلف نیوز'' پہنچے۔ چائے کہیں پی، کہیں چھوڑی۔ کھانے میں بڑھتی تاخیر نے ایک دم سے جسم کا شوگر لیول گرا دیا۔ اب بھاگم بھاگ جوس اور کسی میٹھی چیز کی تلاش شروع ہوئی۔ نیم بے ہوشی میں جوس پیا۔ مروت اچھی چیز ہے مگر سفر میں مہمان بے زبان ہوتا ہے۔ بھوک سے بے حال بھی ہو تو میزبان سے کیا اور کیونکر کہا جائے جب کہ اس نے اپنے لحاظ سے کھانے کے اوقات کا تعین کر رکھا ہو۔ اب جس ہوٹل پہ جائیں وہاں کھانا ختم ہو چکا ہو، بالآخر چار بجے کے قریب بیزا

ٹ پر پہنچے اور وہاں سے بھاگم بھاگ ہوٹل کہ چھ بجے نیر پورٹ پہنچنا تھا جہاں سے ہماری لاہور کے لیے ائٹ تھی۔ سامان کی پیکنگ اس لحاظ سے مشکل ہو رہی تھی کہ دوحا سے ملنے والے تحائف جو ادریس صاحب ر خالد صاحب نے بیگز، ڈائریوں اور گفٹ آئٹموں کی صورت میں ساتھ کر دیے تھے۔ انھیں بیگوں میں گھسانا ممکن نہ تھا اور میں ''نگ'' بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

ائیر پورٹ تک جاتے جاتے دل لاہور واپسی کی خوشی اور بچوں سے اتنے دنوں کی دوری کی اداسی سے بھرنے لگا۔ یہی خیال تھا کہ اب جتنی جلدی ہو لاہور پہنچا

بیٹے نے والد سے دوحا کا اقتدار لینے کی روایت دہرائی۔

ہمارے آنے کے چند ہفتوں کے بعد ہی قطر میں غیر متوقع طور پر سیاسی تبدیلی رونما ہوگئی۔ قطر کے حکمران شیخ حماد بن خلیفہ الثانی نے اچانک اقتدار اپنے بیٹے تمیم کو منتقل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بیٹے نے والد کی اپنے والد سے دوحا کا اقتدار لینے کی روایت کو دہرایا جسے خاندان نے عمدگی سے تبدیلی اقتدار میں بدل دیا۔ دوحا میں موڈ تیزی سے بدلتا دکھائی دے رہا ہے۔ بظاہر نئے امیر کی سربراہی میں قطر کی حکومت معاملات کو جوں کا توں رکھنے ہی پر توجہ دے رہی ہے۔ تاہم سیاسی زبان میں، نئے سرے سے توازن پیدا کرنے، نظم کو برقرار رکھنے اور ارتکاز پر توجہ دی جا رہی ہے، نئے امیر اندرون اور بیرون ملک کس نوعیت کی تبدیلی چاہتے ہیں اور کن معاملات کو جوں کا توں رکھنا چاہتے ہیں، یہ اب واضح ہوتا جا رہا ہے۔ قطر اخوان کا بہت بڑا حمایتی تھا۔ نئے امیر جنرل سیسی کے ذاتی دوست ہیں۔ قطر پہلے سیاسی طور پر سعودی عرب کا مضبوط حریف سمجھا جاتا تھا اور آزادانہ پالیسیاں بناتا تھا۔ اب کہا جا رہا ہے کہ نئے امیر سعودی نظام کی ایکس ٹینشن ثابت ہوں گے۔

محض 61 برس کی عمر میں اقتدار سے کنارا کش ہونے والے سابق امیر کی کامیابیاں غیر معمولی رہی ہیں۔ جب انھوں نے 1992ء میں اپنے والد کو اقتدار سے باہر کیا تو قطر خلیج کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کی آبادی محض 50 ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ شیخ حماد بن خلیفہ الثانی نے اس چھوٹی سی ریاست کو سفارت کاری کے مرکز میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے حقیقی مفہوم میں انقلاب برپا کر دیا۔ شیخ حماد بن خلیفہ الثانی کے دور میں قطر کی فی کس آمدنی 80 ہزار ڈالر سالانہ تک جا پہنچی، جو دنیا میں بلند ترین شرح ہے۔ شیخ حماد بن خلیفہ الثانی بجا طور پر ایک صدی کے دوران مضبوط ترین عرب سربراہ مملکت کہے جا سکتے ہیں۔

شیخ تمیم

چند ماہ کے دوران خلیجی سفارتی حلقوں ''Overreach'' کا لفظ غیر معمولی طور پر سنائی دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام ہی عرب سربراہان مملکت و حکومت چاہتے تھے کہ قطر کے امیر کچھ ایسا کریں کہ ان کی پوزیشن کمزور ہو جائے اور سفارت کاری کے حوالے سے اس چھوٹی سی ریاست کو خطے میں مرکزی حیثیت حاصل نہ رہے۔ نئے امیر شیخ تمیم کی عمر 33 سال ہے اور ظاہر ہے کہ اس چھوٹی سی عمر میں اُن پر خاصی بڑی ذمہ داری کا دباؤ ہے۔ انھیں اپنے ملک کو علاقائی سفارت کاری کے حوالے سے سب سے آگے رکھنا ہے۔ وہ یہ کیسے کر پائیں گے۔ بے شک یہ اہم سوال ہے۔

شیخ تمیم کے اقتدار میں آنے کے بعد سے رونما ہونے والی سب سے بڑی تبدیلی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طاقتور کزن حماد بن جاسم الثانی کو ہٹا دیا ہے۔ وہ 1992ء سے وزیر خارجہ اور 2007ء سے وزیر اعظم بھی چلے آ رہے تھے۔ وہ امیر کے بعد حکومت کی مضبوط ترین شخصیت میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ان کے کاروباری مفادات بھی غیر معمولی ہو چکے تھے۔ انھوں نے خارجہ پالیسی کو اس انداز سے چلایا کہ بعض معاملات میں قومی مفادات پیچھے رہ گئے۔

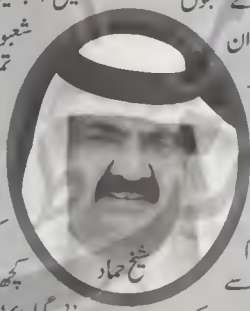
شیخ حماد

صحت، تعلیم، ثقافت اور کھیل کے شعبوں میں ایجنسیوں، اداروں اور کمیٹیوں کو ابھرنے کا موقع ملا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ان شعبوں کی وزارتوں کو کنٹرول کرنے کے اقدامات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ تمیم نے کہا ہے کہ ان وزارتوں کو زیادہ اختیارات دیے جائیں گے اور کام کرنے کی زیادہ گنجائش پیدا کی جائے گی۔ سابق امیر کی اہلیہ شیخہ موضہ (Moza) کی نگرانی میں کام کرنے والی طاقتور قطر فاؤنڈیشن اور موجودہ امیر کی بہن شیخہ مایاسا (Mayassa) کی نگرانی میں کام کرنے والی قطر میوزیم اتھارٹی کو بھی اپنے بے پناہ اختیارات کے لحاظ سے کچھ مصالحت کرنا پڑے گی۔ ایک سفارت کار کا کہنا ہے کہ اب حکومت کو کسی حد تک ''ریگولرائز'' کیا جا رہا ہے۔

نئے وزیر اعظم عبداللہ بن ناصر الثانی کا تعلق فوج سے ہے اور وہ اپنے پیشرو کے مقابلے میں کم مہم جو طبیعت کے مالک ہیں۔ انھیں وزارت داخلہ سے ترقی دی گئی ہے۔ وزیر اعظم کے منصب کے ساتھ ساتھ وہ وزیر داخلہ کا منصب بھی سنبھالے رہیں گے۔

خارجہ پالیسی کے میدان میں شیخ تمیم کو بہت سنبھل کر چلنا پڑے گا۔ سابق خلیفہ کے دور میں قطر اس بات کا خواہش مند تھا کہ شام میں بشارالاسد کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ اس معاملے میں وہ مرکزی کردار کا حامل تھا مگر شیخ حماد بن خلیفہ الثانی کے سبکدوش ہونے سے قبل ہی سعودی عرب نے یہ کردار سنبھال لیا تھا۔ قطر کا حکمران خاندان اس بات سے بظاہر مضطرب ہے کہ امریکا نے دو ماہ قبل کے کیمیائی حملوں کے باوجود بشارالاسد انتظامیہ کے خلاف کارروائی سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ قطر کے عوام اور خواص میں یہ تاثر عام ہے کہ امریکا نے شام

جائے۔ قطر ائیر ویز میں سفر ایک بار پھر خوشگوار ثابت ہوا۔ لاہور ائیر پورٹ سے باہر نکلے تو بے شک رات کا اندھیرا چھا چکا تھا مگر سڑکیں روشن اور قمقمے جگمگا رہے تھے۔ یہ روشنیاں اور اندھیرے عمر بھر ایسے ہی ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کا حصہ بنے، ایک دوسرے کا پیچھا کرتے کبھی الگ ہو کر اور کبھی ہفتوں کو مہینوں میں بدلتے دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ زندگی ہے! قیام اور سفر بھی ایسا ہی عمل ہے۔ سرگودھے کے کنو جیسا کھٹا اور میٹھا، بھی بیج والا اور کبھی بیجوں کے بنا، کبھی ترش تو کبھی مٹھاس بھرا ایک قاش، ایک گھونٹ بھی زندگی کا مزہ دے جاتا ہے۔

کے خلاف کارروائی سے اجتناب اسرائیلی دباؤ پر برتا ہے، جو چاہتا ہے کہ شام کو غیر معینہ مدت تک خانہ جنگی میں مبتلا رہنے دیا جائے تاکہ اس کا خون بہتا رہے اور وہ زیادہ سے زیادہ ناکارہ ہو جائے۔

قطر نے مصر میں عرب بہار کی آمد کے بعد اخوان المسلمون کے اقتدار میں آنے کا خیر مقدم کیا تھا اور امدادی پیکیج کا اعلان بھی کیا تھا، مگر فوج کے ہاتھوں صدر محمد مرسی کی حکومت کا تختہ الٹے جانے کے بعد قطر نے پالیسی تبدیل کی اور اب وہ مصر میں کسی پارٹی کے بجائے عوام کی حمایت کی بات کر رہا ہے۔ محمد مرسی کے دور میں قطر نے جس امداد کا وعدہ کیا تھا، وہ مصر کو دی جا رہی ہے۔ حالانکہ قطر میں کوئی بھی نہیں چاہتا کہ مصر پر دوبارہ جرنیل قابض رہیں۔

قطر نے خطے میں سفارت کاری کے حوالے سے غیر معمولی طور پر قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ چاڈ، اری ٹیریا، دارفر، فلسطین اور قبرص کے معاملات میں اس کا ثالث نما کردار خارجہ پالیسی کی شاندار کامیابی سمجھا جاتا رہا ہے، مگر ایسا لگتا ہے کہ اب یہ کردار ڈانوں اڈول ہے۔ قطر کے مشہور زمانہ سیٹلائٹ چینل "الجزیرہ" کو عرب بہار کے فروغ کے حوالے سے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مگر اب ہوسکتا ہے کہ "الجزیرہ" کو تھوڑا پیچھے رہنے اور خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کر دی جائے۔

اس وقت قطر میں جس موضوع پر کوئی بھی شخص بات نہیں کرتا، وہ جمہوریت ہے۔ ایک غیر مؤثر سی اسمبلی کے انتخابات کا وعدہ کیا گیا تھا مگر وہ منصوبہ بھی اب بظاہر بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ قطر کے لوگ جمہوریت کی ناکامی کی بات کرتے وقت کویت کا حوالہ دیتے ہیں، جہاں پارلیمان قائم کرنے کا تجربہ ناکام رہا۔ ان کے خیال میں پارلیمانی سیاست سے معاملات الجھتے ہیں اور بہت سے امور میں غیر ضروری طور پر تعطل اور تذبذب پیدا ہوتا ہے۔

قطر میں حکمرانی اب تک شاہی خاندان میں رہی ہے۔ الثانی خاندان بہت بڑا اور طاقتور ہے۔ چند خاندانوں اور قبائل تک اقتدار کو محدود رکھنا انتہائی دشوار کام ہے کیونکہ حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے بھی بنائے جاتے رہتے ہیں۔ نئے امیر کے لیے بھی اقتدار برقرار رکھنا ایک مشکل مرحلہ ہوگا اور اس معاملے میں انھیں غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

مصر میں گزرے 14 دن اور اب قطر میں بیتے 2 دن زندگی کے کھٹے میٹھے دنوں میں خوب صورت اور یادگار اضافہ تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ عمر بھر یاد رہیں گے، ہاں نئے سفر کے لیے اکساتے رہیں گے، ترغیب دلاتے رہیں گے۔ مطمئن، محفوظ اور میٹھے لمحوں کے لیے سچے رب کے آگے جھکاتے رہیں گے۔

نئے امیر کے لیے ایک بنیادی مسئلہ نئی نسل کو آگے بڑھانا بھی ہے۔ قطر میں آج بھی افرادی قوت کا بڑا حصہ غیر ملکیوں پر مشتمل ہے۔ ترکی، مصر، لبنان اور فلسطین کے ورکرز بڑی تعداد میں ہیں۔ یورپ کے لوگ بھی قطر میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایسے میں قطر کی نئی نسل کو ذمہ داری کا احساس دلانا ہی ہوگا۔ نچلی سطح کے کام ایشیائی ممالک بالخصوص بھارت کے لوگ کرتے ہیں۔ قطر کی 20 لاکھ کی آبادی میں قطری باشندے صرف تین لاکھ ہیں۔

قوم سے پہلے خطاب میں شیخ تمیم نے بہت سے اندرونی مسائل کا ذکر کیا۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے عوام سے نکاسیٔ آب کے نظام کو بہتر بنانے کا بھی وعدہ کیا مگر خارجہ پالیسی اور شام کا ذکر بھلا بیٹھے۔ اس وقت قطر کے لیے سب سے بڑا مسئلہ 2022ء کے فٹ بال ورلڈ کپ کا انعقاد ہے۔ موسم گرما میں قطر بھٹی کی طرح تپتا ہے۔ بیرون ملک آواز بلند ہو رہی ہے کہ فٹ بال ورلڈ کپ موسمِ سرما میں منعقد کیا جائے۔ اگر شیڈول تبدیل کرنا پڑا تو یورپ کی فٹ بال لیگز کو غیر معمولی خسارے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خیال یہ ہے کہ قطری، جو غیر معمولی سخاوت کے لیے مشہور ہیں، یورپی لیگز کو ہرجانہ بھی ادا کرنے سے نہیں چُوکیں گے۔ ویسے تو بیشتر قطری اس بات پر غیر معمولی فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی سرزمین پر فٹ بال ورلڈ کپ کا انعقاد ہونے والا ہے مگر اب اِسے قطری ایونٹ کے بجائے عرب ایونٹ کے طور پر بھی دیکھا اور پیش کیا جا رہا ہے۔ پورا خطہ فٹ بال ورلڈ کپ کو اپنے لیے اعزاز سمجھ رہا ہے۔

قطر کے کسی بھی باشندے سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ جب تک حکومت کی فیاضیاں جاری رہیں گی، تب تک حکمران خاندان کے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوگا۔ قومی سطح پر کسی سے بھی کوئی ٹیکس وصول نہ کرنا فخر کی بات ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق ہر ملک کے نظام حکومت اور نظام آمدن سے ہے اور بظاہر طویل عرصہ قطر کے نظام کو کوئی بڑا چیلنج درپیش نظر نہیں آتا۔

WATER AND SANITATION AGENCY (GDA) GUJRANWALA

Ph: 055-9200453, 055-9200456, 055-4230018, Fax: 055-9200460

TENDER NOTICE

Sealed tenders are hereby invited from approved Firms/Contractors of HUD & PHE Department/ WASA Gujranwala who have enlisted/renewed their firms for the year 2013-14, and have deposited their enlisted/renewal fee for the current financial year. The tenders shall be issued from the office of the Deputy Directors of respective Zone and office of the EDO F&P COG, from the date of publication of first advertisement in the newspaper during office hours up to 16-12-2013 on production of 2% (two present) earnest money of the estimated cost in shape of deposited at call from the scheduled banks in the name of Deputy Director Engineering WASA. The tenders will be received on **17-12-2013** up to 1:00PM and will be opened at 1:30PM in the District Council Hall Gujranwala, by the opening committee, in the presence of the intending contractors/ firms or their authorized representatives. The interested firms / contractors have to show their **original documents of Registration with PEC and Enlistment / Renewal** prior to issuance of the tender documents.

S.#	Name of Work	Estimated Cost (In Million)	Earnest Money (In Rs.)	Time Limit
Zone-I (Office Liaqat Bagh)				
Barister Usman Ibrahim, MNA, NA-95 (Annual Development Programme 2013-14)				
1	Providing and laying sewerage at Gala Tahir Punoo wala Madina colony Katcha Eminabad Road, Gujranwala.	1.955	39100/-	2 Months

Abdur Raouf Mughal, MPA, PP-94 (District Development Programme 2013-14)				
2	P/L sewerage and PCC at Gali Chaudhary Ghulam Mohydin Gujjar wali Now Muslim Wahdat Colony, Street No 4 Beri wali Usman Park Fareed Town, Gali No 32 Ali Park Fareed Town, Gujranwala.	2.237	44800/-	2 Months
Zone-II (Office Shearanwala Bagh)				
Barister Usman Ibrahim, MNA, NA-95 (Annual Development Programme 2013-14)				
1	Providing / laying at Gala Ali Sher wala Mian Sansi Road, Gujranwala.	2.037	40800/-	2 Months
2	Providng / laying and PCC balance portion Gala Ghulam Muhammad Thakadar, Gujranwala.	2.382	47700/-	2 Months
Imran Khalid Butt, MPA PP-91				
1	Providing / Laying Sewer Pipe /PCC at grave yard road Hashmi Colony, Gujranwala	6.372	127500	4 Months

IPL 11609

Director Engineering
WASA, Gujranwala

NOTICE INVITING TENDERS

1. Sealed tenders based on Market Schedule Rates are hereby invited, for the works mentioned below, from the contractors / firms enlisted / renewed with C&W Department / Executive District Officer, Works and Services, Gujrat for the current financial year in the field of Road Works.
2. Tender document can be obtained from the office of the undersigned upon written request accompanied with attested copies of enlistment / upto date renewal letter, PEC license for 2013, Identity Card of contractor / managing partner / director of the firm along-with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of Deposit at Call from any scheduled Bank.
3. Tendered rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be typed as per general directions given in tender documents. No rebate on tender rates will be acceptable.
4. Tenders will be received in the office of the Executive District Officer, Works & Services, Gujrat and will be opened simultaneously on fixed date and time by the District Tender Board Gujrat at the above venue in the presence of intending contractor or their representative.
5. Conditional tenders and tender not accompanied with earnest money @ 2% of the estimated cost in shape of deposit at call receipt of any Scheduled Bank will not be entertained.
6. Executive District Officer, Works & Services, Gujrat reserves the right of rejecting any or all tenders without assigning any reason thereof.

1. Last date for application to purchase tenders 14-12-2013
2. Last date for issuance of tenders 16-12-2013
3. Last date and time for receipt / opening of tenders 17-12-2013 at 11:00 A.M.

Sr. #	Name of Work	Estimated Cost in Million	Earnest Money	Completion Time	T.S No. & Date	Tender Fee
DISTRICT DEVELOPMENT PROGRAMME 2013-2014						
CH: SHABBIR AHMED, MPA, PP-115						
1	Rehabilitation of road from Lalamusa Guliana Bharwal road upto Bismillah Chowk.	9.711	194220/-	3½ months	EDO(W&S) No.1895/EDO, dated. 22.11.2013	4860/-
MAINTENANCE &REPAIR PROGRAMME 2013-2014.						
2	Rehabilitation of road from Guliana to Kotli Bajar.	2.005	40100/-	1 month	EDO(W&S) No.1896/EDO, dated. 22.11.2013	1010/-
3	Special Repair to Lalamusa Dullanwala road.	0.600	12000/-	15 days	DO(Roads)No.1490/DB, dated. 22.11.2013	300/-

If the above tenders not issued / received on above date the schedule will be as under:

1. Last date for application to purchase tenders 18-12-2013
2. Last date for issuance of tenders 19-12-2013
3. Last date and time for receipt / opening of tenders 20-12-2013 at 11:00 A.M

Note:- *Applications are invited for appointment of work charged Sub Engineer / Diploma Holder purely on temporary basis with terms and conditions which can be seen in the office of the undersigned.*

IPL 11724

DISTRICT OFFICER ROADS
GUJRAT.

''میں'' کیا ہے؟

ڈاکٹر طاہر مسعود

مجددِ عصر، ملک میں اسلامی انقلاب کے اولین داعی، مفسرِ قرآن مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے ''اُردو ڈائجسٹ'' کے مضمون نگار میاں عبدالشکور صاحب سے فرمایا تھا:

''میں نے زندگی بھر اس بات کی کوشش کی ہے کہ میری سوچ، گفتگو یا تحریر میں کبھی ''میں'' غالب نہ آئے۔ ضرورت پڑنے پر بھی میں یہ کبھی نہیں کہتا کہ میں نے یہ سوچا ہے یا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔''

سوچنے کی بات یہ ہے کہ مولانا مرحومؒ کو ''میں'' کے استعمال سے گریز کیوں تھا؟ آخر ''میں'' کے استعمال کو ترک کرنے میں انھوں نے کیا دینی مصلحت دیکھی؟ آئیے اس سوال پر غور کرتے ہیں۔

صوفیا کا خیال یہ ہے کہ بندے اور اللہ کے تعلق میں بندے کا ''میں'' ہی اصل رکاوٹ ہے۔ ''میں'' کیا ہے؟

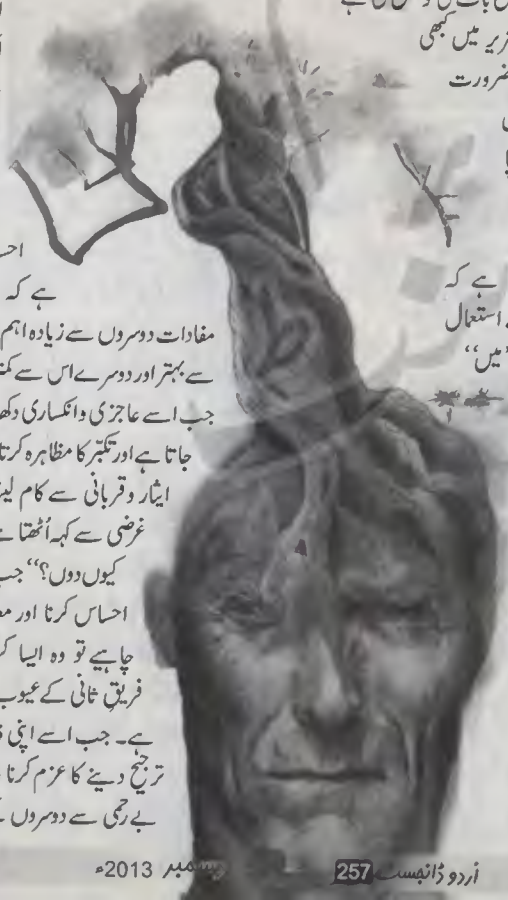

جدید نفسیات کی اصطلاح میں آدمی کی انا (Ego) اور دینی اصطلاح میں اس کا نفس۔ جب آدمی کہتا ہے:

میرا مال، میری عزت، میری زمین، میری اولاد، میری جائداد، میرا مستقبل۔ غرض جہاں جہاں یہ ''میں'' اپنا جلوہ دکھاتا ہے، وہاں وہاں اس کی انا بولتی نظر آتی ہے۔ یہ انا یا نفس چوں کہ خود غرضی، مفاد پرستی، جاہ طلبی، زر پرستی اور دنیا پرستی کا منبع ہوتا ہے، اس لیے یہ بالعموم اپنی ذات سے اوپر اُٹھ کر سوچنے کا موقع بھی مشکل ہی سے دیتا ہے۔ گویا اپنی ذات کے اثبات پر اصرار ایک طرح سے دوسروں کی نفی پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ انا ہے جو آدمی کے اس ناروا احساس کو پختہ کرتی ہے کہ وہ اور اس کے مفادات دوسروں سے زیادہ اہم ہیں۔ وہ دوسروں سے بہتر اور دوسرے اس سے کمتر ہیں۔ چناں چہ جب اسے عاجزی وانکساری دکھانا چاہیے تو وہ اکڑ جاتا ہے اور تکبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جب اسے ایثار و قربانی سے کام لینا چاہیے تو وہ خود غرضی سے کہہ اُٹھتا ہے: ''میں ہی قربانی کیوں دوں؟'' جب اسے اپنی غلطی کا احساس کرنا اور معذرت طلب کرنا چاہیے تو وہ ایسا کرنے کے بجائے فریقِ ثانی کے عیوب گنوانے بیٹھ جاتا ہے۔ جب اسے اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دینے کا عزم کرنا چاہیے تو وہ نہایت بے رحمی سے دوسروں کے مفادات کو ٹھوکر

مار کر اپنا کام نکال لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا پر فرد کی ''میں'' یعنی اس کی انا یا نفس کی حکمرانی ہے اور اسی ''میں'' پر اصرار نے اس ملک خداداد کو شر و فساد سے بھر دیا ہے۔ ہر اختلاف اور جھگڑے کی تہ میں اتریئے تو اندر سے وجہ تنازع یہی ''میں'' نکلے گا۔

چناں چہ صوفیا کا کہنا تھا کہ تربیت نفس کا مطلب ہی اپنی ''میں'' کو فنا کرنا ہے، اسی کو وہ اپنی اصطلاح میں ''اپنے آپ کو مٹانا'' کہتے تھے۔ مٹانے کے معنی ہیں اپنی رضا کو اللہ کی رضا میں ضم کر دینا۔ یعنی بندے کی انا مٹ جائے۔ اس کے لیے صوفیا مجاہدے، مراقبے اور ریاضتیں کرتے تھے اور اس کا عام طور پر یہ طریقہ اختیار کرتے تھے کہ ہر وہ عمل جس سے آدمی کی ''میں'' کو فخر و انبساط حاصل ہوتا ہو، انا پھولتی اور موٹی ہوتی ہو، اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے تھے۔ ہماری روایتی خانقاہوں میں بزرگانِ دین اپنی اصلاح کے طالب بندگانِ خدا کو اسی کی تربیت دیتے تھے۔ کسی میں تکبر کی بیماری دیکھتے تھے تو اسے مسجد میں نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لیے بھیج دیتے تھے۔ کسی میں دیکھتے تھے کہ بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے تو اسے حکم دیتے تھے کہ صبح اُٹھ کر بیوی کو ناشتا اور چائے پیش کرو۔ غرض جس کی انا میں جیسی نفسی بیماری دیکھتے تھے، ویسا ہی علاج تجویز کرتے تھے۔ انا کو لگام دینے کا یہ طریقہ مجرب ثابت ہوتا تھا۔ اصول یہ ہے کہ اپنی ''میں'' کو مسلسل مجروح اور شکستہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس ''میں'' کے اندر چھپا زہر خارج ہو جاتا ہے۔ پھر یہ ''میں'' روح کا مطیع و غلام ہو جاتا ہے اور ایک نفس پرست بندہ، اپنی انا کا مارا، تمام وقت ''میں میں'' کر کے ممیانے والا بندہ ایک روحانی وجود میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ روحانی وجود کے معنی ہیں، اس کی نفسانی خواہشات ان اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے تابع ہو جاتی ہیں جن کی پابندی کرنا شریعت کا تقاضا ہے۔ ظاہر ہے آدمی اپنی اصلاح کتابیں پڑھ کر خود کرنا بھی چاہے تو اس میں کامیابی کا امکان برائے نام ہے۔ کیوں کہ ''میں'' یا ''انا'' یا ''نفس'' نہایت عیاری سے بھیس بدل لینے پر قادر ہے۔ کبھی تو یہ نفس پابندیٔ شریعت اور احکامات الٰہی پر عمل کرنے کے نام پر بندگانِ خدا کی توہین اور دل آزاری کراتا ہے اور کبھی دین داری کے عقب میں ریا اور دکھاوا پوشیدہ کر دیتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں یہ دین داری یا شریعت کی پابندی خداوند تعالیٰ کے نزدیک مغضوب قرار پاتی ہے اور اس سے دو قدم آگے بڑھیں تو شریعت کے نفاذ کے لیے نعرے لگانے اور جلسے جلوس کرنے سے نفس اطمینان دلا دیتا ہے کہ غلبۂ دین کی جدوجہد کی حجت پوری ہوئی۔ حالاں کہ اصلاحِ نفس، اصلاحِ باطن اور دوسرے لفظوں میں اپنی ''میں'' اور ''انا'' کو صراطِ مستقیم دکھائے بغیر ہماری عبادات اور غلبۂ دین کے لیے ہمارے زبانی کلامی جہاد کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ خدا جانے اللہ تعالیٰ کے حضور انھیں قبولیت نصیب ہوگی بھی یا نہیں۔

مولانا مودودیؒ نے تصوف کا مطالعہ کیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ ''میں'' کے استعمال میں کیا کیا مفاسد ہیں۔ لیکن یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اگر ایک شخص اپنے اصلاح باطن کے لیے پیہم ریاضتوں سے خود کو خود غرضی، خود پسندی، خوشامد، مصلحت، جاہ طلبی اور مفاد پرستی جیسی برائیوں سے بڑی حد تک خود کو محفوظ کر لیتا ہے تو اُس کا ''میں'' ضرر رساں نہیں رہا، اس لیے وہ اس کا استعمال کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نفس کو پہچاننے اور اس کا تذکیہ کرنے کی فکر کی توفیق دے (آمین) اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔''

○○○

تعلیم کا حقیقی تصور

ایقان حسن قریشی

''تعلیم کا مقصد انسان کو بتانا نہیں بلکہ انسان کو بنانا ہے'' یہ قولِ زریں اِس عظیم خادمِ علم کا ہے۔

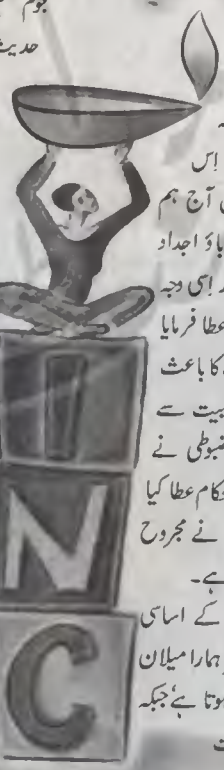

جو شہنشاہِ علم کا مرید تھا۔ اِس خادمِ علم کو دنیا علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام سے جانتی ہے جو علامہ شبلی نعمانیؒ کے خلفِ رشید تھے۔ اِس قول میں کئی راز پوشیدہ ہیں جنھیں آج ہم جاننے سے قاصر ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد تعلیم کے مقصد کو بخوبی سمجھتے تھے اور اِسی وجہ سے قدرت نے اُنہیں وہ عروج عطا فرمایا جو آج بھی ہمارے لیے فخر و مسرت کا باعث ہے۔ اسلاف نے تعلیم کو ہمیشہ تربیت سے جوڑے رکھا اور اِس رشتے کی مضبوطی نے اُنھیں اندرونی اور بیرونی طور پر استحکام عطا کیا لیکن اِس کلیدی رشتے کو آج ہم نے مجروح کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔

جب ہم انسانی نشو و نما کے اساسی پہلوؤں کی بات کرتے ہیں تو اکثر ہمارا میلان مادی اور ظاہری ترقی کی جانب ہوتا ہے جبکہ اُس کی روحانی اور باطنی تربیت یکسر نظر انداز کر دی جاتی ہے جس کے انتہائی منفی نتائج ہم اپنے معاشرے میں روزانہ دیکھتے ہیں اور اُن پر ہمارا دل کڑھتا رہتا ہے۔ عصرِ حاضر میں تعلیم کا بلند پایہ مفہوم ہماری تنگ نظری اور جمودی سوچ کے سبب کلیتاً مسخ ہو چکا ہے۔ تعلیم پہلے دنیاوی اور دینوی علوم کے حصول کا نام تھا اور اِن کے درمیان میں کسی تفریق کی گنجائش نہیں تھی۔ اس ضمن میں تاریخِ اسلام ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے کہ مسلم حکمرانوں نے ہر خطے میں درس گاہیں تعمیر کروائیں جہاں ہر طرح کے علوم بغیر کسی تفریق اور فوقیت کے پڑھائے جاتے تھے۔ علمِ نجوم، علمِ ہیئت، ریاضی، فلکیات، جغرافیہ، کیمیا، تاریخ، حدیث، فقہ، قرآن، تفسیر وغیرہ سب علوم کی مشترکہ تعلیم دی جاتی تھی۔ دنیاوی اور دینوی علوم کے اِس امتزاج نے طلبہ کو اخلاقی اور مادی دونوں لحاظ سے پختہ بنا دیا تھا اور اُس دور کی مجموعی حالت اسی لیے ہماری موجودہ حالت سے لاکھ درجے بہتر تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم آج کثرتِ اساتذہ کے باوجود مجموعی طور پر جمود کا شکار کیوں ہیں۔ سبب یہ تھا کہ ماضی میں اساتذہ اخلاق کا بہترین نمونہ ہوتے تھے جن سے طلبہ گہرا اثر لیتے تھے جبکہ عصرِ حاضر کے اساتذہ اخلاقی قدروں کی خود پاسداری نہیں کرتے جس سے طلبہ پر منفی اثر پڑتا ہے۔ اُس عہد میں کتاب سے زیادہ استاد سے علم حاصل کیا جاتا تھا جبکہ آج استاد محض ایک علامتی کردار بن کے رہ گیا ہے۔ اچھے دنوں میں اساتذہ اپنی خوشی سے اور دولت کی خواہش کے بغیر طلبہ کو تعلیم دیتے تھے اور نوجوانوں کی تعلیم و

تربیت کا احساس اُن میں ہر لمحہ ایک ایسا جذبہ بیدار کیے رکھتا تھا جس کا دیا کبھی نہیں بجھتا تھا۔ وہ علم کو اللہ سے قربت کا ذریعہ جان کر اس کی بھرپور ترویج کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک تعلیمی درس گاہیں محض ایک ٹیکسال کے بجائے اُس گلستان کا درجہ رکھتی تھیں جہاں نونہال کلیوں کی دیکھ بھال ایک مقدس فریضے کے طور پر کی جاتی تھی، لیکن بدقسمتی سے آج علم پیشہ ورانہ اساتذہ کے ہتھے چڑھ گیا ہے جو تعلیم کو محض ایک کاروبار سمجھتے اور اُسے اپنی مادی خواہشات پورا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مسلم حکومتوں میں اساتذہ اور معلمین کو خاطر خواہ مشاہرے ملا کرتے تھے جو انھیں مالی تنگی کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ اِس کے نتیجے میں وہ اپنے فرائضِ منصبی پوری دیانت داری اور دلجمعی سے سر انجام دیتے تھے۔ جبکہ عصرِ حاضر کے اکثر معلمین مالی تنگ دستی کی وجہ سے بے سکونی کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔

بحیثیتِ مجموعی یہ معاشرہ استاد کی قدر کھو چکا ہے اور علم کے داعی کی جو تذلیل و تحقیر تعلیمی اداروں میں ہوتی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ہماری زندگی سے اعلیٰ مقاصد کا نظریہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور صرف دولت کی ریل پیل ہماری نظروں کو بھاتی ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف کے کارناموں کے بارے ہی کچھ پتا ہے نہ ہم چاہتے ہیں کہ آنے والے لوگ ہمارے کارناموں کے حوالے سے ہمیں یاد رکھیں۔ ہم عام طور پر مغرب کی تقلید کرتے ہیں مگر وہ ممالک اپنی تاریخ پر فخر محسوس کرتے ہیں جو عظمت سے خالی ہے۔ ہماری تاریخ جو انسانی تہذیب کی تشکیل اور ارتقا کی عظیم داستانوں سے معمور ہے اُس پر ہمیں فخر کرنا اور مستقبل کی تعمیر کا چیلنج قبول کرنا چاہیے۔

ہم مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے سے جدا کر کے بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ مذہب انسان کے اندر پاکیزہ جذبہ اور ایک احساسِ ذمے داری پیدا کرتا ہے جو طالب علم کو حصولِ علم ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت سے ادا کرنے کی طرف مائل کرتا ہے، جبکہ بیشتر طلبہ کا نظریہ، یہ ہے کہ علوم دولت کمانے کے لیے حاصل کیے جائیں۔ اُن کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ تعلیم کا مقصد حصولِ روزگار کے سوا اور کچھ نہیں اور وہ بچارے مشین کی طرح کام میں جُتے رہتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے تعلیمی ادارے طلبہ کو چار دیواری کے اندر انسان کے بجائے مشین بنا رہے ہیں۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ اپنی قوم کو مشین بنانا ہے یا عمدہ انسان۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نئی نسل کے اندر قومی خدمت کا جذبہ مفقود ہے اور ہمارے بہترین اذہان غیروں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ قربانی کا جذبہ اور میلان بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری حکومت تعلیمی نصاب کی بہتری میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہی اور ہمارا اسلامی تشخص بری طرح مجروح ہو رہا ہے۔ دراصل ہمارے اندر سے اعتدال پسندی کا عنصر ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے سے ہم گھبراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یا تو آپ کو اِس ملک میں قدامت پسند طبقہ مدرسوں میں ملے گا جو جدید تعلیمی تقاضوں سے ناآشنا ہے یا پھر مغرب پرست جدید تعلیم کا علمبردار طبقہ جو دینی تعلیم کی اہمیت سمجھنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نظر نہیں آتا۔

جس دن ہم تربیت اور کردار سازی کو اپنے تعلیمی نظریے میں شامل کر لیں گے، اُسی روز سے اِن شاء اللہ ہمارا مقدر تبدیل ہونا شروع ہو جائے گا اور تعلیم کا حقیقی تصور شرمندۂ تعبیر ہونا شروع ہو جائے گا۔ ○○○

لو پھر دسمبر آ گیا، زخم دل کا ہرا ہو گیا

سونار بنگلہ

سنہری بنگال کے ایک نوجوان کی کتھا

وہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی جو جملے اسے زہر لگتے تھے،
روح میں آبِ حیات بن کر کیوں اترنے لگے ہیں

مطالعہ کی میز پر
نوید اسلام صدیقی

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

مشرقی

پاکستان کیسے بنگلہ دیش بنا، اندرا گاندھی نے کیوں کہا کہ ہم نے ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا۔ ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہم آج آپ کے سامنے ڈاکٹر محمود الرحمن کی کتاب 'سونار بنگلہ (سنہری بنگال)' سے ایک سچی کہانی پیش کر رہے ہیں، اِس کہانی کا مرکزی کردار نوجوان ہیرو ابوالکلام ہے۔

☆ تعارف و کتاب 'سونار بنگلہ'

کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ظفر جمال بلوچ رقم طراز ہیں ''اس کتاب میں محض ان مجاہدوں کے کارناموں ہی کا تذکرہ نہیں ہے، جنھوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے پاک فوج کے ساتھ مشرق میں تعاون کیا، بلکہ ایک حد تک اُس دور کی سیاسی تاریخ کا تذکرہ بھی ملے گا جس میں جہاں آپ کو حب الوطنی کے پیکر چلتے پھرتے نظر آئیں گے، وہیں راہبروں اور راہنماؤں کے روپ میں میر جعفر و صادق بھی ملیں گے، جنھیں پہچاننا اہلِ نظر کے لیے مشکل نہ ہوگا۔''

☆ دیباچہ

ڈاکٹر محمود الرحمن لکھتے ہیں: سنہری بنگال کی رنگینی و رعنائی اپنی مثال آپ ہے، یہ زرخیز خطہ جہاں ہمیشہ سے سمندری طوفانوں کی آماجگاہ بنا رہا، وہاں اس دھرتی نے ہزاروں سیاسی طوفانوں کو بھی جنم دیا اور تیز طرار بنگالیوں کی زندگی میں ہلچل مچا کر رکھ دی۔ ایسا ہی ایک طوفان بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں برپا ہُوا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں انسانوں کی بھینٹ اپنی آغوش میں لے کر چلتا بنا۔ سپین کے زوال کے بعد یہ اسلام کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

ایک سچا مسلمان ''ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست'' پر کامل یقین رکھتے ہوئے ہمیشہ وطنیت سے بالاتر ہوکر سوچتا ہے۔ تاریخ عالم میں بہت سے ممالک کے ساتھ عبرتناک شکست کے حوادث پیش آئے اور ان کے علاقے دھرتی کے سینہ پر اُسی طرح موجود رہے لیکن پاکستان کا معاملہ ان سے مختلف تھا۔ پاکستان کسی خطۂ زمین کا نام نہیں، ایک مقصد اور نظریے کا نام تھا۔ پاکستان ایک امانت کا نام تھا، جسے ہم نے خدائے لم یزل سے اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم اس میں خدا کا قانون چلائیں گے اور اسے اسلام کا قلعہ بنا کر چھوڑیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی حفاظت کی خاطر لڑنا عین جہاد اور اس کی آبرو پر جان دینا عین شہادت قرار پایا۔

ابھی ایک نسل بوڑھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس امانت پر ڈاکا پڑا اور ہم اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے۔ امانت کے چھن جانے کے بعد ہم نے اپنے روٹھے ہوئے ان بھائیوں کو فراموش کر ڈالا، جنھوں نے کبھی مسلم لیگ کی بنیاد رکھ کر پاکستان کی تعمیر میں اپنا خون دیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی جتنی مساجد، دینی درسگاہیں اور اسلام کا درد رکھنے والے افراد مشرقی بنگال میں پائے جاتے ہیں، دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ملتے۔ پاکستان کے ساتھ بھی ان کی ہمدردیاں بدستور برقرار ہیں۔

اس کتاب میں بنگلہ دیش کے بحران کے دوران قربان ہونے والے سرفروشوں کی خونچکاں داستان رقم کی گئی ہے اور اس بے رحم سیاست کی حقیقی تصویر کھینچی گئی

ہے جس نے پاکستان کو دو ٹکڑے کر ڈالا۔ کتاب کے تمام کردار حقیقی ہیں۔ اس کے مرکزی کردار، ابوالکلام پاکستان میں زندہ و سلامت موجود ہیں۔

.....☆.....

پہلا باب: مجرم

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

☆ ابوالکلام آخری پیریڈ ختم ہونے کے بعد نواب گنج ڈگری کالج کی چار دیواری کے اندر آم کے ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑا اپنے دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک اسے چاروں طرف سے چند سائے اپنی طرف بڑھتے نظر آئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں ہاکیاں اور ڈنڈے تھامے ہوئے تھے۔ ابوالکلام خطرہ محسوس کرتے ہی دیوار کی طرف لپکا، لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا وہ اُن کے قابو آچکا تھا۔ اُس کے جسم پر بے تحاشا ہاکیاں برسنے لگیں۔ ایک عوامی لیگی غنڈہ کہہ رہا تھا، ''اس پاکستان کے ایجنٹ کی ٹانگیں توڑ دو''۔ وہ اللہ کا نام لے کر اُٹھا اور پوری قوت سے دوڑنے لگا، غنڈے اُس کے پیچھے پیچھے آرہے تھے، دوڑتے ہوئے اس کی نظر سائیکل کے ایک ٹوٹے ہوئے چین پر پڑی، اس نے فوراً اسے اٹھا کر گھمانا شروع کر دیا۔ دو غنڈے اس کی زد میں آکر زخمی ہوگئے۔ اسی اثنا میں چند لوگ شور سن کر اُن کی طرف آتے دکھائی دیے، حملہ آور انہیں دیکھ کر جلدی سے فرار ہوگئے۔

ابوالکلام نواب گنج ڈگری کالج میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ وہ اسلامی چھاترو شنگھو نواب گنج کا ناظم بھی تھا۔ کالج کی پوری سیاست اس کی شخصیت کے گرد گھومتی تھی۔ نواب گنج کو ضلع راجشاہی کا سب ڈویژن ہونے کی وجہ سے کافی اہمیت حاصل تھی اور دور دراز علاقوں کے لڑکوں کو پڑھنے کے لیے یہیں آنا پڑتا تھا۔ ابوالکلام اپنے آٹھ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اُس کے والد بدیع الزماں علاقہ کے بڑے بااثر زمیندار تھے، سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ تحریک اسلامی کے ساتھ انہیں دلی لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ابوالکلام کی غیر نصابی مصروفیات پر کبھی پابندی نہیں لگائی۔ اُس کی بوڑھی والدہ بھی اکثر معاملات میں بیٹے کی حمایت کرتی تھی۔

☆ ستمبر 69ء کی ایک صبح جب وہ پہلے دن کالج گیا تو شنگھو کے چند سرگرم کارکنوں سے اس کا تعارف ہوگیا اور اس نے بھی اسی روز شنگھو کا سپورٹر فارم پُر کر دیا۔

گزشتہ سیاسی واقعات اور بنگال کے افق پر منڈلانے والے نئے خطرات نے عوامی زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ سنہری بنگال کے استحصال کی داستانیں ہر خاص و عام کی زبان پر تھیں، آئندہ سال ہونے والے ملک گیر انتخابات لوگوں کے دلوں میں ہلچل مچا رہے تھے۔ اب لوگ قدرے مطمئن تھے کہ چلو اپنی پسند کے نمایندے منتخب کرنے کا ایک موقع تو ملا۔ ابوالکلام انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ جب بھی کوئی جلوس نکلتا، وہ آگے آگے چلتے ہوئے پوری قوت سے پاکستان اور اسلام کے حق میں نعرے لگاتا۔

تمام سیاسی پارٹیوں کے لیے طلبہ ایک عظیم قوت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسلامی چھاترو شنگھو کا شمار وطن

دوست اور اعتدال پسند پارٹیوں کی مددگار تنظیموں میں ہوتا تھا۔ عوامی لیگ کی حمایت کے لیے کالجوں میں ''چھاترو لیگ'' کام کر رہی تھی۔ تعلیمی اداروں میں چھاترو شنگھو اور چھاترو لیگ کے امیدواروں کے درمیان سخت مقابلہ تھا۔ شنگھو نے ہر جگہ ملک دشمن عناصر کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ ابوالکلام کا جرم یہ تھا کہ اس کالج میں اسلام پسندوں نے زیادہ نشستیں جیت لی تھیں۔

......☆......

باب دوم: خطرناک سازش

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!

☆ابوالکلام نے 25 مارچ 71ء کو مارشل لا کے نفاذ کا اعلان سنا تو اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ دوسرے روز بیدار ہوتے ہی وہ فوراً گھر سے نکلا اور عوام کی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے شہر کا ایک چکر لگایا، عوامی لیگیوں کے تیور بدستور بگڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ پاکستان آرمی بہت سے شر پسند عناصر کو پکڑنے میں ناکام رہی ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ عوامی لیگ والوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے ہتھیار جمع نہیں کروائیں گے۔

دوپہر کے قریب پاک ملٹری کے کوئی بیس ٹرک نواب گنج شہر میں داخل ہوئے۔ ان میں اندازاً چھ سو فوجی ایسٹ بنگال رجمنٹ کے تھے۔ چالیس پچاس افراد مغربی پاکستانی تھے، انہی میں کیپٹن اسحاق بھی تھے جو اس دستہ کی کمان کر رہے تھے۔ مائیک پر اعلان ہوا کہ اپنے ہتھیار جمع کروا دیں، شہر میں چھ بجے شام سے صبح کے پانچ بجے تک کرفیو رہے گا۔ لوگ سڑکوں پر کھڑے اعلان سُن رہے تھے۔

ابوالکلام واپس آیا تو گھر کے افراد گاؤں جانے کی تیاری کر رہے تھے، وہ خود بھی شہر کی فضا میں پھیلی ہوئی گھٹن سے ذہن کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ رات سونے سے قبل تمام فیملی ممبرز گاؤں پہنچ چکے تھے۔

تمام رات نواب گنج کی طرف سے اِکا دُکا گولی چلنے کی آواز آتی رہی۔ آثار بتا رہے تھے کہ شہر میں گڑبڑ ہے۔ صبح معلوم ہوا کہ رات کے وقت بنگال رجمنٹ نے غداری کر کے پنجاب ملٹری کے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔ شہر پر عوامی لیگ کا قبضہ ہے۔ بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا گیا ہے، عوامی لیگ اپنے آدمیوں میں ہتھیار تقسیم کر رہی ہے۔ ساتھ ہی شہر میں اپیل کی جا رہی تھی کہ بنگال رجمنٹ کے پاس راشن نہیں ہے، اس لیے فوج آزادی کے لیے کھانا پہنچا دیا جائے۔

☆چھاترو شنگھو نے تربیت گاہوں اور سالانہ اجتماعات کے ذریعے اپنے کارکنوں کو ایک لافانی رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔ یہ کارکن ملک کے جس حصہ میں بھی ہوں ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ ابوالکلام کے قریبی دوستوں میں عبدالمنعم کا شمار بھی ہوتا تھا۔ عبدالمنعم ضلع میمن سنگھ کے ایک سرحدی قصبہ دیوان گنج کا رہنے والا تھا۔ اس کا بڑا بھائی دیوان گنج یونین کونسل کا چیئرمین تھا اور عوامی لیگ کا ورکر تھا۔ ان کے والد اکثر تبلیغی جماعت کے ساتھ دوروں پر رہتے تھے۔

عبدالمنعم نٹ کھٹ طبیعت کا بیس سالہ نوجوان تھا۔ چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی تھی، دبلے پتلے عوامی لیگی اس کے مضبوط گوریلا جسم سے خوف کھاتے تھے۔ اس

نے ڈھاکہ کے مدرسہ عالیہ سے دورہ حدیث مکمل کیا تھا۔ اس دوران میں وہ جمعیتی زندگی کے مختلف مراحل طے کر کے ایک سرگرم کارکن بن چکا تھا۔ میٹرک کے بعد اس نے دیوان گنج کالج میں داخلہ لیا اور وہاں شنگھو کی تنظیم کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔

اپریل کے آغاز تک دیوان گنج میں قدرے سکون تھا۔ جب فوج کے بکھرے ہوئے دستوں نے کہیں کہیں آپریشن شروع کیا تو ملک دشمن عناصر فرار ہو کر بھارت پہنچنے لگے۔ انڈیا پہنچ کر انڈین آرمی سے مدد مانگی اور پاکستان کے خلاف وہاں بیٹھ کر منصوبہ بندی میں مصروف ہو گئے۔

......☆......

باب سوم: ہزار میل پرے

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ''ہری ہری''

☆شیخ مجیب الرحمٰن نے عوامی حقوق کی جدوجہد کے آغاز کے لیے چھ نکات کو اپنی مہم کی بنیاد بنایا۔ شروع شروع میں چھ نکات 1966ء میں منظر عام پر آئے لیکن اس قدر شہرت حاصل نہ کر سکے، مگر 70ء کے الیکشن میں ان نکات نے برصغیر کی سیاست کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ چھ نکات کیا ہیں؟ ان کی تفصیلی شرح کیا ہے؟ اس سے کسی کو غرض نہیں تھی۔ بنگالی عوام، چاہے پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ، صرف اتنا جانتے تھے کہ یہ ہمارے حقوق کی آواز ہے انہیں اس مطالبے سے جذباتی حد تک لگاؤ تھا۔

بظاہر چھ نکات اپنے اندر بلا کی سختی لیے ہوئے تھے مگر حقیقت میں یہ ایک سیاسی مطالبہ تھا اور سیاست میں ایسا ہی چلتا ہے۔ مطالبات کو مطلوبہ ضروریات سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے، پھر سیاسی حکمت عملی سے انہیں مناسب ردوبدل کے ساتھ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر بھٹو نے وقتی طور پر ان میں سے ساڑھے پانچ نکات تسلیم کرنے کا اقرار بھی کر لیا، اگرچہ یہ ایک سیاسی چال تھی۔

☆صدر یحییٰ ایک جرنیل تو ضرور تھے مگر وہ کارزار سیاست کی پٹخنیوں سے قطعی نابلد تھے۔ ان کا دورِ حکومت حماقتوں کا ایسا مرقع تھا جو ملک کی المناک تباہی پر منتج ہوا۔ 69ء میں پورے سال کے دوران مشرقی پاکستان پر مارشل لا ایسی بیدردی کے ساتھ نافذ رکھا گیا کہ یہ بجائے خود مسلح افواج کے وقار کا مسئلہ بن گیا۔

آخر الیکشن کا دن آ پہنچا۔ عوامی لیگ نے قومی اسمبلی کی 313 نشستوں میں سے 167 اور پیپلز پارٹی نے 88 نشستیں حاصل کیں۔ یحییٰ خان نے مجیب کی کامیابی کا خیر مقدم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ملک کے آئندہ وزیر اعظم مجیب الرحمٰن ہوں گے۔ یہیں سے اقتدار کی سرد جنگ شروع ہو گئی۔ پیپلز پارٹی گویا ہر صورت میں اقتدار چاہتی تھی، بھٹو کے عجیب و غریب بیانات ملک کی سیاسی فضا میں تلخی پیدا کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے مجیب کو ''اِدھر ہم، اُدھر تم'' کا پیغام دے کر بذاتِ خود صوبائی علیحدگی کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔

یحییٰ خان نے ملک کا آئین ایک سو بیس دن کے اندر اندر تیار کرنے کی شرط عائد کر رکھی تھی۔ قومی اسمبلی

کا اجلاس 3/مارچ 71ء کو اکثریتی آبادی کے صوبائی دارالحکومت ڈھاکہ میں ہونا قرار پایا۔ عوامی لیگ نے ایک دستوری مسودہ قانون تیار کرلیا۔ پیپلز پارٹی کو خطرہ لاحق ہوا کہ عوامی لیگ اپنی اکثریت کی بنا پر اپنے دستور کی منظوری حاصل کرلے گی۔

پیپلز پارٹی کو گوہر مقصود حاصل ہوتا نظر نہیں آرہا تھا، اس لیے اُس نے سرے سے اسمبلی کے اجلاس ہی کو ناکام بنانے کا پروگرام بنالیا۔ بھٹو نے اعلان کیا کہ اگر کوئی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ یحییٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کردیا۔ ایک دفعہ بلانے کے بعد اجلاس کا ملتوی کر دینا یحییٰ خان کی بہت بڑی سیاسی غلطی ثابت ہوا۔ اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہوتے ہی مشرقی پاکستان میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مجیب نے 2/مارچ کو عام ہڑتال کرنے کا اعلان کردیا۔

☆ دو مارچ کی ہڑتال کی کامیابی کے بعد مجیب نے 4 مارچ سے پورے صوبہ میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی۔ عوامی لیگ کے دو لاکھ تربیت یافتہ اور مسلح رضا کار نیز بھارتی غنڈے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے حرکت میں آگئے۔

15 مارچ کو یحییٰ خان اپنے مشیروں کے ہمراہ شیخ مجیب سے بات چیت کرنے کے لیے ڈھاکہ پہنچے، لیکن مذاکرات میں ناکامی کے بعد یحییٰ خان اسلام آباد واپس آنے کے بجائے بھٹو سے ملنے لاڑکانہ پہنچ گئے۔ 25 مارچ کو بھٹو اپنے مشیروں سمیت یحییٰ خان کی دعوت پر ڈھاکہ پہنچ گئے۔ سہ فریقی مذاکرات یحییٰ، مجیب اور بھٹو کے درمیان یکم مارچ سے زور شور سے جاری تھے۔ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں 25 مارچ تک ان ناکام ہی نتیجہ سامنے آیا وہ یہ کہ: تینوں لیڈر ملک کو علیحدگی کی جانب دھکیل رہے تھے۔

23 مارچ کو مجیب کی ہدایت پر یوم مزاحمت منایا گیا۔ عوامی لیگ نے 25 مارچ کی رات کو جمہوریہ بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس رات یحییٰ خان نے عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ شیخ مجیب الرحمن کو گرفتار کرکے خصوصی طیارے کے ذریعے مغربی پاکستان پہنچا دیا گیا۔

.....☆.....

باب چہارم: جانباز گوریلے

کشادِ درِ دِل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں!

ابوالکلام نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا کہ ہمیں ٹریننگ حاصل کرکے پاکستان آرمی کی مدد کرنا چاہیے۔ پاک فوج کے لیے اپنے محدود وسائل اور بے پناہ رکاوٹوں کے سبب دور دراز علاقوں میں پہنچنا مشکل تھا۔ لہٰذا ان سے مدد ملنے کے امکانات معدوم تھے۔ منصوبہ کے مطابق ابوالکلام نے اپنے ساتھیوں سمیت مکتی باہنی کے رضا کاروں کے ساتھ عوامی لیگ سے ٹریننگ حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔

اپریل کے آغاز میں تربیت شروع ہوئی۔ پچھتر افراد میں سے دس پندرہ مکتی باہنی کے تھے، باقی دلی طور پر پاکستان کے حامی تھے۔ ٹریننگ کامیابی سے مکمل ہو گئی مگر ابوالکلام اور اُس کے ساتھی اسلحہ حاصل نہ

کر سکے۔ مکتی باہنی اور عوامی لیگ نے غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع کر رکھا تھا۔ اپریل کے آغاز میں فوج اُس علاقے میں آگئی، جب اسے اس ظلم کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے بھی 80 افراد کو بغیر کسی قسم کا عذر سنے گولی مار دی۔ پاکستان کے بعض حامی بھی مارے گئے۔ پورے علاقے میں دہشت پھیل گئی، مشہور ہوگیا کہ پاک فوج بہت ظلم کررہی ہے۔ لوگ سرحد پار کرکے انڈیا کی طرف بھاگنا شروع ہوگئے۔

ابوالکلام نے نواب گنج میں موجود سیکیورٹی آفیسرز سے رابطہ قائم کیا۔ انہیں صحیح صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنے حامی رضا کاروں کے بہت سے ایڈریس مہیا کیے۔ پھر آرمی کی خواہش پر شنگھو کے رکن مظہر الاسلام کے ساتھ مل کر تمام رضا کاروں کو پاک گارڈ کے نام سے جمع کرلیا۔

مکتی باہنی اور بھارتی افواج کے گوریلے بنکوں، ڈاکخانوں، فیکٹریوں، ٹیلی فون ایکس چینج اور پولیس چوکیوں پر اچانک حملہ کرتے اور جانی اور مالی نقصان پہنچا کر فرار ہوجاتے، حفاظتی اقدامات کے لیے صوبہ کے مختلف حصوں میں کئی نیم عسکری تنظیمیں المجاہد، الشمس اور پاک گارڈ کے نام سے کام کر رہی تھیں لیکن ایک اعلیٰ معیار کی صوبہ گیر قابلِ اعتماد گوریلا تنظیم کی ضرورت بدستور موجود تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ضلع میمن سنگھ سے ''البدر'' تنظیم کا آغاز کیا گیا۔ کرنل عبدالعزیز خان کی قیادت میں اسلامی چھاترو شنگھو کے طلبہ کو اکٹھا کیا گیا۔ 23 مئی 1971ء کو ''البدر'' وجود میں آئی اس کے ممبر البدر کیڈٹ کہلاتے تھے۔ مداخلت کاروں کے لیے 'البدر' سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوئی۔

'البدر' کا نام سنتے ہی دشمن پر خوف و ہراس طاری ہوجاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ضلع میمن سنگھ میں مکتی باہنی کی تخریبی کارروائیاں دم توڑ گئیں اور عوام میں ایک بار پھر اعتماد کی کیفیت بحال ہوگئی۔

میمن سنگھ میں البدر کی حیرت انگیز کامیابیوں کے بعد پاک فوج کی ہائی کمان نے پورے مشرقی پاکستان میں 'البدر' کے قیام کی اجازت دے دی۔ تمام مقامات پر شنگھو کے ورکرز کو سرکلر کے ذریعے ہدایت کردی گئی کہ وہ اپنے اپنے مقام پر البدر قائم کرکے پاک فوج سے مکمل تعاون کریں۔ وسطِ اکتوبر تک مشرقی پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں البدر کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اور دس ہزار کیڈٹ تیار ہوچکے تھے۔

البدر کے تین شعبے تھے، فائٹنگ گروپ، انٹیلی جنس برانچ اور سول افیئرز برانچ۔ کامیاب گوریلا وار فیئر کے لیے ان تینوں شعبوں کا ہونا ضروری تھا۔ البدر کے تینوں شعبے بھرپور انداز میں کام کر رہے تھے۔ پاک فوج نے بہت سارے معرکے البدر کے تعاون سے انجام دیے۔ البدر کے انٹیلی جنس کے شعبے پر پاکستان آرمی بہت بھروسا کرتی تھی۔ البدر والے وہاں سے بھی خبریں لے آتے تھے جو جگہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوتی تھی۔

.....☆.....

باب پنجم: پسپائی

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تُو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا

3 دسمبر کو ابوالکلام آرمی ہیڈکوارٹر میں میجر سجاد کے

پاس بیٹھا تھا جب یہ خبر آئی کہ انڈیا کے ساتھ جنگ کا اعلان ہوگیا ہے۔ڈھاکہ میں ہماری فوج نے انڈیا کے چھ جنگی طیارے گرالیے ہیں۔

9 دسمبر تک جنگ نے فوج اور البدر دونوں کو اس قدر مصروف رکھا کہ کسی کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔نواب گنج سے کچھ دور سب گنج کے مقام پر پاک آرمی کا بہت بڑا کیمپ تھا،نزدیک ہی بھارتی سرحد تھی۔ جنگ میں شدت آنے کے بعد ادھر سے بھارتی فوج کی پیش قدمی کی اطلاعات آرہی تھیں۔

رات ڈیڑھ بجے البدر کیمپ میں معلوم ہوا کہ پاکستان ملٹری یہاں سے فرار ہورہی ہے۔ جب عوام میں یہ خبر پھیلی کہ فوج نواب گنج کو خالی کرگئی ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوا اور وہ اپنے جان و مال کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے۔

11 دسمبر کو تمام بازار بند تھے۔اس روز بہت سے لوگ ٹاؤن چھوڑ گئے۔رات کو ایسی خبریں آرہی تھیں کہ انڈین آرمی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔

ابوالکلام اور البدر کے جوان جو بھی ممکن ہوسکتا تھا کر رہے تھے، لیکن حالات انتہائی مایوس کن تھے۔ 15 دسمبر کو 'راج شاہی البدر' کے کمانڈر عبدالحئی فاروقی نے ابوالکلام سے کہا'' آپ کو معلوم ہے کہ پاک فوج واپس جارہی ہے؟ اب موقع ہے، آپ ان سے گفت وشنید کے ذریعے البدر کے تحفظ کی شرائط طے کرلیں۔''

ابوالکلام نے جواب دیا''واہ، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، ہم جیت رہے ہیں، ہم آخری دم تک لڑیں گے۔''

ابوالکلام کئی راتوں سے لگاتار جاگ رہا تھا۔اُس نے جلدی سے کھانا کھایا اور تھکاوٹ دور کرنے کے لیے سو گیا۔ رات کو ایک بجے اسے ایک کیڈٹ نے جگایا اور کہا کہ پاک فوج کا کیمپ خالی ہوچکا ہے۔ بھارتی فوج تیزی سے قبضہ کررہی ہے۔فوج کی بغیر اطلاع کے واپسی پر ابوالکلام نہایت دل برداشتہ ہوا۔حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ نواب گنج میں مزید ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ وہ 16 دسمبر کی دوپہر سے پہلے راج شاہی پہنچ گیا۔

☆

باب ششم: سلور جوبلی

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثُریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

ضلع میمن سنگھ میں بھارت تیزی سے پیش قدمی کر گیا۔ 7 دسمبر کو اس بات کے واضح آثار نظر آرہے تھے کہ پاک آرمی دفاعی جنگ لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے گی۔البدر کے کارکن کافی پریشان تھے۔10 دسمبر کو پاک فوج آدھی رات تک بھارتی حملے کا جوانمردی سے مقابلہ کرتی رہی۔ اُسی دن رات بارہ بجے کے قریب عبدالمنعم سات کیڈٹوں کے ساتھ ایک مورچے میں پوزیشن سنبھالے ہوئے تھا کہ دفعتاً پیچھے سے 'ہینڈز اپ' کی آواز آئی۔ چند بھارتیوں نے آگے بڑھ کر انہیں قابو کیا اور گرفتار کرکے انڈیا لے جایا گیا۔

خبریں آرہی تھیں کہ بھارتی فوج اپنا گھیرا ہر طرف سے تنگ کررہی تھی۔ پاکستانی فوجیں ڈھاکہ میں سمٹنے لگیں، فوج کے جانی تحفظ کی پوری کوشش کی جارہی تھی۔ بھارت نے کئی جگہ پاک فوج کی پسپائی کے

راستے مسدود کردیے۔تاہم اسے ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی کرنے میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ 16 دسمبر کی صبح تک کچھ بھارتی فوج ڈھاکہ کے گردونواح میں پہنچ چکی تھی۔

☆ آج 16 دسمبر ہے، ڈھاکہ ریس کورس کے وسیع میدان میں ہتھیار ڈالنے کی تقریب کا اہتمام ہورہا ہے۔یہ پاکستان کی زندگی کا پچیسواں سال ہے، پاکستان کی قسمت میں اس کی سلور جوبلی شاید اسی طرح منائی جانا لکھی تھی۔

ڈھاکہ میں کہیں کہیں سے گولیوں کے چلنے اور بم دھماکوں کی آوازیں آرہی ہیں۔بہت سی شاندار عمارات کھنڈروں کا منظر پیش کررہی ہیں۔ ہتھیار ڈالنے کی تقریب کا تماشا دیکھنے کے لیے لوگ ریس کورس میں جمع ہورہے ہیں۔

بھارتی کمانڈر ،جنرل اروڑا سنگھ کا ہیلی کاپٹر ڈھاکہ کے خستہ حال ہوائی اڈا پر اُترا۔ جنرل نیازی نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ایک کار انہیں ریس کورس لے جانے کے لیے منتظر کھڑی تھی۔ساڑھے چار بجے سہ پہر جنرل نیازی اور اروڑا سنگھ ریس کورس میں آئے اور ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ اخباری نمایندے اور ٹی وی کیمرے حرکت میں آگئے۔ جنرل نیازی کا بایاں ہاتھ آگے بڑھا اور انہوں نے میز پر پڑے ہوئے سرنڈر کے اس توہین آمیز مسودے پر دستخط کردیے۔ دستخط کرنے کے بعد جنرل نیازی نے اپنا ریوالور گولیوں سے خالی کرکے جنرل اروڑا سنگھ کے حوالے کردیا۔نیازی کے تمغے اور رینک اتار لیے گئے۔وہ جانے کے لیے گاڑی کی طرف بڑھے تو ہجوم کی طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔''قصاب''،''بھیڑیے'' اور''قاتل'' کا شور بلند ہوا۔ایک شخص نے آگے بڑھ کر جنرل نیازی کے سر پر تڑاخ سے جوتا کھینچ مارا۔

☆ ملک کے مغربی حصہ میں اب تک 'سب اچھا' کی رپورٹ پیش کی جارہی تھی۔عوام کو اصل حالات سے اندھیرے میں رکھا جارہا تھا۔ ہر محاذ پر پاک فوج کی کامیابیوں اور بھارتی فوج کی پیش قدمی کو روک دینے کی خبریں آرہی تھیں۔16 دسمبر کو شام کی خبروں میں اچانک یہ بتایا گیا کہ ڈھاکہ میں مقامی کمانڈروں کے ایک سمجھوتے کے مطابق بھارتی فوجیں شہر میں داخل ہوگئی ہیں۔ پہلے تو عوام الفاظ کی بھول بھلیوں میں گم رہے لیکن جب اصل حقیقت کا پتا چلا تو اس منحوس خبر پر اعتبار کرنے کو جی نہ چاہتا تھا، صدیوں کی جدوجہد اور لاکھوں قربانیوں کے عوض حاصل کیا گیا ملک اور اتنی تیزی سے دشمن کی گود میں چلا جائے؟ لاکھوں فوجی اس طرح بے کسی کے عالم میں ہتھیار ڈال دیں گے؟ آخری دم تک لڑنے کی حسرت پوری کیے بغیر یوں ہار مان لی جائے گی؟ اس قسم کے سوالات ذہنوں میں کھلبلی مچا رہے تھے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ پاکستانی افواج ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال چکی تھیں۔

باب ہفتم: لہو پکارے گا

صحنِ مقتل ہے ظلم کا شاہد، مثلِ انجم چمک رہا ہے لہو!
کیا چھپاتا ہے تیغ تو قاتل! آستیں سے ٹپک رہا ہے لہو!

سقوط ڈھاکہ کے اعلان کے بعد ابوالکلام نے رات کو ریڈیو پر یحییٰ خان کی تقریر سنی۔اس سے اندازہ

ہوتا تھا کہ ابھی لڑائی کا مزید موقع ملے گا، لیکن دوسرے دن معلوم ہوا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔

راج شاہی ریڈیو البدر کے کنٹرول میں تھا۔ان کے حوصلے بلند تھے۔انہوں نے آرمی سے کہہ رکھا تھا کہ اگر تم لڑنا نہ چاہو تو جاتی دفعہ مورچے ہمارے حوالے کر جانا۔البدر نے ایک ہنگامی اجلاس میں فیصلہ کیا۔ پاک فوج ہتھیار ڈالتی ہے تو ڈالے،لیکن ہم خدا کے سوا کسی کے پابند نہیں،جب تک ہمارے جسموں میں جان ہے ہم لڑیں گے۔اور قید ہونے کے بجائے اپنے دفاع کی کوشش کریں گے اور انتہائی ناگزیر حالات میں اپنے ہتھیاروں کو ناکارہ کردیں گے تاکہ وہ دشمن کے کام نہ آسکیں۔

وہاں موجود پاک آرمی کے فوجی افسروں نے اس فیصلے کو مستحسن قرار دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ ہم تو فوجی ہیں اور کوئی بھی فوجی اپنی ہائی کمان کے فیصلوں کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کرسکتا۔

البدر نے رات تک آیندہ معرکوں کی پلاننگ اور ضلع بھر کی مکمل دفاعی سکیم تیار کی۔18 دسمبر کو پاک آرمی کے کمانڈر نے بتایا کہ ہم ''ناٹور'' شفٹ ہو رہے ہیں۔'ناٹور' نارتھ بنگال کا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تھا۔ اسے فوج کی حکمت عملی سمجھتے ہوئے البدر کو بھی ناٹور منتقل کردیا گیا۔

19 دسمبر کی صبح انہوں نے دیکھا کہ ناٹور چھاؤنی کے چاروں طرف مکتی اور بھارتی فوج نے پوزیشن سنبھال رکھی ہے۔اس وقت کرنل نے بتایا کہ ہم ہائی کمان کے آرڈر پر ہتھیار ڈال رہے ہیں۔اب البدر بھی پھنس چکے تھے۔انہوں نے اپنے ہتھیار ناکارہ کردیے اور انہیں اِدھر اُدھر پھیلا دیا۔

کرنل نے انڈین آرمی سے بات کی کہ البدر کا بھی سرنڈر ہونا چاہیے کیونکہ یہ نیم فوجی تنظیم ہے۔مگر انہوں نے انکار کردیا اور کہا ''ہم کسی بھی بنگالی رضاکار کو گرفتار نہیں کریں گے۔ان سے مکتی باہنی نمٹے گی۔

اس پر البدر کو ہدایت کردی گئی کہ آپ سول کپڑے پہن کر آبادی میں روپوش ہوجائیں۔جن لوگوں کی پوزیشن مضبوط ہے وہ گھروں کو چلے جائیں۔ جنہیں جان کا خطرہ ہے، وہ خفیہ راستوں سے فرار ہوکر پاکستان پہنچ سکتے ہیں یا اپنے آپ کو پاکستانی سپاہی ظاہر کرکے فوج کے ساتھ سرنڈر کرسکتے ہیں۔

شام تک اکثر البدر کیڈٹ سول کپڑوں میں روپوش ہوچکے تھے۔ پاک فوج کو صبح کے وقت ساڑھے آٹھ بجے سرسید کالج کے گراؤنڈ میں اکٹھا ہونے کا حکم ملا۔ لوگ ہتھیار ڈالنے کا تماشا دیکھنے جارہے تھے۔ پاک فوج کے دستے مارچ پاسٹ کرتے ہوئے آئے اور لائنوں میں کھڑے ہوگئے، پھر باری باری ہر دستہ آگے بڑھا اور فوجی جوانوں نے اپنے ہتھیار اور بیلٹ اسلحے کے ڈھیر کی نذر کردیے۔ افسران کے امتیازی نشانات اور تمغے کندھوں اور سینوں سے نوچ کر پھینک دیے گئے۔ہتھیار ڈالنے کے بعد فوج واپس کیمپ میں آئی۔افسروں اور جوانوں کو علیحدہ ہوجانے کا حکم ملا۔

کرنل رضوی جوانوں سے جدا ہونے سے پہلے تقریر کے لیے اٹھے۔ انہوں نے بمشکل چند الفاظ ادا کیے۔''ہمیں افسوس ہے کہ مسلمان ہوکر آج ہم نے پہلی دفعہ ہتھیار ڈال دیے ہیں۔'' پھر ان کے آنسو بہ نکلے۔کافی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے دوبارہ

زبان کھولی اور کہا'' آج ہم انڈیا کی قید میں ہیں۔''اور چھوٹ چھوٹ کر رونا شروع کردیا۔دوپہر کے وقت بھارتی انہیں جیپوں میں سوار کرکے نامعلوم مقام کی طرف لے گئے۔ابوالکلام وہاں سے بچتا بچاتا کسی نہ کسی طرح ڈھاکہ پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

.....☆.....

باب ہشتم : اندرا کے قیدی

برقِ ایمن میرے سینہ پہ پڑی روتی ہے
دیکھنے والی ہے جو آنکھ، کہاں سوتی ہے؟

.....☆.....

''وطن کی مٹی سے دور بیٹا! جو گھر ستائے تو یاد رکھنا
مفارقت کے طویل رستے میں تم اکیلے نہیں ہو ہم بھی،
تمہاری آہٹ کے ہم سفر ہیں
تمام آنکھیں تمہارے قدموں کی منتظر ہیں
تمام سینے تمہارے گھر ہیں۔''
(امجد اسلام امجد)

ایک روز محلے کی مسجد میں تبلیغی جماعت آئی ہوئی تھی۔اس میں چند مولوی حضرات کے علاوہ دس بارہ طلبہ بھی تھے۔ابوالکلام نے ان میں اپنائیت محسوس کرتے ایک لڑکے کو الگ لے جاکر اس سے گفتگو شروع کردی۔باتوں سے محسوس ہوا کہ وہ 'البدر' کا رکن ہے اور اب جان بچاتا پھرتا ہے۔ابوالکلام نے جب اسے بتایا کہ وہ البدر کا فائٹنگ کمانڈر رہ چکا ہے تو وہ لڑکا آگے بڑھ کر اس سے بغلگیر ہوگیا۔

دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے کو اپنی اپنی سرگزشت سناتے رہے۔ اجنبی لڑکے نے ابوالکلام کو البدر کی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔اس نے بتایا کہ ڈھاکہ فال کے بعد بھی البدر خفیہ طور پر کام کر رہی ہے اور مختلف مقامات پر پانچ سو سے زائد کیڈٹ دشمن سے لڑتے ہوئے شہید ہو چکے ہیں۔اس لڑکے نے باریسال میں ایک میڈیکل سٹور پر ابوالکلام کو ملازمت دلوادی۔وہ باریسال چلا گیا۔

ستمبر کی چار تاریخ تھی،ابوالکلام کو چند ضروری کاموں کے سلسلہ میں ڈھاکہ جانا پڑا۔بازار میں ابوالکلام کی ملاقات اپنے ایک کلاس فیلو سکندر سے ہوگئی۔سکندر پہلے نواب گنج میں پڑھتا تھا، پھر اس نے ڈھاکہ میں داخلہ لے لیا۔اب وہ میڈیکل کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔سکندر بڑے پرتپاک انداز سے ملا اور کافی اصرار کے بعد اسے اپنے ساتھ لے گیا۔اسے ہوسٹل کے کمرے میں بٹھایا اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ابوالکلام نے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ دروازہ لاک ہے۔ سکندر کچھ دیر بعد عوامی لیگ کے غنڈوں کو ساتھ لے کر واپس آیا۔ دروازہ کھلتے ہی پورا گینگ اندر آن گھسا۔انہوں نے آتے ہی ابوالکلام کی تلاشی لی، جو کچھ اس کے پاس تھا چھین لیا۔وہ گالیاں بک رہے تھے۔ پھر اس کے جسم کو سگریٹ سے داغنے لگے،لوہے کی راڈ سے کمر پر ضربیں لگائی گئیں۔وہ ٹارچر کرتے ہوئے بار بار پوچھتے تھے''البدر والے کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ .....تمہیں پاکستان سے کتنی امداد مل رہی ہے؟ جب تک نہیں بتاؤ گے معافی نہیں ملے گی۔''

ابوالکلام چپ سادھے مار کھاتا رہا۔اس کی خاموشی پر غنڈے مزید طیش میں آگئے اور سینے کے بال

اکھاڑنے لگے۔ شام کے وقت جب پولیس آئی تو ابوالکلام کے جسم سے خون رِس رہا تھا۔ پولیس والے ابوالکلام کو گاڑی میں ڈال کر لال باغ تھانے لے گئے۔ تھانے میں بھی کافی دیر سوال جواب کا چکر چلتا رہا۔ دوسرے روز اسے سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

ابوالکلام نے 19 ماہ کا عرصہ سنٹرل جیل میں گزارا۔ آخر نومبر 1973ء میں ریڈ کراس کے نمایندوں نے پاکستان جانے والوں کی فہرست میں اس کا نام بھی درج کرلیا۔

مارچ 74ء میں 107 آدمیوں کی کلیرنس آئی ان میں سے سترہ بنگالی تھے۔ ابوالکلام کا نام بھی فہرست میں موجود تھا۔ پاکستان کے لیے ان کی روانگی 24/ اپریل 74ء کی رات کی فلائٹ سے قرار پائی۔

......☆......

ڈھاکہ کی پیاری سرزمیں الوداع

24 اپریل کی رات کو ڈھاکہ ایئر پورٹ پر ایک طیارہ پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا۔ پاکستان جانے والے مسافر اس کی روانگی کے اعلان کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ابوالکلام سب سے الگ تھلگ گہری سوچوں میں گم تھا۔

ماضی کے واقعات ایک ایک کرکے اس کے ذہن میں فلم کی سی تیزی سے سامنے آرہے تھے۔ دوستوں اور رشتہ داروں کے دھندلائے ہوئے نقوش اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ چشم تصور میں وہ ظلم وتشدد کی چکی میں پسنے والے مجبور ہم وطنوں کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

ابوالکلام مضطرب ہوگیا اور بار بار پہلو بدلنے لگا، سنہرے بنگال کی یادیں اس کے ذہن کے دریچوں سے جھانک رہی تھیں، وہ سوچ رہا تھا ''یہ مسجدوں کا شہر ڈھاکہ، پانیوں کا شہر باریسال، سرسبز و شاداب سُندربن، کرۂ ارض کی حسین ترین سیرگاہ کاکس بازار، بل کھاتے ہوئے دریا، مانجھیوں کے نرم گرم گیت، کیا میں ان سب کو بھلادوں گا؟ ہرگز نہیں......''

وہ بے چینی کے عالم میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ شدت جذبات سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں، وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہا تھا: ''میں ضرور واپس آؤں گا...... اپنی قوم کی آزادی کے لیے...... اسلام کی سربلندی کے لیے...... اے سُونار بنگلہ! اگر خدا نے چاہا تو میں ضرور آؤں گا...... اسلام کا پرچم لہراتے ہوئے......''

گیارہ بجے طیارے کی روانگی کا اعلان ہوا تو اس کا سلسلۂ خیالات درہم برہم ہوگیا اور دوسرے مسافروں کے ساتھ اپنی نشست پر آکر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کے لاشعور پر چند الفاظ اُبھر آئے اور وہ غیر ارادی طور پر گنگنانے لگا ''آمار شونار بانگلہ۔''

ابوالکلام چونک پڑا۔ آج اس پر اس متعصبانہ مصرعے کے نئے معنی منکشف ہورہے تھے۔ یہی الفاظ جو کبھی اسے زہر لگتے تھے آج اس کی روح میں آبِ حیات بن کر اتر رہے تھے۔ سنہری بنگال اس کی نگاہوں سے اوجھل ہورہا تھا۔

طیارہ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ رن وے پر دوڑنے لگا۔ ابوالکلام نے جلدی سے ڈھاکہ کی سرزمین پر الوداعی نظر ڈالی اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ انھیں جانتا تھا کہ دوبارہ اس شہر کو دیکھ بھی سکے گا یا نہیں۔ چند لمحوں کے بعد طیارہ بنگال کی خنک فضاؤں میں بلند ہوکر گھنے بادلوں میں روپوش ہوچکا تھا۔

○○○

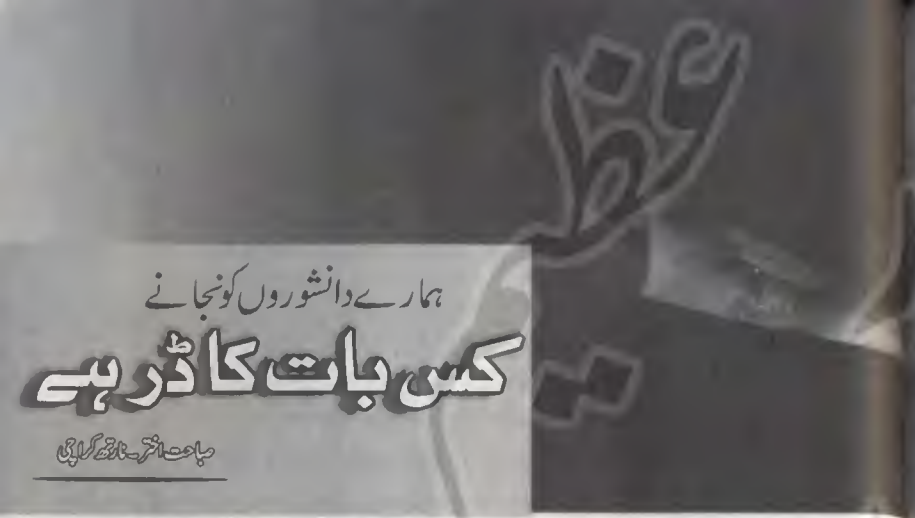

ہمارے دانشوروں کو نجانے

کس بات کا ڈر ہے

صباحت اختر۔ نارتھ کراچی

اکتوبر 2013ء کا درِ دل پر دستک پڑھا، خواتین اور بچیوں کے ساتھ ہونے والے روح فرسا واقعات کا تواتر سے پیش آنا، ہر اس شخص کو جس کے سینے میں دل ہے خون کے آنسو زلا دیتا ہے۔ آپ نے کسی حد تک حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ واقعات چیخ چیخ کر اسلام کے دیے ہوئے نظام عفت وعصمت کو پکار رہے ہیں، جس کے تمام شعبوں کو خود مسلمانوں نے تار تار کیا ہے اور اب یہ تار تار پیرہن ہاتھ میں لے کر زمانے کو دکھا کر نوحہ اور بین کررہے ہیں۔

آپ کا یہ مضمون بہت حد تک تشنہ رہا، آپ اکثر مسائل کا ذکر تو کرتے ہیں مگر اس نکتے پر نہیں لاتے کہ بقا دین اسلام کے آفاقی اصولوں میں ہے، رجوع کریں اور اپنے ماحول کو تبدیل کریں، اس مسئلے کی جڑیں بہت گہری ہیں ہر ادارہ اپنی ساکھ کے لیے عورت ہی کو زینہ بنائے ہوئے ہے۔ آپ کو شاید بُرا لگے مگر دل کا درد بے قرار کررہا ہے تو لکھتی ہوں کہ مضمون پڑھتے پڑھتے آخری سطر پر نگاہ پڑی تو ایک دوشیزہ اور کبوتر کی نہایت مختصر تصویر، کہانی نمبر کی مناسبت سے شائع کی گئی ہے۔ اس چھوٹی سی تصویر سے عورت کی تکریم پر ضرب پڑی ہے یہ رسالہ اس تصویر کے بغیر بھی شائع کیا جاسکتا تھا۔ بس اس مثال کو پورے معاشرے کے کینوس پر پھیلا دیجیے۔

آپ نے جو حل Keep the distance کی شکل میں دیا ہے اس کا انداز کسی لادین معاشرے کے Think tank کا سا ہے کہ وہ بھی بڑھتے ہوئے جبری زنا (Rape) کے لیے اسی قسم کا حل دیتے ہوں گے۔ مگر یہ انداز نبی کریم ﷺ کے اُمتی نے اختیار کیا تو بہت افسوس ہوا۔ دین اسلام سے روگردانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال پر اس قسم کا تبصرہ اور حل دیکھ کر حیران ہوئی۔

نہ جانے کس بات کا ڈر ہے ہمارے دانشوروں کو کہ وہ کھل کر بات نہیں کرتے، کہ کہیں اسلام کے آفاقی اصولوں کی رحمتیں اور برکتیں کھل کر بتا دیں تو کوئی طالبان کا، تبلیغی جماعت کا یا جماعت اسلامی کا لیبل نہ لگائے۔

محترم! یہ معذرت خواہانہ انداز ترک کرنا پڑے گا، آپ کے پاس تو شائستہ، تعلیم یافتہ اور قابل قارئین کی ایک بڑی تعداد ہے، آپ تو خاموش انقلاب لاسکتے ہیں۔ پھر یہ ڈرا

سہا سا تذکرہ مسائل کے حل میں کیوں دیتے ہیں۔

ہم جتنا بچنا چاہیں ہر بات کا، ہر مسئلے کا حل اسی صراط مستقیم سے ملے گا۔ اس کے ذکر سے بچ کر نکلتے ہیں تو بہت سی پگڈنڈیاں بھول بھلیوں میں اپنا آپ بھی بھلا دیں گے۔

(صباحت صاحبہ، آپ کے خط کا بے حد شکریہ مگر آپ کی اکثر باتیں توجہ طلب ہیں۔ میں ذاتی طور پر نیک لوگوں سے کافی ڈرتا ہوں۔ میں ہی کیا۔ ان کے بچے اور آس پاس کے لوگ بھی ڈرتے اور خوفزدہ ہو کر دور دور رہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی نیکی ہر چھوٹی موٹی چیز سے خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اسی ڈر سے وہ بالآخر اکیلے رہ جاتے ہیں۔ ان کے عمل کی خوب صورتی، سوچ کی نفاست سب اپنی ذات تک رہ جاتی ہے۔ دوسرا وہ ہر بات اور چیز پر اسلام کی مہر(Stamp) لگانا لازم خیال کرتے ہیں، چاہے اس مہر لگانے سے نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ یقین رکھیے بہت سے کام اصطلاحوں اور نعروں کے بغیر اچھے ہو جاتے ہیں۔

عورت کے معاملے میں ہمارے ہاں کچھ عرصے سے بہت زیادہ سختی کا رجحان سامنے آ رہا ہے۔ اس کے ردعمل کے طور پر عورتیں ہی ہر پابندی کو توڑ رہی ہیں۔ مرد اور اداروں کا ہم بلاوجہ قصور ڈھونڈنے بیٹھ جاتے ہیں۔ عورتیں زندگی کا حصہ ہیں۔ آپ ہر جگہ، ہر سڑک، کلاس، دفتر گھر میں الگ الگ ٹینٹ تان کر زندگی کو کیونکر آگے بڑھا سکتی ہیں۔ کسی عورت کی تصویر یا تحریر سے اسلام کیونکر خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ ایسا سوچنا کسی طور پر مناسب نہیں اصل مسائل کچھ اور ہیں۔ ان پر سوچنا چاہیے مثلاً آنے والے وقت میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ ان کی تعلیم بے شک اچھی ہو رہی ہے مگر تربیت کے معاملے میں والدین اور تعلیمی ادارے دونوں اپنی ذمہ داری محسوس ہی نہیں کرتے ذمہ داری بھی نہیں لیتے۔ ان بچیوں سے بات کرنے کا ڈھنگ مختلف اور ڈھکا چھپا ہوگا۔ مسجد کے امام اور کسی مصلح کی تقریر سے وہ پہلے ہی بے نیاز ہو چکی ہیں۔ ان کے دل سے بات کرنا ضروری ہے تاکہ اچھے برے کا وہ خود سوچیں۔ اپنے فیصلے اپنی ذمہ داری سے کریں۔ دوشیزہ اور کبوتر کی تصویر افسانہ اور کہانی کا علامتی سمبل ہے۔ اس چھوٹی سی تصویر سے عورت کی تکریم پر کیسے ضرب پڑ جائے گی؟ جب کہ تصویر بنانے والی بھی لڑکی ہے۔ اسے علامت کے طور پر بنایا گیا۔ تکریم کہاں سے درمیان میں آ گئی۔ یہی مثال پورے معاشرے پہ پھیلا دیں تو آپ آسانی سے سمجھ سکتی ہیں کہ ہمارے نیک لوگ کیونکر زندگی سے اور لوگوں سے متعلق فوراً آخری حد پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے کہنے کی اجازت دیں کہ ہماری اپنی اپنی رائے کسی جماعت، کمیونٹی، ملک یا مذہب کی نمائندہ نہیں بن سکتی۔ میری رائے تو یہ ہے کہ صورت حال دین اسلام سے روگردانی کے نتیجے میں پیدا نہیں ہو رہی بلکہ دین اسلام کی نمائندگی پہ خود کو متمکن کرنے والے خواتین و حضرات کی سختی، رویوں، طرز فکر و عمل اور اپنی اپنی آرا پر بے جا اصرار سے پیدا ہو رہی ہے۔ بظاہر ہمارے دانشوروں کو کسی کا ڈر نہیں۔

کسی جماعت کے لیبل کا مسئلہ بھی نہیں مگر اس بات پہ ضرور غور کیجیے کہ ہر بات لیبل لگا کر اسلامی اصطلاح کی سرخی دے کر کیوں کرنی اور کہنی چاہیے۔ اس کا ردعمل بڑا منفی ہوتا ہے۔ اب Keep the distance اسلامی ہے یا غیر اسلامی، حل یہی ہے۔ آپ سے کس نے کہا یہ کسی امریکی تھنک ٹینک نے کہا ہے ان کا تو یہ مسئلہ ہی نہیں۔ وہ اس پر کیوں وقت ضائع کریں گے۔ میری محنت آپ نے بے وجہ ان ''ظالموں'' کے کھاتے میں ڈال دی۔ صرف انگریزی کے دو لفظ لکھنے سے تو انھیں کریڈٹ نہیں دے دینا چاہیے۔ ایڈیٹر)

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اُکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی 3 بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بہ غور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے 2 سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو ''اردو ڈائجسٹ'' کے 6 شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ منشورات کی 2 خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتا: **مدیر ماھنامہ اُردو ڈائجسٹ** 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

ماہ نومبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

1۔(الف) 190،347 مربع کلومیٹر (ب) 27 مارچ 1948ء

2۔(الف) 16 دسمبر 1971ء (ب) سوویت یونین

3۔(الف) شیخ مجیب الرحمٰن (ب) 1975ء

درست جوابات دینے والوں کے نام

حمنہ شکیل قادری (ملتان) حمیمہ شکیل قادری (ملتان) صاحبزادہ حافظ عبدالمفتی شکیل (ملتان) ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل (ملتان) محمود منور (سرگودھا) غلام حسین قادری (حیدرآباد) مریم رحمان (اسلام آباد) رقیہ ہاشمی (اسلام آباد) وجیہہ رحمٰن (اسلام آباد) عبدالسنان ہاشمی (سلام آباد) ممتاز بیگم (چکوال) (عقیل احمد خان (کراچی) مسعود عالم، محفوظ بابو، قمر اشتیاق (پشاور) گلزار رحمان (لاہور) الطاف حسین (شیخوپورہ) عرفان اللہ (بنوں) شکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا) ولی حسین (حیدرآباد) محمد احمد (کراچی) آصف کریم (حیدرآباد) عبدالنعیم انصاری (حیدرآباد) حیدر سلیم (حیدرآباد) مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)

دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

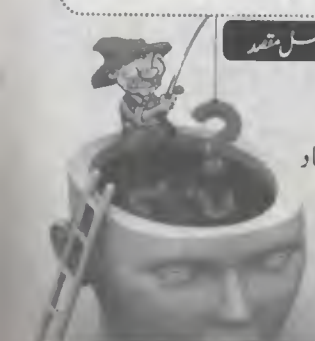

انچارج کوئز: غلام سجاد

یہی ہے قصہ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- (1) غلام حسین قادری کھاتہ چوک (حیدرآباد)
- (2) رقیہ ہاشمی 10/4-I-1 (اسلام آباد)

آپ کو 6 ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھی بھجوا سکتے ہیں

قصہ کوئز/1

پسنی سے ایک سو میل مغرب میں گوادر کی معروف بندرگاہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان ماہی گیری کی چھوٹی چھوٹی کئی بندرگاہیں جن میں شمال بندر، کپر بندر کا رولٹ اور سر بندر قابل ذکر ہیں۔ بلوچستان کے ساحل پر گوادر بھی سون میانی کی طرح تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں یہ بندرگاہ پہلے باہو کے جدگالوں اور پھر کلمتی ہوت بلوچوں کے قبضے میں تھی میر جمل جیند اس تمام ساحل کا حکمران تھا۔ گوادر کے شمال میں تقریباً چالیس میل دور دھڑام کا بلند و بالا پہاڑ ہے۔ مغربی پہاڑی پر قدیم زمانے کا ایک بند اب تک موجود ہے جس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے۔ یہ بند تراشے ہوئے پتھروں سے باندھا گیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اسے پرتگالیوں نے تعمیر کیا تھا جو گوادر پر قابض تھے۔ بعد میں جمل جیند نے انھیں شکست دے کر گوادر کو ان سے واپس لے لیا اور اس لڑائی کی یادگار دو پرتگالی توپیں 1938ء تک یہاں موجود تھیں۔

1: گوادر قانونی طور پر پاکستان کا حصہ کب بنا؟

2: گوادر پورٹ ہم نے کس ہمسایہ ملک سے خریدا؟

قصہ کوئز/2

25 مارچ 1971ء کو صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان نے شیخ مجیب الرحمن کو گرفتار کر لیا۔ انھیں مغربی پاکستان لایا گیا اور فوج کو امن و امان اور نظم و نسق قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ عوامی لیگ کے رضا کار دستے بھارت کی امداد سے ''مکتی باہنی'' کے نام سے ایک چھاپہ مار فوج کی شکل میں پورے صوبے میں پھیل گئے۔

اگست 1971ء تک پاکستانی فوج نے حالات پر قابو پا لیا مگر مکتی باہنی اور دیگر باغی عناصر بھارت کی پناہ میں چلے گئے جسے بہانہ بنا کر 21 نومبر 1971ء کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ پاکستانی فوجوں کی کمک اور سپلائی بند ہو گئی۔ بیرونی اور اندرونی دشمنوں کی وجہ سے 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ میں پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ بھارتی فوج ڈھاکہ میں داخل ہو گئی اور مشرقی پاکستان کا صوبہ پاکستان سے کٹ گیا۔

16 دسمبر 1971ء کو بھارت نے بنگلہ دیش حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ 20 دسمبر کو پاکستان میں اقتدار آغا یحییٰ خان سے لے کر ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے شیخ مجیب الرحمن کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ جنوری 1972ء میں شیخ صاحب بنگلہ دیش کے پہلے صدر بنے۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک سوویت یونین تھا جس نے جنوری 1972ء ہی میں اسے تسلیم کر لیا۔ آئندہ ماہ فروری میں برطانیہ نے تسلیم کیا اور بنگلہ دیش اپریل 1972ء میں دولت مشترکہ کا رکن بن گیا۔ پاکستان نے اس وقت تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا جب تک شیخ مجیب الرحمن نے بھارت پر دباؤ ڈالے رکھا کہ وہ پاکستان کے ترانوے ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کر دے۔

1: تقسیم بنگال اور شیخ بنگال کب ہوئی تھی؟

2: تقسیم بنگال کی مخالفت کس نے کی؟

قصہ کوئز/3

30 مئی 1981ء کو ایک اور فوجی انقلاب کے ذریعے جنرل ضیاء الرحمن کو چٹاگانگ میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ اُن کے بعد جسٹس عبدالستار نئے صدر بنے۔ انھوں نے انتخابات منعقد کرائے اور بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔

مارچ 1982ء میں جنرل ارشاد حسین نے فوجی انقلاب کے ذریعے ان کی حکومت کا بھی تختہ الٹ دیا۔ مارشل لا نافذ کر دیا اور خود صدر بن گئے۔

1988ء میں جنرل ارشاد نے بنگلہ دیش کو ''اسلامی جمہوریہ'' قرار دیا۔ ایک اور انقلاب کے ذریعے انھیں بدعنوانیوں کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ مقدمہ چلا۔ سزایاب ہوئے۔ نئے انتخابات میں جنرل ضیاء الرحمن کی پارٹی اکثریت سے جیت گئی اور ان کی بیوہ خالدہ ضیاء وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ 1995ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ نے اکثریت حاصل کی اور شیخ مجیب الرحمن کی بیٹی حسینہ واجد وزیراعظم منتخب ہوئیں۔

2: جنرل ضیاالرحمن کو کب قتل کیا گیا؟

2: بنگلہ دیش کی کرنسی کونسی ہے؟

نوٹ! تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے وگرنہ TCS پہنچ نہیں پاتا اور گزشتہ کئی ماہ سے ہمیں TCS واپس مل رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

انعامات کے لیے تعاون

منشورات

خوبصورت اور معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور

042-35434909

042-35425356

چمنِ خیال

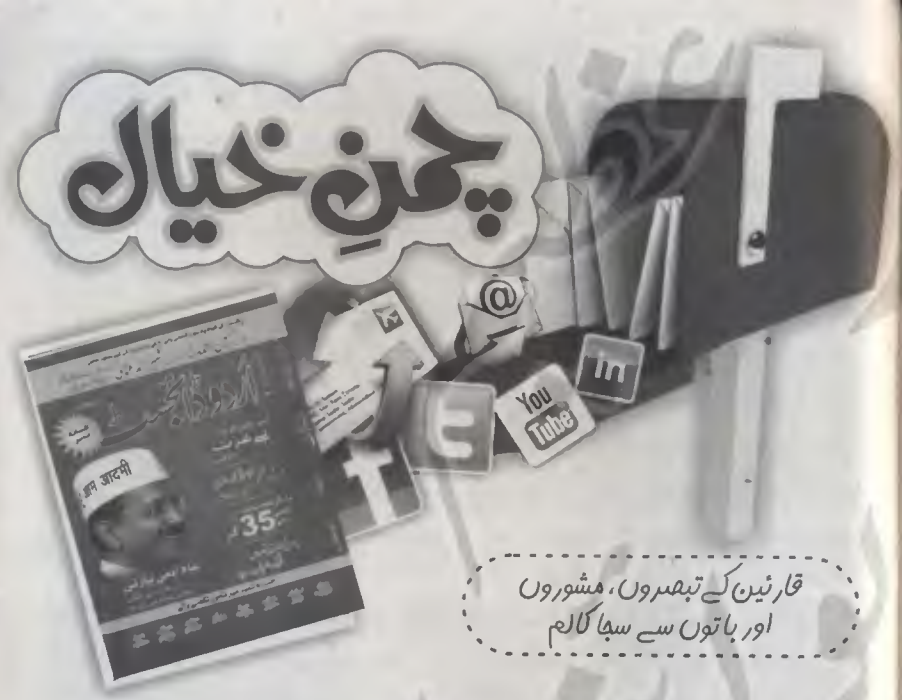

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

مشورہ دینے کی عادت

کچھ لوگوں کو خواہ مخواہ مشورہ دینے کی عادت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے میں بھی اُنھی میں شامل ہوں۔ تو ایک تجویز پیشِ خدمت ہے، گر قبول اُفتد! اُردو زبان کی ترویج اور ادب کے فروغ کے لیے اُردو ڈائجسٹ میں لکھنے والوں کی ''اُردو ڈائجسٹ رائٹرز کلب'' (نام کچھ بھی ہوسکتا ہے) بنائی جائے جس کے اجلاس اُردو ڈائجسٹ کے زیرِ اہتمام ہوا کریں، جن میں ادب اور دیگر موضوعات پر مضامین پڑھے جائیں اور اُردو ڈائجسٹ میں چھپنے والے مضامین پر بحث مباحثہ بھی ہوا کرے۔ اس طرح نئے لکھنے والوں کو سیکھنے کا موقع ملے گا اور اُردو ڈائجسٹ کا معیار مزید بہتر ہو سکے گا۔ (خالد سعید اختر۔ لاہور)

(ہم تو اس اچھی تجویز پر پہلے ہی سے عمل پیرا ہیں۔ آئندہ کوشش کریں گے کہ اس اجلاس کی کارروائی بھی اُردو ڈائجسٹ کی زینت بنتی رہے۔ 10 دسمبر بروز منگل سہ پہر 3 بجے آپ بھی اپنی تازہ تحریر کے ساتھ دفتر تشریف لا سکتے ہیں)

دل کے تار ہلا دیے

اُردو ڈائجسٹ خوب سے خوب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس رسالے کی اضافی خوبی خاص طور پر میرے لیے یہ ہے کہ ابھی مکمل پڑھا بھی نہیں جاتا اور نئے مہینے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ مواد متنوع ہے۔ اب شمارے پر تبصرہ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ پورا پڑھا نہیں مگر ''دردِ دل پر دستک'' کی بازگشت ہفتوں تک سنائی دیتی ہے۔ مصر و فلسطین کے سفرنامے کی تعریف نہ کرنا زیادتی سے زیادہ شاید خیانت ہوگی۔ کہانی نمبر بلاشبہ قابلِ تعریف

ہے۔ بیٹ مین کی کہانی..... نیلوفر اقبال نے کیا لکھا ہے دل کے تار ہلا دیے ہیں۔

کوئز کے دونوں سلسلے بہت پسند ہیں۔ اس کے علاوہ نوشین ناز کا کالم صحت نہیں وزن کم کیجیے اور کتابوں کا تعارف بھی پسندیدہ ہے۔ (نبیلہ اقبال۔ راولپنڈی)

ٹیپ کا اصل بند

نومبر کے شمارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں میرا مضمون شائع کرنے کا بہت شکریہ۔ تاہم مضمون میں ایک جگہ تاریخی غلطی رہ گئی ہے جس کی تصحیح کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

مضمون میں غلطی سے کہیں لکھا گیا ہے کہ آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھارت کے صدر مقرر کیے گئے تھے۔ یہ درست نہیں ہے۔ مجھے اصل میں کانگریس کا صدر لکھنا چاہیے تھا۔ راقم کو دراصل ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا آزاد کی شخصیتوں کے درمیان غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں بسا ہوا تھا کہ بھارت میں ایک اہم مسلم شخصیت مملکت کی صدر بنی تھی۔ اسی گڈمڈ میں متعلقہ مضمون میں غلطی سے بھارت کی صدارت میں راقم نے مولانا آزاد کا نام ڈال دیا۔ بعد میں تحقیق پر درست صورتِ حال معلوم ہوئی اور پتا لگا کہ وہ تاریخی شخصیت ڈاکٹر ذاکر حسین کی تھی جو اس مملکت کے صدر بنے تھے۔ یہی وہ ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں جن کے بھائی ڈاکٹر محمود حسین نے بھارت میں قیام کے بجائے پاکستان منتقل ہونا پسند کیا تھا اور جنھیں بعد میں کراچی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی مقرر کیا گیا تھا۔ جب کہ ادھر مولانا آزاد کو آزادی کے بعد بھارت کا وفاقی وزیر تعلیم بنایا گیا تھا۔ راقم اس سہو پر قارئین سے معذرت خواہ ہے۔

تاہم اصل بات جو میں لوگوں کے ذہن نشین کروانا چاہتا تھا، وہ یہ تھی کہ اگر اس وقت مولانا آزاد قائداعظم کا ساتھ دیتے تو ان کی وفات کے بعد عمدہ، دیانت دار، اور دینی قیادت کا جو خلا ملک میں پیدا ہوا تھا، وہ مولانا ابوالکلام کی قد آور شخصیت سے یہاں پورا ہوجاتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا آزاد ایک بڑے اسٹیٹسمین، دورِ جدید کے تعلیم یافتہ اور اہمیت کے حامل فرد تھے۔ اس لیے قائداعظم کا دست راست بننے سے انھیں تب کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یوں پاکستان کو بالآخر وہ منزل ابتدا ہی میں حاصل ہوجاتی جس کے لیے ہندو پاک کے مسلمانوں نے بھرپور تحریک چلائی تھی اور جو بدقسمتی سے آج تک کہیں کھوئی ہوئی ہے۔ مضمون میں ٹیپ کا اصل بند یہی ہے۔ (رضی الدین۔ کراچی)

آپا تاج کبھی نہیں بھولے گی

ویسے تو ڈائجسٹ ہمیشہ ہی لاجواب ہوتا ہے۔ مگر مجھے اکتوبر کے شمارے میں ''کوئی قبرستان کی تعریف یونہی نہیں کرتا'' بہت پسند آئی۔ خاص طور پر یہ فقرہ ''Keep the Distance'' بہت پسند آیا یہ ایسا فقرہ ہے جس نے بہت کچھ سکھایا پر آپا تاج ایک ایسی کہانی تھی جو اکتوبر گزرنے کے بعد بھی ذہن پہ نقش ہے یہ کبھی نہیں بھولے گی۔ نومبر میں اپنے اندر کی پیٹیوں سے گلے سڑے آم نکالنے کا عمل شروع تو کیا ہے یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ بے خبری نہایت عمدہ تحریر تھی ہر دفعہ پڑھنے سے لگتا ہے کہ پہلی بار پڑھ رہے

زبان و بیان سے بے خبری کا مزید شاخسانہ

نومبر کے شمارے میں ''جوشِ عقیدت کی بے ادبی یا زبان و بیان سے بے خبری'' کے عنوان سے جناب ڈاکٹر طاہر مسعود صدر شعبہ ابلاغیات کراچی یونیورسٹی نے میاں عبدالشکور سابق صدر سنڈیکیٹ یونین کی بے ادبی، زبان و بیان کی بے خبری پر جو طویل تبصرہ فرمایا ہے، وہ تو ان ''صدورین'' کا باہمی مُناقشہ ہے۔ ہمیں تو حیرانی اس بات پہ ہے کہ جناب صدر شعبہ ابلاغیات نے اپنے ممدوح مولانا ابوالکلام آزاد کا دفاع فرماتے ہوئے جس بے خبری کا ثبوت دیا ہے اس پر جی چاہتا ہے کہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغیات کو سرے سے ختم کردیا جائے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود رقم طراز ہیں۔ اب آیئے مولانا ابوالکلام آزاد کی شہرہ آفاق کتاب کی طرف۔ یہ کتاب (غبارِ خاطر) اصلاً مولانا آزاد کے اُردو خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زندان سے حکیم اجمل خان کو تحریر کیے تھے۔'' کیا بات ہے صدر شعبہ ابلاغیات کی باخبری کی؟

محترم ڈاکٹر صاحب! زبان و بیان کے حوالے سے تو یہ اصلاً مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اصلاً کے بجائے نقلاً یہ کس چیز کا مجموعہ ہونا چاہیے تھا۔

اجمل خان صاحب مولانا آزاد کے سیکریٹری تھے۔ یہ تمام خطوط نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کو تحریر کیے گئے۔ کسی حکیم اجمل خان صاحب کو نہیں۔ غبارِ خاطر کے مقدمہ میں از محمد اجمل خان صاحب تفصیل ملاحظہ فرمادیں۔

''اس مجموعے میں جتنے مکتوب ہیں وہ تمام تر نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی اور رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے گئے ہیں۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستوں سے خط کتابت کی اجازت نہ تھی، مولانا کی کوئی تحریر باہر نہیں جاسکتی تھی۔ اس لیے یہ مکاتیب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک فائل میں جمع ہوتے رہے۔ 5، جون 1945ء کو جب مولانا رہا ہوئے تو ان مکاتیب کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کی راہ باز ہوئی۔''

جناب ایڈیٹر! ایک نظر بڑے لوگوں کے تحریر کردہ مضامین پر ڈال لیا کریں۔ (عبدالشکور اختر۔ جہانیاں، خانیوال)

(مضمون پر تو ہم نے گہری نظر ڈالی تھی۔ ہمیں تو مرزا غالب کے خطوط والی دلیل کمزور لگی تھی اور اس کمزوری پر اعتراض ضرور تھا مگر آپ نے تو نقشہ ہی بدل دیا۔ اب ایمانداری کی بات یہ ہے کہ چونکہ کتاب سامنے نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے دلائل کی تائید یا تردید کی فوری پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔ براہِ کرم اسے وقتی کوتاہی جانیے کوتاہ بینی کا الزام نہ دے دیجیے گا۔)

ہیں۔ ایک ایک تحریر کا نام لینا کہ فلاں بہت پسند آئی فلاں بہت پسند آئی ذرا مشکل ہے کیونکہ اس سے یہ آدھی ملاقات طویل ہوجائے گی تو میں اتنا کہوں گی کہ شکر خورے کو شکر مل جائے تو اور کچھ نہیں چاہیے ہوتا۔ اُردو ڈائجسٹ شکر ہے اور میں شکر خوری۔

اُردو ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کے لیے بہت سی دعائیں۔ (ثروت اقبال راؤ۔ جامعہ پنجاب لاہور)

تعلیمی نظریات میں تبدیلی کی ضرورت

سر! آپ کا اُردو ڈائجسٹ بہت اعلیٰ اور سنجیدہ تعلیمی حلقوں میں بھی مقبول ہے۔ میں آپ کے اُردو ڈائجسٹ کے توسط سے اپنے معاشرے کے اہم مسئلے پر روشنی ڈالنا چاہتی ہوں۔ یہ اہم اور سنگین مسئلہ ''مسئلہ تعلیم'' ہے۔ ہمارا نظامِ تعلیم مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے اور اس کی وجوہات بالکل واضح اور غیر مبہم ہیں۔

ہمارے ملک میں ہر آدمی نظامِ تعلیم میں نقص تو نکالتا ہے لیکن اس کی تصحیح نہیں کرتا۔ راقم الحروف نے اس سلسلے میں، نئے تعلیمی تصورات پر تحقیقی کام کی ایک چھوٹی سی کاوش کی ہے۔ کچھ روز قبل میرے ماموں ایوب منظر ہماری طرف آئے۔ جب میں نے اپنا کام دکھایا تو کہنے لگے کہ کام اس طرح بند کیوں رکھا ہے۔ تھوڑی سی مزید کاوش سے دوسروں تک ان تعلیمی نظریات کو پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اُردو ڈائجسٹ سے رابطہ کروں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ براہِ کرم اُردو ڈائجسٹ میں اس کام کو کم از کم ہفتہ وار اقساط کی شکل میں جگہ دیں۔ (آمنہ صبا۔ ضلع شیخوپورہ)

(آمنہ بی بی! بہتر ہوتا اپنے تعلیمی نظریات ہمیں بھجوا دیتیں تاکہ ہم بھی انھیں دیکھ لیتے۔ ایک گزارش ضرور کرنی ہے کہ آپ کے نظریات جتنے بھی اچھے ہوں ہم ان کو ہفتہ وار نہیں چھاپ سکیں گے۔ یہ تکنیکی طور پر بھی ممکن نہیں ہوگا۔ کیونکہ ابھی تک اُردو ڈائجسٹ ماہانہ بنیادوں ہی پر شائع ہو رہا ہے۔)

تاریخی مکالمہ

کیا تبلیغ کا راستہ بند ہوگیا

نومبر کے شمارے میں چند تحریریں چونکا دینے والی ہیں۔ لیکن بعض تو ذہن کی ڈھیلی چولوں کو کس دینے کا اثر رکھتی ہیں۔ تاہم سب سے اہم تحریر ''ایک تاریخی مکالمہ'' ثابت ہوئی۔

پاکستان کے قیام اور مخالفت پر مبنی اس ''ایک تاریخی مکالمہ'' میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تقسیم ہند کی مخالفت اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی حمایت..... دونوں نظریات آج ڈانواں ڈول ہیں۔ پاکستان جس خطرناک مرحلے پر آپہنچا ہے تو لازماً مولانا آزاد کی پیشین گوئیاں یاد آتی ہیں اور مولانا عثمانی کا پاکستان بنانے کا بلاشبہ مثبت رویہ لرز رہا ہے۔ نہ اول الذکر ہندوؤں کی حمایت کر کے مسلمانانِ ہند کو فائدہ پہنچا سکے کہ آج بھی مسلمانوں کی زندگی وہاں دوزخ بنی ہوئی ہے اور پاکستان قائم ہونے سے یہاں تو مسلمان اکثریت کی حالت بہرحال سُدھر گئی۔ البتہ قائداعظم کی وفات کے بعد کرپٹ، لالچی اور مفاد پرست اعلیٰ طبقے نے جو ملک کو لوٹنے کا سلسلہ شروع کیا تھا آج وہ انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ آدھا ملک گنوا کے سیاسی راہنماؤں نے مولانا آزاد کی ایک اہم پیشین گوئی کو پورا کر دیا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ تقسیم ہند سے قبل لاہور کے مشہور کروڑ پتی کاروباری ہندو لالہ ہرکشن لعل کے صاحبزادے کنہیا لال گابا بیرسٹرایٹ لا نے قبولِ اسلام کر کے اپنا نام خالد لطیف گابا اختیار کیا، وہ بھی مولانا مدنی اور مولانا آزاد کی طرح تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ وہ تقسیم ہند کے بعد مسلمان ہونے کے باوجود ہندوستان چلے گئے تھے۔ ''PROPHET OF THE DESERT'' (پیغمبر صحرا) جیسی کلاسیک کتاب لکھنے والے گابا نے پاکستان کی تحریک کی مخالفت میں بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ ان کا استدلال تھا کہ:

''میرے نزدیک پاکستان کے قیام سے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کا دروازہ بند ہوگیا ہے حالانکہ اسلام کے لیے اس ملک میں شاندار امکانات موجود تھے۔''

(عبدالقیوم۔ اٹک)

(ہم بھی کیسی کیسی لایعنی بحثوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ بھلے لوگ نعمتوں پر شکر کرتے ہیں۔ ان کی حفاظت کرتے ہیں تاکہ تحدیثِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ملک کی قدر نہیں کی تو 1971ء میں اللہ نے جھٹکا دیا تھا۔ ہم جھٹکوں کا ہی کیوں انتظار کرتے ہیں۔ ویسے تبلیغ کا راستہ کسی ایک مصنف کے لکھنے سے بند نہیں ہوجاتا۔ تبلیغ تو وہاں بھی ایک دن نہیں

ڈاکٹر طاہر مسعود کے نام

استادِ محترم! شکر گزار ہوں آپ نے ایک طویل خط کے ذریعے ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی۔ انشاء اللہ عمر بھر اسے اپنے پلّے باندھے رکھوں گا۔ مشاہیر کا اس طرح کا تقابل کہ وہ لوگوں کی نظر میں "چھوٹے بڑے لگنے لگیں" یقیناً ایک لغزش تھی۔ میں ان تمام روحوں سے بھی معذرت خواہ ہوں جو اس دنیا سے جا چکی ہیں۔

میرا مضمون چھپنے پر جہاں بہت سارے تحسین کے فون اور خط وصول ہوئے وہاں توجہ دلاؤ کے کئی فون بھی آئے۔ سب سے پہلے محترم عبدالحفیظ احمد ڈائریکٹر اسلامک پبلیکیشنز نے اس پہلو پہ توجہ دلائی پھر محترم فرید احمد پراچہ ڈپٹی سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی کا فون آیا کہ "بہت اچھے مضمون میں یہ ٹکڑا دل کو کھٹکتا ہے۔" میں آپ سمیت ان سب حضرات کا بھی شکر گزار ہوں۔

استادِ محترم ایک چھوٹی سی توجہ میں بھی دلانا چاہوں گا۔ میری ذاتی لغزش اور سہو کو پوری جماعت اسلامی اور اس کے مزاج سے آپ نے کیسے جوڑ دیا۔ مجھے میری غلطی پر پہلے پہل توجہ تو جماعتی دوستوں ہی نے دلائی تھی۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ آپ میرے اعمال کو صرف میرے ہی کھاتے میں رہنے دیتے اور جماعت کے مزاج پر سُوءِ ظن نہ کرتے۔

(محمد عبدالشکور۔ وزڈم ہاؤس، کھاریاں)

رکی، اگر رُکی ہوتی تو مسلمانوں کی تعداد بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان میں مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے بچوں کے علاوہ بھی بہت بڑھی ہے۔ (پاکستان 18 کروڑ، بنگلہ دیش 25 کروڑ اور بھارت 17 کروڑ) ایک بات پر تو ضرور غور کرنا چاہیے کہ کیا واقعی ہمارے ہاں خرابی کی ساری وجہ صرف ''لالچی، کرپٹ اور اعلیٰ طبقہ ہی ہے'' ہم کروڑوں جو اس طبقے میں شامل نہیں کیا واقعی دودھ کے دھلے ہیں اور ملک کی ترقی اور تنزلی میں ہمارا کوئی کردار نہیں ہے اور دوسروں پر الزام کی چادریں ڈال کر ہم ہر ذمہ داری سے بری الذمہ ہوجاتے ہیں۔ ساری خرابیوں کے باوجود 70 سالوں میں ملک کے ایک ایک فرد اور خاندان کے دن بدلے ہیں۔ نعمتوں، رزق، تعلیم، رہن سہن ہر چیز بدل گئی ہے۔ کسی اور کو ہی کیوں اپنے اپنے خاندان کے دادا، نانا اور پھر ان کی اولاد کو دیکھ لیں۔ پوتوں تک آتے آتے نعمتیں کثیر

اور شکر گزاری قبیل ہوگئی ہے۔)

زنانہ نام سے پرہیز کا حکم

گزارش ہے بہت ہی مفید سلسلے شروع کر کے ہمارے ڈائجسٹ کو جدت و ندرت کے راستوں سے آشنا کر دیا۔ اختراعی ادارت نے قارئین کی غنودگی کو ختم کر کے ان میں تروتازگی اور بیداری کی لہر دوڑا دی ہے۔ ثابت ہوا کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے بعض دفعہ پانی کے بہت بڑے تالاب میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ گزشتہ دو اڑھائی سالوں سے اُردو ڈائجسٹ میں جو کشش پیدا ہوئی ہے وہ مخفی نہیں۔ نومبر کے شمارے میں صفحہ 128 پر ''اشعار میں دلچسپ عنوان سوچئے اور انعام پائیے'' کے تحت دونوں تصاویر کے لیے بالترتیب یہ اشعار لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ زنانہ تصویر کے نیچے۔

؎ میری آنکھوں کے دریچوں میں اُجلا اُجلا
ترا چہرہ ہے، کہ مہتاب ٹھہرا ٹھہرا

(شیرزادہ پرنسپل گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری اسکول سوات خیبر پختونخوا)

(شیرزادہ صاحب! یہ زیادتی ہے مردانہ تصویر کا نام لکھ دیا۔ مشہور و معروف مصنفہ بشریٰ رحمان کی تصویر کے نیچے زنانہ لکھ کر بھیجا ہے۔ بشریٰ آپا نے پڑھ لیا تو وہ ایسی خبر لیں گی کہ آپ بھی یاد رکھیں گے۔ بے شک غصِ بصر کا حکم ہے مگر زنانہ نام لکھنے سے پرہیز کا کوئی حکم ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا)

دشمنیوں کا نیا سلسلہ

اَب بلدیاتی انتخابات ہونے والے ہیں۔ خدا خدا کر کے ابھی تک جنرل الیکشن میں پیدا ہونے والی باہم خاندانی کی ناراضیاں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اَب بلدیاتی الیکشن ہو رہے ہیں۔ شہروں کا تو پتا نہیں، شہروں کا تو پتا نہیں، خاص کر دیہاتوں میں دشمنیوں کا نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ حکومت زکوٰۃ کمیٹیوں کے الیکشن اس کے بعد کرائے گی جس میں اکثر مسجدوں کے تقدس کو پامال کیا جاتا ہے۔ اس میں پرہیزگار لوگوں کو سامنے لانا چاہیے۔ تاکہ کام دیانت داری سے ہوسکیں۔

(محمد منور خان۔ کوٹ سنبلا نوالہ ڈاک خانہ میانی)

پرانے شمارہ کے لیے کیا کروں؟

میں میٹرک کا طالب علم ہوں اور اُردو ڈائجسٹ کا دو سال سے مستقل قاری ہوں۔ جب میں نے پہلی دفعہ اُردو ڈائجسٹ پڑھا تو مجھے اتنا پسند آیا کہ میں نے اُردو ڈائجسٹ کے پرانے 15 شمارے ڈیڑھ گھنٹے کی محنت سے پرانے رسالوں کی دُکان سے ڈھونڈ نکالے اور پھر ایسا چسکا لگا، کہ اب ہر ماہ باقاعدگی سے رسالہ پڑھتا ہوں۔ مجھے تاریخی اور سائنسی مضامین اور کہانیاں بہت پسند ہیں۔ عُمدہ کہانیاں البتہ پڑھنے کو خوب مل جاتی ہیں۔ میری عمر اٹھارہ سال سے کم ہے کیا ''میں بوجھو تو جانیں'' میں حصہ لے سکتا ہوں۔ اگر پرانے شمارے بذریعہ ڈاک منگوانے ہوں تو کیا میں منگوا سکتا ہوں۔ پرانے رسالے کی فی پرچہ قیمت کتنی ہوگی؟

(محمد احتشام کاظم۔ شیخوپورہ)

(آپ شعبہ سرکولیشن میں فون کر کے تفصیلات پوچھ لیجیے۔ کوئز میں حصہ شوق سے لے سکتے ہیں)

○○○

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: غلام سجاد

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر نوجوانوں والی ہی ہے نا!)

ماہ نومبر میں دیے گئے اسلامی کوئز کے درست جوابات

اسلامی کوئز 1۔ (الف) ملتزم (ب) بیت ایل

اسلامی کوئز 2۔ (الف) انکار کرنا (ب) اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک کرنا

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ حمنہ شکیل قادری (ملتان) 2۔ مرزا اسفار بیگ (حیدرآباد) 3۔ محمد منہاس (ڈیرہ اسماعیل خان) 4۔ رانا محمد آصف (فیصل آباد)

درست جوابات دینے والوں کے نام

تلمیذ الرحمٰن (فیصل آباد) صاحبزادہ حافظ عبدالمغنی شکیل (ملتان) حمنہ شکیل مرشد قادری (ملتان) حمینہ شکیل مرشد قادری (ملتان) محسن حبیب (فیصل آباد) مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد) مرزا اسفار بیگ (حیدرآباد) ولی حسین (حیدرآباد) انشراح ریحان عقیل (کراچی) محمد منہاس (ڈیرہ اسماعیل خان) محمد شکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا) رانا محمد آصف (فیصل آباد) احمد رضا (فیصل آباد)

اسلامی کوئز 1

آنحضور ﷺ پندرہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرے کے لیے مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے۔ عمرے کا احرام باندھا ہوا تھا اور قربانی کے جانور ساتھ تھے۔ مصالحانہ نیت تھی اس لیے ہتھیار ساتھ نہیں لائے تھے۔ حالات معلوم کرنے کے لیے جاسوس بھیجا گیا جس نے آکر بتایا کہ قریش کو مسلمانوں کی آمد کا پتا ہے اور وہ جنگ کے لیے اپنے حلیفوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حدیبیہ کے مقام پر قریش نے مسلمانوں کا راستہ روک لیا۔ گفت و شنید شروع ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو سفیر اور معاہدہ طے کے لیے مختار بنا کر مکہ بھیجا۔ قریش نے انھیں نظر بند کر دیا۔ بعد میں افواہ اڑی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔

(الف) کس معاہدے کا ذکر ہے؟ (ب) یہ معاہدہ آپ ﷺ نے کب کیا؟

اسلامی کوئز 2

فہم قرآن کے لیے حدیث کی ضرورت ہے۔ ہم اس زبان کے محتاج ہیں جس میں قرآن نازل ہوا۔ اسی طرح قرآن کو سمجھنے کے لیے حدیث کے محتاج ہیں۔ مثلاً قرآن ''اقامت الصلوٰۃ'' کا حکم دے کر خاموش ہو جاتا ہے اور یہ بات قرآن نہیں بتاتا بلکہ سنت بتاتی ہے کہ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے اور اس کی اقامت کا کیا مطلب ہے؟ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا ''صلوا کما رأیتمونی'' (نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) لوگوں نے جب تک آپ ﷺ کو یہ عمل کرتے ہوئے دیکھ نہ لیا اس وقت تک اقامت صلوٰۃ کا مطلب سمجھ میں نہ آسکا۔ سنت ہی نے مساجد کی تعمیر، پنجوقتہ اذان و نماز باجماعت کا طریقہ، نماز کے اوقات، نماز کی ہیئت، اس کی رکعتیں اور جمعہ عیدین کی مخصوص نمازیں اور ان کی عملی صورت اور بہت سی تفاصیل بتائی ہیں۔

(الف) حدیث کی کتنی اقسام ہیں؟ (ب) صحاح ستہ میں سے کسی بھی 2 احادیث کتب کا نام بتائیں؟

انعامات کے لیے تعاون
اسلامک پبلی کیشنز
منصورہ ملتان روڈ لاہور
تحریک اسلامی سے متعلق اور سید مولانا مودودیؒ کا تحریر کردہ لٹریچر ہماری پہلی ترجیح ہے۔

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے لازماً لکھیں۔ اپنا موبائل نمبر یا پی سی او نمبر بھی لکھیں۔ (مدیر اُردو ڈائجسٹ لاہور)

درِ دل پہ دستک

اختر عباس
urdudigest.pk
akhterabas@ymail.com

ٹشو جیسے بے وقعت رشتے

محبت ایسی ہی ہوتی ہے!

ذہن پر بہت زور بھی دوں تو بیتے بیس تیس سالوں میں شاید ہی کوئی موقع ایسا آیا ہو کہ میں نے کسی دوست سے گاڑی اُدھار مانگی ہو۔ جب جب گاڑی ورکشاپ گئی، بلا تامل رکشے سے کام چلا لیا۔ وقت اور سہولت دیکھی تو چپ چاپ بغیر تکلیف اور تکلف کے ویگن میں بھی بیٹھ گیا۔ اب تو اور آسانی ہوگئی ہے کہیں دور جانا ہو تو رینٹ اے کار والے کو فون کردیا اور اطمینان سے سفر کرلیا۔ شاید میری یہ بے نیازی اور خودداری وجہ رہی ہو یا دوسروں کے ساتھ تعلقات میں ایک غیر مرئی فاصلہ اس کا باعث بنا ہو، بہرحال وجہ کوئی بھی رہی ہو یہ طے ہے کہ سالوں سے کسی سے گاڑی نہیں مانگی۔ یوں یہی معمول میری زندگی کا حصہ بنا میرے ساتھ ساتھ جیتا رہا ہے۔ چند ماہ ہوئے ایک روز دوپہر کے وقفے میں آفس کے باہر گومگو کی کیفیت میں کھڑا تھا۔ اصل میں ایک کتاب کی ضرورت تھی جو گھر پر موجود تھی۔ مگر گاڑی ڈرائیو کرنے پر دل آمادہ نہیں تھا۔ اتنے میں ڈیزائنر آیت اللہ کی سواری باد بہاری آکر رکی، اس سے موٹر سائیکل لیا اور گھر روانہ ہوگیا۔ اس کی بریک کی خرابی کے باعث وہاں تک کس مشکل سے پہنچا یہ ایک الگ داستان ہے۔ واپسی پر پہلے بریک ٹھیک کروائی پھر اس کا سیٹ کور ڈلوایا، پھٹے ہوئے کور سے فوم تک نکل کر گر چکا تھا۔ ایک انڈیکیٹر بھی ٹوٹا ہوا تھا، بیک مرر بھی نجانے کب کا غائب تھا۔ تینوں چیزیں لگوا کر دفتر پہنچا اور واچ مین سے کہا اسے سٹینڈ پر کھڑی کردے۔ مجھے تو یہ سب کرکے اچھا لگا تھا۔ دل میں کہیں یہ خیال بھی تھا کہ آیت اللہ کو بھی اچھا لگے گا اور وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کبھی کسی کو موٹر سائیکل دینے سے ایسے فوائد بھی ہوسکتے ہیں۔ شام تک کام میں ایسی مصروفیت رہی کہ ہم بات بھی نہ کرسکے۔ میں دفتر سے نکل چکا تھا جب آیت کا فون آیا کہ سر سٹینڈ پر میری موٹر سائیکل نہیں ہے۔ بتایا کہ

فلاں جگہ کھڑی کروائی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں پہنچا اور پھر گھبراہٹ سے بولا سر! یہاں کوئی اور کھڑی ہے۔ میرے والی نہیں ہے۔ پھر وہ گڑبڑایا، ''سر نمبر تو میرے والا ہے مگر حالت میرے والی نہیں ہے۔'' اگلے لمحے ہم دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس دیے اور فون بند ہوگیا۔

انسانی تعلقات میں محبت اور مروت کا جتنا مقام ہے، اندیشوں اور بُرے مشاہدات کی سچائی بھی ان سے کم نہیں، میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جو کسی کی گاڑی لے گئے۔ بے دردی سے استعمال کی، لاپرواہی کسی حادثے کا باعث بنی تو گاڑی وہیں چھوڑ کر فون پر اطلاع کرنے کو کافی سمجھا کہ فلاں جگہ کھڑی ہے، لے لیجیے۔ کبھی کوئی صاحب بھری ٹینکی کے ساتھ، بس چند منٹ میں آیا، کہہ کر لے گئے اور ان کی واپسی منہ لٹکائے تب ہوئی جب دن ہی بیت چکا ہوتا۔ کوفت اور بیزاری بھرا بامروت مالک اپنے بچوں کو لے کر نکلا تو کچھ ہی دور اندھیرے میں جاکر گاڑی چلنے سے انکاری ہوگئی۔ فون کرکے مستری بلایا۔ کھلوا کر دیکھا، کوئی بات سمجھ نہ آئی آخر میں حادثاتی طور پر علم ہوا کہ گاڑی چلے کیسے اس میں تو ایک قطرہ بھی پٹرول نہیں۔ انڈی کیٹر ٹوٹنے، بمپر کا ستیاناس ہونے اور کسی اور حصے کا سوا ستیاناس کرنے کی شکایات عام طور پر کانوں میں پڑتی رہی ہیں۔ ایک صاحب کی ہنڈا واپس آئی تو مالک نے بیک سکرین پر بڑی سی چادر پڑی دیکھی۔ احتیاط اچھی لگی کہ شکر ہے، مانگنے والے نے اپنی گاڑی سمجھ کر استعمال کی۔ کچھ دیر بعد جب خود گاڑی میں بیٹھے تو پتا چلا کہ وہاں تو بیک سکرین کا پورا شیشہ ہی نہیں ہے۔ گھبرا کر فون کا نمبر ڈائل کیا۔ سپاٹ سا جواب ملا یار کسی بچے نے پتھر مار کر توڑ دیا تھا۔ پتا ہی نہیں چلا کون نامعقول تھا۔ کیا کریں لوگوں کے بچے ایسے ہی غیر ذمہ دار ہیں۔

شادی بیاہ پر مہمانوں کو لانے کے لیے جانے والی گاڑیاں اکثر پھٹی سیٹوں، خالی ٹینکیوں، گندے داغوں اور کچرے سے بھری ملتی رہی ہیں۔ کم ہی کسی کو ایسا مانگنے والا ملا ہوگا جو گاڑی واش کرکے، گیس یا پٹرول ڈلوا کر طریقے، سلیقے اور قرینے کا مظاہرہ کرکے واپسی کا ''مرتکب'' ہوا ہو۔ یہ مزاج کا نہیں ذہنی ساخت اور ذاتی اقدار کا بھی مسئلہ ہے۔ بنیادی تربیت کی کمی اور تعلقات سے ایک ہی بار فائدہ اُٹھانے کی کوتاہ فکری کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر یہ انداز اور طرزِ عمل بہت دُکھ دیتا ہے۔ اچھے تعلقات پر ایک بُری سی لائن کھینچ دیتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل یہ انہونی میرے ساتھ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ شہروز نے شام ڈھلے گھر آکر جب گاڑی مانگنے کے لیے تمہید باندھنی شروع کی تو میں فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ ہاں کروں یا ناں۔ وہ اصولی طور پر اس وقت مسقط میں تھا، مگر عملی طور پر ہربنس پورے میں ایک کمرے کا گھر بسا چکا تھا۔ لڑکی نے بھی گھر والوں کو یہی بتایا ہوا تھا کہ وہ جاب کے لیے مسقط گئی ہوئی ہے۔ اپنی والدہ کو وہ ہفتے دس روز بعد کسی پبلک بوتھ سے فون کرکے خیر خیریت کی اطلاع دے دیا کرتی تھی۔ جس کے نمبروں سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ فون کس جگہ سے آرہا ہے۔ گھر اور گھر والوں سے دور اپنے گھر میں رہتے اور جمع پونجی ختم کیے انھیں کئی ماہ ہوچکے تھے۔ اب دونوں مل کر ڈھیر سارے آلو اُبالتے، سموسوں کا میٹریل تیار کرتے اور تین چار جگہ دے آتے۔ یوں زندگی کی گاڑی گھسٹنے پر آگئی تھی۔

شروع میں وہ ایک دو بار آیا تو بہت پرجوش تھا۔

ایسے لگتا تھا زندگی کے سب سے خوب صورت لمحے دونوں اکٹھے گزار رہے ہیں۔ میں نے بھی ہمدردی میں جذباتی ہو کر گھر میں موجود ضرورت کی تمام ایسی اشیا جو انھیں اپنی روزمرہ خانگی زندگی کو آسان اور آسودہ کرنے میں مدد دے سکتی تھیں، ایک رات بوری بھر کر اس کے حوالے کر دی تھیں۔ ان میں گیس کا چولہا، توا، ضرورت کے برتن، چائے بنانے والا ایک ساس پان، دو تین گلاس اور پلیٹیں شامل تھیں۔ لڑکی گھر سے رخصت ہو تو ماں کتنے ہی مان سے یہ سب کچھ دیتی ہے۔ ہر مشکل لمحے خود پہنچ جاتی ہے۔ خود تجربے کرنے والوں کو یہ مشکل خود بھگتنی پڑتی ہے اور اکثر بڑی مہنگی پڑتی ہے۔

دونوں کے گھر والے لاہور میں تھے۔ ایک موبائل فون کی فرنچائز پر اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہیں دوستی پروان چڑھی اور پھر دونوں نے ''مسقط'' جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا ''مسقط'' شمالی لاہور میں دریافت ہوا۔

ہم اپنے آس پاس کے لوگوں سے کم ہی غیر مشروط محبت کرتے ہیں۔ اس محبت کی بنیاد میں کچھ ایسی چیزیں، جذبے، سوچ، پسند و ناپسند ضرور ہوتے ہیں جن کے باعث آنکھوں میں پسندیدگی اور آمادگی کے کوندے لپکتے ہیں۔

ایسا سگے رشتوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور فوری پسند کے عارضی بندھنوں کی مضبوطی بھی اس پر منحصر ہوتی ہے۔ رشتوں کی عمر لمبی ہوگی یا مختصر یہ کوئی پوشیدہ یا انوکھی سائنس نہیں ہے، پہلے قدم ہی پر اس کا تعین ہو جاتا ہے اور گزرنے والا ہر لمحہ اور واقعہ اس تعلق کی مضبوطی یا کمزوری واضح کرتا جاتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں۔

''لائی بے قدراں نال یاری تے ٹُٹ گئی تڑک کر کے''

تو یہ ایک شاعرانہ تعلی ہے۔ ''تڑک کر کے'' یہ بھی نہیں ٹوٹتی۔ رشتے کی کمزوری اور بوسیدگی کا باعث بننے والا کوئی واقعہ، نامناسب بات یا ناپسندیدہ عمل ہی ہوتا ہے جو کسی طور آپ کا دل قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور آپ رشتہ مزید نبھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ برداشت کی کمی بیشی ہر فرد میں مختلف ہوتی ہے اور یہ فرق اس کے تعلقات، دوستوں، رشتوں کی نوعیت کا تعین کرتا ہے۔ اگر آپ کی زندگی میں باہمی تعلقات کے لیے کم سے کم طے شدہ اصول، بندشیں، ویلیوز، اور بنیادیں ہی نہ ہوں تو غور کیجیے انسان ہونے کا شرف اور فرق ہی ڈانوا ڈول ہو جائے گا۔ خاندان اور عزیز و اقارب عام طور پر مضبوطی اور قوت کی بیرونی دیوار ہوتے ہیں، جہاں یہ بھی میسر نہ ہو تو محبت اور تعلق کی حفاظت کی کوئی بیرونی تہ ہی باقی نہیں رہتی۔ لو میرج کرنے والوں میں علیحدگی اور طلاق کے چار ہزار سے زیادہ مقدمات اس وقت صرف لاہور شہر کی عدالتوں میں انھیں رُلا رہے ہیں اور احساس دلا رہے ہیں کہ خاندان کی مرضی کے خلاف، والدین سے بغاوت کر کے، صرف کسی چہرے کی خوب صورتی دیکھ کر سب کچھ چھوڑنے اور سارے رشتے نچھاور کرنے والے اکثر لوگ آخر میں خالی ہاتھ ملتے نظر آتے ہیں۔ کسی مشکل لمحے کوئی سہارا دینے والا، کوئی ڈھارس بندھانے والا بھی نہیں ملتا۔

شہروز نے جھجکتے ہوئے سر جُھکایا اور بولا ''سر! گاڑی چاہیے تھی۔'' ''اس وقت!'' میں نے حیرت سے پوچھا ''کیا گھروں کو واپسی ہو رہی ہے!'' بولا ''نہیں وہ مہرو دو دن سے ہسپتال میں ہے۔ اس کا ابارشن (اسقاط حمل) کروایا تھا۔ بلیڈنگ ہی نہیں رکی، دایہ کے بعد قریبی ہسپتال والوں نے جواب دے دیا تھا۔ اب ایک دوسرے ہسپتال میں ہے۔ آج دن بھر میں اِدھر اُدھر پھرتا، شام کا انتظار کرتا رہا۔ اب تک جان نکل گئی ہوگی۔ اس کی ڈیڈ باڈی گھر تو لے جا نہیں سکتا، کسی قبرستان ڈال آؤں گا۔ اس کے لیے گاڑی ضروری ہے۔''

مجھے لگا کسی ننگی تار نے چھو لیا ہے۔ حیرت، دکھ اور بے یقینی کا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ مجھے سنبھلنے میں وقت لگا۔ ''تمھاری تو محبت کی شادی تھی۔ تم تو اس رشتے سے کانوں تک خوش تھے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے سر!'' وہ سر جھکا کر بولا۔'' ہم نے اصل میں شادی نہیں کی تھی۔ بس اکٹھے رہ رہے تھے کیونکہ ہمیں لگتا تھا ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ فلموں میں تو یہ عام ہے اسی لیے ہم نے خوشی خوشی ایسا کر لیا تھا، یہ نہیں خبر تھی کہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ خاموشی ایک طویل دریا کی طرح ہمارے درمیان بہنے لگی۔

''محبت ایسی ہوتی ہے!'' مجھے بعد میں احساس ہوا، میرا جسم غصے اور نفرت سے کانپ رہا تھا۔

''جس کے ساتھ تم نے محبت کی، کسی قاعدے کلیے کے بغیر صرف جسمانی لذت کے لیے دن رات ساتھ گزارے۔ تمھارا بیج ہی اس کی موت کا باعث بنا۔ اب تم اسے کسی لاوارث کتے کی طرح پھینک آؤ گے!''

''کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ میں نے بہت غور کیا۔ اس کے گھر والے تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ابھی انھیں نہیں پتا مگر جونہی خبر ہوگی، قاتل میں ہی ٹھہروں گا..... میں اُس کی نوبت ہی نہیں آنے دوں گا۔ اس کی لاش دریافت ہونے تک کوئی پہچان ہی نہیں سکے گا۔ یہ کیسے ثابت ہوگا کہ ہم کبھی اکٹھے بھی رہے ہیں۔''

''اور تم!''

''میرا خیال ہے میں گھر واپس چلا جاؤں گا۔ پچھلے کئی ماہ میں نے بہت مشکل اور مالی پریشانی کے دیکھے ہیں۔''

میں ذاتی طور پر بہت بامروت ہوں۔ کتنی بار تو چیزیں اور باتیں ناگوار بھی ہوں تو آخری حد تک برداشت کر جاتا ہوں مگر اس روز جیسے میرے صبر اور برداشت کی وہ حد آ گئی جس نے مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ دروازے کی طرف رخصت ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ گاڑی نہیں دے سکوں گا۔ پچھلی سیٹ پہ لگنے والے گناہ کے دھبے مٹانے میں زندگی گزر جائے گی اور میں جانتا ہوں، وہ تب بھی نہیں مٹ سکیں گے۔ تم بہادر آدمی ہو اس بیر بہوٹی لاش کو کہیں بھی ٹھکانے لگا آؤ گے اور تمھیں فرق بھی نہیں پڑے گا۔ تمھیں وہ یاد بھی نہیں آئے گی۔''

بے شک وقت کے ساتھ ساتھ دوسروں کو الزام دینے کی لذت سے بے نیاز ہوتا جا رہا ہوں۔ کبھی اس بات پر بھی دکھ ہوتا تھا کہ ایک دوسرے سے مانگ کر لی جانی والی کتابیں، گندی کر کے، جلدیں خراب کر کے اور استعمال کر کے برے حال میں واپس کیوں کی جاتی ہیں۔ ایسا کرنے والوں کو اپنے اس رویے اور بُرے طرزِ عمل کی بدصورتی کیوں نظر نہیں آتی؟ ایسے بے حس لوگ چیزیں بے قدری اور بے

دَردی سے واپس کرتے ہوئے معذرت بھی نہیں کرتے۔ اُلٹا بعد میں فخریہ بیان کرتے اور قہقہے لگاتے ہیں جیسے کوئی تاریخی قلعہ فتح کرلیا ہو۔

انسانی پسند ناپسند، آس پاس ہونے والی باتیں۔ اُن کو دہرانے والی محفلیں ہی عادتوں میں ڈھلتی ہیں اور عادتیں شخصیات تعمیر کرتی ہیں۔ ہماری ہر شخصیت کی تعمیر میں الگ الگ طرح کی خرابیاں گھس آئی ہیں۔ یہاں تک کہ جن باتوں پر شرمانا چاہیے اب ان کا ذکر معمول کے واقعے کی طرح ہونے لگا ہے۔ دوسروں کی چیزوں کے استعمال پر فخر کرنے اور انھیں بے وقوف اور بدھو بنا کر خوش ہونے کی جبلّت اب اپنے جیسے زندہ انسانوں اور ان کے جسموں سے کھیلنے، حظ اُٹھانے اور پھر کسی استعمال شدہ بے وقعت ٹشو کی طرح اٹھا کر پھینکتے ہوئے اسی لیے اب ذرا سا دَرد بھی نہیں ہوتا۔

محبت کس کو بری لگتی ہے۔ اگر کسی کو مل جائے تو بادشاہی جیسی ہوتی ہے۔ دل و نگاہ بدل کر رکھ دیتی ہے۔ دوسرے کے لیے جینے مرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی کی ہر خوشی کا سوچنے میں لذت آنے لگتی ہے۔ مگر ارادہ ہی محبت کے لفظ کے ناروا استعمال کا ہو، محبوب کے جسم سے کھیلنے کا اور اسے بے وقعت کرکے، پھر ایک اور گھر ایک نئے دَر کی تلاش کا ہو تو کسی حد کا تعین کیسے ہوسکتا ہے۔ کسی کو اس حد کے اندر کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے اپنے یونیورسٹی کیریئر کے دوران ایسی شکایات سے بھی واسطہ پڑا کہ استاد کلاس میں طلبہ کو فخریہ بتاتے کہ انھوں نے کتنے جسموں سے کھیلا۔ ان کے نام تو مسلمانوں جیسے تھے کام البتہ ضرور شرمسار کرنے والے تھے، دُکھ تو یہ بھی ہے کہ تجربے سنیارٹی اور ڈگریوں میں بھی نمایاں تھے۔ اس فرد سے ادارے نے بڑی ہمت کرکے معذرت کرلی تو دوسرے ادارے نے دونوں ہاتھوں سے انھیں گلے لگالیا۔ اب وہ وہاں اپنے افعال شنیعہ کا فخریہ بیان کرتے ہیں اور گناہِ جاریہ کو کاشت کرتے ہیں۔

مجھے معاف رکھیے ایس ایم ایس کے ذریعے جنسی لطائف بھجوانے سے شروع ہونے والی عادت، باتوں اور پھر واردا توں کا موجب بنتی ہے۔ جھجک جاتی رہتی ہے۔

شہرزاد نے سر جھکا کر دروازہ کھولا اور اندھیرے کا حصہ بن گیا۔ میں کتنی دیر ڈرائنگ روم میں پاؤں پٹختا پھرا۔ پھر بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔ میری اہلیہ کافی دیر تک کمرے میں کوئی آواز نہ پاکر دستک دے کر اندر آئی تو بھی مجھے خبر نہیں ہوئی۔ اس نے گھبرا کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ وہ ایک ایسی لڑکی کے لیے آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا جس کو میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔

''وہ کہتا ہے اسے کسی قبرستان میں پھینک آئے گا۔ کیا وہ کوئی مردہ بلی ہے۔ جسے یوں بے دَردی سے پھینک دے گا۔ جانے کس نصیبوں جلی ماں کی بیٹی ہے جو یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ ایک بے قدرے اور خود غرض کے ساتھ کئی ماہ جیتی اور سوتی رہی، یہ مائیں ایسی اندھی کیوں ہوجاتی ہیں کہ انھیں اتنا بھی پتا نہیں چلتا۔ لوگ اپنی ناکارہ سی کار، موٹر سائیکل دیتے ہوئے سو دفعہ سوچتے ہیں، یہ کیسے بے نیازی ہے کہ جسم کا ٹکڑا لوگ چیل کوؤں کی طرح اُٹھا کر لے جاتے ہیں اور انھیں خبر بھی نہیں ہوتی۔'' میں دُکھ بھرے غصے سے بڑبڑا رہا تھا اور وہ بات کا مفہوم اور پس منظر جاننے کے لیے بڑی ہمدردی اور توجہ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ○○○